سرحدی گاندھی خان عبدالغفار خاں کی مجاہدانہ
زندگی کی سنسنی خیز کہانی، خود اُن کی زبانی
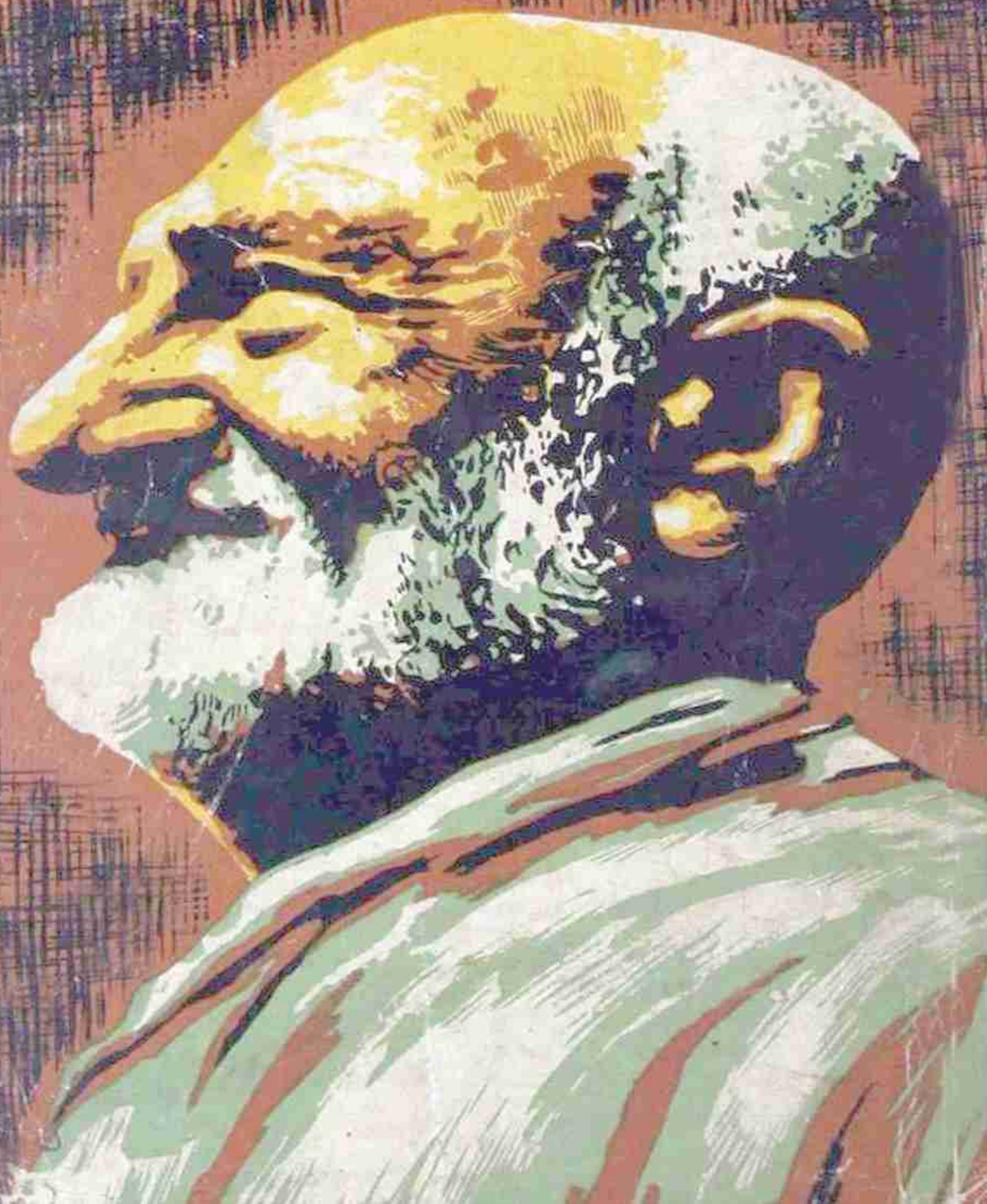
خان عبدالغفار خاں

پیش لفظ

پیش نظر کتاب ایک بیش بہا تصنیف ہے۔ بادشاہ خان کی سوانح عمریاں تو کئی شائع ہو چکی ہیں، جن میں سے پیارے لال صاحب کی تصنیف کردہ سوانح عمری سب سے پہلے منظرِ عام پر آئی۔ بعد ازاں انگریزی میں ٹنڈولکر صاحب کی لکھی ہوئی شائع ہوئی اور حال ہی میں جوشی صاحب نے بادشاہ خان کے سوانح حیات مراٹھی زبان میں شائع کئے ہیں، لیکن یہ کتاب 'سرحدی گاندھی' کی آپ بیتی ہے۔ دوسروں کی نوشتہ سوانح عمریاں تو بے شمار ہو سکتی ہیں، لیکن 'آپ بیتی' یا خود نوشتہ سرگزشت صرف ایک ہی ہوتی ہے۔ اور جب وہ ایک حق پرست کی آپ بیتی ہوتی ہے تو وہ مستند بالذات ہونے کی وجہ سے لاثانی بن جاتی ہے۔

بادشاہ خان غیر منقسم ہندوستان کی جنگِ آزادی کے ہراول میں ایک سالار تھے۔ اُن کے پُر شجاعت عدم تشدد (اہنسا) کی وجہ سے ہندوستان نے انہیں 'سرحدی گاندھی' کا لقب دیا تھا۔ اُس دور یا نسل کے جو لوگ اس ملک میں اب تک زندہ ہیں، وہ تو خان عبدالغفار خان کی اہمیت سے بخوبی واقف ہیں، لیکن دورِ حاضرہ کی نئی نسل کے لئے وہ ماضی کی ایک ایسی تواریخی شخصیت بن کے رہ گئے ہیں، جس کی تاریخ دُھندلی پڑ چکی ہے۔ اگر نئی نسل کو اس پُرنور کردار کی کچھ جھلک نصیب ہو جائے ـــ اُس ضَو پاش تجلّی کا ایک جلوہ میسّر آجائے تو شاید اِس کے قدم ظلمت سے نُور کی طرف بڑھ سکیں۔

اِس کتاب کا کسی بھی وقت اشاعت پذیر ہونا ایک اہم واقعہ گردانا جاتا،

لیکن ایک خاص سبب سے اس موقع پر اس کا منظر عام پر آنا اور بھی زیادہ اہمیت حاصل کر گیا ہے۔ ناظرین کو معلوم ہوگا کہ ہمارے ملک میں ایک "خان عبدالغفار خان سالگرہ سمتی" کا قیام عمل میں آیا ہے، جس کا صدر ہونے کا فخر مجھ ناچیز کو نصیب ہوا ہے۔ اس سمتی کا اہم مقصد یہ ہے کہ مہاتما گاندھی کی سویں سالگرہ کے سال رواں میں خان عبدالغفار خان کو ہندوستان میں مدعو کیا جائے۔ آپ کو یہ جان کر خوشی ہوگی کہ بادشاہ خان نے ہماری دعوت کو قبول فرما لیا ہے۔

اس طرح، جبکہ ہندوستان کے عوام کو بادشاہ خان کی عظیم شخصیت کے دیدار ہونے والے ہیں، اس کتاب کا اس تقریب پر شائع ہونا بلاشبہ بڑا برمحل اور ملک کے لئے فیض رساں ثابت ہوگا۔ شروع میں یہ کتاب ہندی، اردو اور انگریزی ۔ ان تین زبانوں میں چھپ رہی ہے۔ مجھے یقین ہے کہ تعلیم یافتہ طبقہ میں کوئی بھی ایسا شخص نہیں رہے گا جو اس مبارک موقع پر بادشاہ خان کی آپ بیتی کے مطالعہ سے بہرہ مند نہ ہو سکے۔

آخر میں میں شری کنور بھان نارنگ اور رام سرن نگینہ کا نیز گاندھی سمارک ندھی کا تہہ دل سے ممنون ہوں کہ ان کی محبت، عقیدت اور محنت و کاوش کی بدولت یہ بے نظیر کتاب عوام کی خدمت میں پیش کی جا رہی ہے۔

جے پرکاش نارائن

۹ - ۳ - ۶۹

نئی دہلی

میں ہشت نگر کے 'جواب' اشتنغر کے نام سے مشہور ہے' 'اتمان زئی' گاؤں میں
خان بہرام خان کے یہاں پیدا ہوا تھا۔ اُس وقت ہمارے وطن میں اوّل تو یہ رواج نہیں
تھا کہ جب بچہ پیدا ہو اس وقت اُس کے والدین اس کی تاریخ وسنِ پیدائش اپنے پاس
لکھ لیں اور دوسری بات یہ بھی تھی کہ لوگ لکھنا پڑھنا نہیں جانتے تھے۔ اسی وجہ سے
میری پیدائش کی تاریخ کسی نے نہیں لکھی تھی، لیکن میری ماں مجھ سے کہا کرتی تھیں کہ
میرے بھائی ڈاکٹر خان صاحب کی جب شادی ہوئی تھی، تب میں گیارہ سال کا تھا۔
چونکہ اُن کی شادی سنہ ۱۹۰۱ء میں ہوئی تھی اس لئے میں بجا طور پر کہہ سکتا ہوں کہ میں
سنہ ۱۸۹۰ء میں پیدا ہوا تھا۔

میرے والد صاحب گاؤں کے ایک بہت بڑے خان تھے، لیکن اُن میں خانیت
کے غرور ونخوت کا شائبہ تک نہ تھا۔ وہ نہایت منکسر المزاج، خدا پرست، متقی اور
پرہیزگار انسان تھے۔ وہ ظالم کے بمقابلہ مظلوم کے حمایتی تھے۔ فراخ دلی اور رحم وکرم
اُن کی فطرت کا خاصّہ تھے۔ کوئی اُن کا بُرا بھی کرتا تو بدلہ چکانے کے اہل ہونے کے
باوجود وہ درگزر کر دیتے، بردباری سے کام لیتے اور ہمیشہ بُرائی کا جواب بھلائی سے دیتے۔
ایسی ہی فیاض طبع میری والدہ بھی تھیں۔ وہ ہمیشہ ایک ہانڈی سالن اپنے
گلی محلے کے غریبوں کے لئے پکایا کرتی تھیں اور اُن سب میں تھوڑا تھوڑا بانٹ دیا
کرتی تھیں۔ اسی طرح ہمارے حجرے میں جو مسافر آکر ٹھہرتے تھے اور جنھیں کوئی

بھی نہیں جانتا پہچانتا تھا اور نہ ہی اس قسم کے مسافر کسی کے مہمان ہوتے تھے ایسے مسافروں کے لئے میرے والد صاحب خود روٹی لے جایا کرتے تھے، حالانکہ اس قسم کے کاموں کے لئے گھر میں نوکر چاکر موجود ہوتے تھے۔ والد صاحب روٹیوں کی ٹوکری اپنے سر پر اور سالن کا برتن ہاتھوں میں اٹھا لیتے۔ حجرے میں پہنچ کر اجنبی مسافروں کو کھلاتے پلاتے، وہ کہا کرتے تھے کہ یہ مسافر جنہیں نہ کوئی جانتا اور نہ پہچانتا ہے، خدا کی طرف سے بھیجے ہوئے مہمان ہیں۔ اس لئے میں خود اُن کے لئے کھانا لے جاتا ہوں۔

دوسرے خوانین کی مانند میرے والد صاحب حاکم پرست نہیں تھے۔ نہ ہی دوسرے خوانین کی طرح وہ حکام سے تعلقات قائم کرتے تھے۔ اُن کی خدمت یا خوشامد کرنے کا تو سوال پیدا ہی نہیں ہوتا تھا۔ میرے والد صاحب کو خودداری کی یہ خوبی میرے دادا محترم سے ورثہ میں ملی تھی۔ میرے دادا کا نام سیف اللہ خان تھا۔ اُس زمانے میں جب "سُر کاوے" پر جنگ جاری تھی اور انگریز بونیر کے علاقہ پر قبضہ کرنا چاہتے تھے، اُس وقت ہمارے ملک کے خوانین انگریزوں کی امداد اور حمایت کرنے لگے تھے، لیکن میرے دادا سیف اللہ خان نے اپنی مظلوم قوم کا ساتھ دیا تھا۔ جس طرح غازی اُن فرنگیوں کا مقابلہ کر رہے تھے اُسی طرح میرے دادا نے بھی غازیوں میں شریک ہو کر مورچہ سنبھال رکھا تھا اور اسی طرح انگریز جب بھی صوبہ سرحد کے لوگوں سے لڑائیاں لڑتے، اُن پر چھاپے مارتے اور انہیں غلام بنانے کی کوشش کرتے تو میرے دادا سیف اللہ خان ہمیشہ قوم کے ساتھ کھڑے ہو جاتے اور فرنگیوں کے ظلم کے خلاف مظلوموں اور مظلوم قوم کے ساتھ شانہ بشانہ ہو کر لڑتے۔

میرے پردادا عبید اللہ خان اپنی روشن دماغی اور قوم پروری کی بنا پر انہوں کے ہاتھوں تختۂ دار پر لٹکائے گئے تھے۔ کیونکہ اُس وقت ہمارے ملک پر درانیوں

کا تسلط تھا۔ اور میرے پردادا اپنی قوم میں ایک بارسوخ، طاقتور اور ہر دلعزیز رہنما کی حیثیت رکھتے تھے۔

دُرّانیوں کے بعد جب انگریزوں کی حکومت قائم ہوئی تو ہمارا علاقہ اُس وقت پنجاب سے ملا ہوا تھا۔ پنجاب میں تو انگریزوں نے پنجابیوں کی تعلیم کے لئے بہت سے مدرسے کھول رکھے تھے۔ لیکن ہمارے ملک میں تعلیم کا کوئی انتظام نہیں تھا۔ پٹھانوں کے ساتھ انگریزوں کی کوئی ہمدردی نہ تھی! اور نہ ہی پنجابیوں کی ہم سے کوئی ہمدردی تھی۔ ہمارے ہاں محکمۂ تعلیم کے تمام افسر پنجابی تھے اور اسی وجہ سے ہمارے وطن میں باقاعدہ طور پر تعلیم کا بندوبست نہیں تھا۔ کہیں کہیں بعض بڑے بڑے گانوؤں میں اگر اکا دُکا پرائمری اسکول تھے بھی تو ان میں کہیں کہیں ایک اُستاد بیٹھا ہوتا تھا۔ یہ بات بھی قابلِ ذکر ہے کہ انگریزوں نے ہندوستان میں ہر ایک قوم کو اپنی اپنی مادری زبان میں تعلیم دینے کا طریقہ رائج کر رکھا تھا، لیکن ہم ہی واحد بدقسمت قوم تھے کہ اول تو ہمارے ملک میں تعلیم کا بندوبست نہیں تھا اور کچھ تھا بھی تو یہ کہ ہمارے بچوں کو پرائی زبان میں تعلیم دی جاتی تھی۔ اس سے بھی زیادہ افسوسناک بات یہ تھی کہ انگریزوں نے ایک طرف تو ہمارے لئے خال خال ہی مدرسے قائم کئے تھے۔ اور دوسری طرف ایسے نام نہاد مُلّا ملانٹوں کو ہمارے پیچھے لگا رکھا تھا جو یہی فتویٰ صادر کیا کرتے تھے کہ "ان مدرسوں میں سبق پڑھنا کفر ہے" ان لوگوں کے پروپیگنڈے کا محور یہ عجیب و غریب خیال تھا کہ ؎

سبق چہ د مدرسے وائی   پارہ د پیسے وائی
جنت کے بہ ئے نہ وی   دوزخ کے بہ ٹھسے وہی

("جو لوگ مدرسے میں سبق پڑھتے ہیں وہ پیسوں کی خاطر ایسا کرتے ہیں۔ ان کو جنت میں جگہ نہیں ملے گی۔ وہ دوزخ میں دھکے کھاتے رہیں گے") اس پراپیگنڈا

کا اصل مطلب یہ تھا کہ پٹھان بے علم اور جاہل رہ جائیں۔ اور یہی وجہ تھی کہ پٹھان ہندوستان بھر میں تعلیم کے لحاظ سے سب سے پسماندہ تھے۔

پٹھان بچوں کے لئے تحصیلِ علم کا اور کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ مسجدوں میں کسی قدر مذہبی تعلیم کے نام سے درس و تدریس کا تھوڑا بہت انتظام تھا۔ لیکن وہ مُلا لوگوں کے لئے تھا۔ اور اکثر لوگ یہ تعلیم امامت کرنے کے لئے حاصل کیا کرتے تھے۔ عام پختونوں کی اس میں کوئی دلچسپی نہیں تھی۔

چونکہ اسلام سے پہلے پختون ہندو تھے۔ اور ہمارے سماج میں بھی وہ غلط دستور رائج تھا کہ "علم (وِدّیا) صرف برہمنوں کے لئے ہے"۔ اس دستور کے تحت ہم بھی اُسی طرح تقسیم ہو چکے تھے، جیسا کہ ہندو الگ الگ ٹکڑوں میں تھے۔

میرے والد صاحب نے خود تو تعلیم حاصل نہیں کی تھی لیکن علم سے ان کا بہت پیار اور شغف تھا۔ میں پانچ چھ سال کا تھا کہ مجھے تعلیم حاصل کرنے کے لئے مسجد میں مُلا کے پاس بٹھا دیا گیا۔ مُلا بے چارا تو خود ہی علم و ادب سے بے بہرہ اور لکھنے پڑھنے سے عاری تھا، وہ بھلا مجھے کیا پڑھاتا اور لکھاتا۔ اُسے قرآن شریف کی چند ایک سورتیں یاد تھیں۔ نیز وہ قرآن شریف پڑھ ضرور سکتا تھا، لیکن معنی و مطلب بالکل نہیں سمجھتا تھا۔ مُلا صاحب نے مجھے سپارہ پڑھانا شروع کر دیا۔ سپارہ خوانی شروع کرتے وقت میرے ماں باپ نے مٹھائی بانٹی اور میرے اس آغازِ تعلیم پر بہت خوشیاں منائیں۔

عجیب بات تھی کہ مُلا صاحب مجھے ا (الف) ب پ اور ت تو نہیں پڑھا سکے تھے لیکن سپارہ پڑھانا شروع کر دیا۔ غور فرمایئے جب ایک آدمی حروفِ تہجی سے واقف نہیں وہ سپارہ کیسے پڑھ سکے گا؟ لیکن اس میں بیچارے مُلا کا بھی کوئی قصور نہیں تھا۔ اُس زمانے میں پڑھانے کا یہی طریقہ ہمارے دیس میں مروّج تھا۔

ہمارا اُستاد بڑا ظالم تھا اور ہمیں بڑی بے دردی سے پیٹا کرتا تھا۔ کچھ عرصہ میں میں نے قرآن شریف ختم کرلیا۔ میرے ماں باپ نے قرآن شریف کے ختم کرنے پر بڑی خوشیاں منائیں۔ بڑی بھاری خیرات بھی کی اور مُلّا کو بھی بہت سے روپے دیئے۔

پٹھانوں میں علم حاصل کرنے کا بہت شوق تھا اور اکثر لوگ اپنے بچوں کو تعلیم دلوانے کے لئے مسجدوں میں بھیجتے تھے۔ کیونکہ بچوں کے درس تدریس کے لئے کوئی اور ادارہ یا مدرسہ نہیں ہوتا تھا۔ بفرضِ محال ملک کے بڑے بڑے شہروں میں کہیں مدرسے تھے بھی تو مُلّا ملانٹے اُن میں پڑھنے کے لئے لوگوں کو نہیں جانے دیتے تھے اور کہتے تھے کہ "دنیا کا یہ علم کفر ہے" چنانچہ انھوں نے اپنے شاگردوں اور اَن پڑھ لوگوں کو یہ شعر یاد کرا رکھے تھے جو وہ گلی کوچوں اور بازاروں میں بڑے جوش اور اونچی آواز سے گاتے پھرتے تھے ؎

"سبق چہ ذ مدرسے وائی پارہ د پیسے وائی
جنت کے بہ زائے نہ وی دوزخ کے بہ گھسے دہی"

("جو مدرسے میں سبق پڑھتے ہیں وہ پیسوں کی خاطر ایسا کرتے ہیں۔ انھیں جنت میں جگہ نہیں ملے گی اور دوزخ میں رگڑے کھاتے رہیں گے")

لیکن میں خوش نصیب تھا کہ خدا نے مجھے ایک دلاور، پاکباز اور ایمان دار باپ اور نیک طینت ماں دی تھی جو مسجد کے ملانٹوں کے فتووں اور ارد گرد کے لوگوں کے واویلا اور آوازوں کی پرواہ نہیں کرتے تھے۔ انھوں نے میرے بھائی ڈاکٹر خان صاحب کو مدرسہ بھیج دیا اور میرے خیال میں ہشت نگر بھر میں یہ سب سے پہلا لڑکا تھا جسے مدرسے بھیجا گیا تھا۔ جب میں نے قرآن شریف ختم کرلیا تو مجھے بھی ماں باپ نے مدرسہ بھیج دیا۔ اس وقت میری عمر آٹھ سال تھی۔ مُلّا ملانٹے چھپ چھپ کر ہمارے خلاف لوگوں میں پراپیگنڈا کرتے تھے، لیکن انھیں کھلے عام

ہمارے خلاف مُنھ کھولنے کی جراُت نہیں ہوتی تھی۔ اور نہ ہی وہ ہمارے خلاف کفر کا فتویٰ لگانے کی ہمت کر سکتے تھے۔ کیونکہ میرے والد صاحب کو ایک خان ہونے کی حیثیت سے خاص سماجی اقتدار نصیب تھا۔ مولاناؤں کے لئے اُن پر انگشت نمائی کرنا ٹیڑھی کھیر تھا۔

یہ کس قدر افسوس ناک بات ہے کہ ہمارا دیس جو تاریخ کے مختلف دوروں میں علم وادب اور تہذیب و تمدّن یا ثقافت کا گہوارہ رہا تھا تاریخ کے ناسامد حالات، ملا مولاناؤں کی جہالت اور گراوٹ کی وجہ سے اس حالت تک گر گیا کہ اس میں تعلیم جیسے نیک کاموں کے لئے بھی کوئی گنجائش نہ رہی۔

ہمارے اس دیس میں مختلف ثقافتیں اور تمدّن گزر چکے ہیں۔ ایک وقت تھا کہ یہ علاقہ آرین تہذیب کا گہوارہ تھا۔ پھر اس ملک میں بدھ مت کا دور دورہ شروع ہوا۔ اس دور میں ہمارے ملک نے بڑی ترقی کی اور یہ دور ایک عظیم معاشرے کے آثار اپنے پیچھے چھوڑ گیا۔ آج بھی مہاتما گوتم بدھ کے دو عظیم الشان مجسمے بامیان میں موجود ہیں۔ جو دنیا بھر میں مہاتما بدھ کے سب سے بڑے مجسمے ہیں۔ اور یہ پہاڑ کے دامن میں فن اصنام کے کمال کی بے مثل نظیر پیش کر رہے ہیں۔

بامیان کے دامنِ کوہ میں مہاتما گوتم بدھ کے مجسموں کے چاروں طرف سارے پہاڑ میں جگہ جگہ غاریں بنی ہوئی ہیں۔ ان غاروں میں بدھ مذہب کے راہب پیشوا روحانی معلم اور طالب علم رہا کرتے تھے۔ بامیان کے علاوہ جلال آباد کے گردونواح میں ہڈہ کے مقام پر بدھ مذہب کی عظیم یونیورسٹی تھی جس کے آثار ابھی تک موجود ہیں۔ یہی حال ٹیکسلا کا تھا۔ ان مقامات پر سنگ تراشی، صنم گری، تعمیرات کے نمونوں، پتھر و لکڑی سے متعلقہ فنونِ لطیفہ کے پائے گئے آثار سے معلوم ہوتا ہے کہ اُس وقت ہم پشتون لوگ ایک بلند تمدن اور کلچر کے مالک تھے اور ہم نے

اس قدر ترقی کی تھی کہ اپنے ملک سے باہر چین اور مشرق بعید تک ہمارے بازو پھیلے ہوئے تھے۔ اس طرح ہم نے اپنے کلچر اور مہاتما گوتم بدھ کے پیغام سے دنیا کو بھی روشناس کرا دیا۔

دو تین سال قبل ہمارے گاؤں کے قریب آثار قدیمہ کے محکمہ والوں نے کھدائی کی تھی۔ اس کھدائی سے زمین کے نیچے سے ایک بڑا شہر برآمد ہوا۔ کہا جاتا ہے کہ یہ شہر گندھارا کے شاہی خاندان کا مرکز تھا اور اگر ہم تاریخ کے دھندلکے میں تھوڑا سا اور بھی پیچھے چلے جائیں تو پٹھانوں کا یہ ملک جو اس وقت افغانستان اور پشتونستان کے نام سے مشہور ہے نوعِ انسان کے ایک عظیم خاندان کا گہوارہ رہ چکا ہے۔

تاریخ دانوں کی تحقیق سے معلوم ہوتا ہے کہ آرین نسل نے سب سے پہلے اسی ملک میں دریائے آمو کے کنارے اپنی آنکھیں کھولی تھیں اور پھر اسی دھرتی پر اس نے تمدن کا عروجِ کمال حاصل کیا تھا۔ بعد میں جب اس قوم کی تعداد بڑھ گئی اور ملک میں بھیڑوں کے ریوڑ رکھنے کی جگہ نہ رہی تو آہستہ آہستہ اس کے افراد نے نئے نئے ملکوں کی طرف کوچ کرنا شروع کر دیا۔ یہ لوگ ایک طرف تو ایران کی سمت سے یورپ کو چلے گئے اور دوسری جانب ہندوستان کی طرف بڑھ گئے اور جدا جدا قوموں میں تقسیم ہو گئے! جہاں بھی وہ گئے انھوں نے جغرافیائی حالات اور ملکی اثرات کے تحت جدا جدا تمدن اور زبانیں اختیار کر لیں لیکن آریہ نسل کے یہ لوگ جب اس سے پہلے اپنے ابتدائی وطن "اریانا ویجو" (موجودہ افغانستان اور پختونستان) میں رہتے تھے تو ان کی ایک ہی بولی (زبان) تھی جسے اب "آریک زبان" کا فرضی نام دیا گیا ہے۔ اسی "آریک زبان" کی قربت "پشتو" زبان کو حاصل ہے۔

پٹھان اونچے اونچے ناقابلِ عبور پہاڑوں اور دروں میں آباد تھے اور بیرونی اثرات سے نسبتاً محفوظ تھے۔ پہاڑوں سے گھرا ہوا یہی ملک "اریانا ویجو" تھا جس میں

تاریخ کے اوّلین دور کے پیغمبر "زرتشت" نے جنم لیا۔ زرتشت بلخ کے رہنے والے تھے مگر بعد میں ایران چلے گئے لیکن ان کی کتابیں اب بھی بلخ کی تعریف و توصیف سے بھرپور ہیں جن سے اس امر کی شہادت ملتی ہے کہ یہی وہ سرزمین تھی جہاں ہندو دھرم کے مقدس وید کے گیتوں نے جنم لیا اور یہی وہ ملک ہے جس کے ایک فرزند پانینی نے سنسکرت زبان کی گرامر لکھی اور اسے ایک ادبی زبان کے طور پر دنیا سے متعارف کیا۔ یہ پانینی رشی دریائے سندھ کے کنارے حالیہ تحصیل صوابی کا ایک باشندہ تھا۔

اسی طرح اس ملک کے ایک دریا اور پشتو کے ایک لفظ، جس سے 'ہند' نام بنا ہے۔ یہ 'سندھ' سے اخذ کیا گیا ہے جسے سِند بھی کہا جاتا ہے۔ یاد رہے کہ پشتو میں ہر ایک دریا کو سندھ کہا جاتا ہے۔ آریاؤں کے اس مشترکہ خاندان میں، جس سے بہت سے آریہ دوسرے علاقوں میں چلے گئے دو بڑے گھرانے باقی رہ گئے جن میں سے ایک 'پشتون' سے اور دوسرا 'بلوچ' نام سے مشہور ہے۔ یہ دونوں اب بھی اپنے اسی پرانے وطن میں رہ رہے ہیں۔ اس کی حفاظت اس کی تعمیر و ترقی کا کام خدا نے انہی کے سپرد کر رکھا ہے۔

ہمارے اس دیش میں بعد میں اسلام آیا۔ لیکن اسلام جس وقت اس ملک میں آرہا تھا، اُس وقت عربوں میں وہ روحانی روشنی، خدائی جذبہ اور تقویٰ باقی نہیں رہا تھا، جو پیغمبرِ اسلام لائے تھے یا جس سے ابوبکرؓ اور عمرؓ جیسی عظیم شخصیتوں نے اپنی عملی زندگی اور بلند کردار کے ذریعہ عوام کو متعارف کرایا۔ اس وقت جب کہ اسلام ہمارے ملک میں وارد ہوا عرب شہنشاہیت اور مطلق العنانی میں مست ہو چکے تھے اور انھیں ملک گیری کی ہوس نے اندھا کر رکھا تھا۔ ان میں تبلیغ کا جذبہ اور نیکی پھیلانے کی اسپرٹ مفقود ہو چکی تھی۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ ہم سے ہمارے

شاندار تمدن اور شائستہ کلچر نو بے لئے گئے، لیکن اس کے بدلے ہمیں اسلام کی وہ اصلی شکل سندی گئی، جو پیغمبر اسلام نے کرائے تھے۔اس کے باوجود ہمارے بعض علم دوست اور خدا رسیدہ لوگ اسلام کی تلاش میں اسلامی دنیا میں گھومے اور انھوں نے اسلامی فلسفہ، علم و دانش اور تصوف میں اپنے لئے ایک بلند مقام پیدا کر لیا۔ جس پر ہم لوگ بجا طور پر فخر کر سکتے ہیں اور برصغیر ہند کا ایک بڑا حصہ مسلمان ہوگیا۔ انھی بزرگوں کے سر کے صدقہ اب پاکستان بنا ہوا ہے۔ یہ الگ بات ہے کہ جن پٹھانوں نے پاکستانی علاقہ کے اسلاف کو اسلام دیا تھا۔ ان کے ساتھ پاکستان کا سلوک کیا ہے؟

میں نے ابتدائی تعلیم پشاور کے میونسپل بورڈ ہائی اسکول میں حاصل کی۔اس کے بعد پشاور کے مشن ہائی اسکول میں داخل ہوگیا۔ کچھ عرصہ کے بعد میرا بھائی اسی اسکول کا کورس ختم کر کے ڈاکٹری کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے بمبئی چلا گیا اور میں مشن ہائی اسکول میں اپنے ایک نوکر 'بارانی کاکا' کے ساتھ رہ گیا۔ بارانی کاکا مجھے فوج کے قصے کہانیاں سناتا اور کہا کرتا تھا کہ فوج کی نوکری بڑی باعزت اور بہت اچھی ہے۔ اگر کوئی آدمی فوج میں سالار کی وردی میں ملبوس ہو اور کرچ وغیرہ فوجی اسلحہ سے لیس ہو کر اپنی کمپنی کے آگے آگے چل رہا ہو تو اس کی شخصیت سے عجیب رعب داب اور تمکنت و حشمت ٹپکتی ہے۔

بارانی کاکا کی باتوں نے میرے اندر بھی فوجی نوکری کے لئے زبردست شوق پیدا کر دیا۔ اور میں نے ماں باپ سے صلاح مشورہ کئے اور اجازت لئے بغیر ایک درخواست برائے ڈائریکٹ کمیشن ہندوستان کے کمانڈر انچیف کو بھیج دی۔ اس کے بعد میں اس درخواست کے جواب کا انتظار کرنے لگا۔ دستور کے مطابق کمیشن عطا کرنے سے پہلے سرکار امیدوار کے متعلق ضروری تحقیقات عمل میں لاتی

ہے۔ احساس کے لیے کچھ عرصہ درکار ہوتا ہے۔ اس دوران میں ذہین جماعت پاس کر کے دسویں میں داخل ہو چکا تھا۔ اب جب میٹرک کا امتحان شروع ہوا اور میں لگ بھگ آدھے پرچے دے چکا اور آدھے پرچے ابھی دینے باقی تھے کہ مجھے ایک سرکاری حکم نامہ ملا کہ "تمہارا ڈائریکٹ کمیشن منظور کیا جا چکا ہے اور تم کل صبح دس بجے بھرتی کے دفتر میں حاضر ہو جاؤ"۔ یہ حکم نامہ میرے لئے غیر معمولی خوشی کا باعث تھا، کیونکہ اس زمانے میں ڈائریکٹ کمیشن کا حصول بہت اہم بات تھی۔ میں نے اس خوشی میں امتحان دینا چھوڑ دیا اور بھرتی افسر کے دفتر میں چلا گیا۔ میرا معائنہ ہوا اور میرا نام ڈائریکٹ کمیشن میں درج ہو گیا۔

انھیں دنوں میرے بھائی ڈاکٹر خان صاحب بمبئی سے انگلینڈ روانہ ہو گئے اور وہاں پہنچ کر ایک میڈیکل کالج میں داخل ہو گئے۔

مجھے ڈائریکٹ کمیشن میں لے لئے جانے کی منظوری ملنے پر میرے والد صاحب بہت مسرور ہوئے۔ ان دنوں مردان میں گائیڈ کے نام سے ایک رسالہ اور پلٹن مقیم تھی۔ یہ پلٹن تمام ہندوستان کی فوج میں بڑی شہرت اور عزت کا مقام رکھتی تھی۔ اس میں بڑے بڑے لوگوں کے لڑکے بھی بڑی مشکل سے سپاہی بھرتی کئے جاتے تھے اور پنجاب کے بڑے بڑے لوگوں کے لڑکے اس میں لیس نائک تھے۔ میں اسی پلٹن میں ڈائرکٹ کمیشن پر اس لئے لیا جا رہا تھا کہ میں ایک نہایت خوبصورت نوجوان تھا۔ چھ فٹ اور تین انچ میرا قد تھا اور میٹرک تک میری تعلیم تھی۔ انہی وجوہات سے اس پلٹن کے انگریزوں کو مجھ سے محبت اور رغبت تھی۔ اوران کی یہ خواہش تھی کہ میں اس پلٹن میں شامل ہو جاؤں۔ میرے والد صاحب بھی اس میں رضامند اور بہت خوش تھے۔ لیکن ایک دن میں پشاور میں ایک دوست سے ملنے گیا جو اس رسالہ میں رسالدار تھا۔ میں اور وہ دونوں کھڑے تھے کہ اس

دوران ایک فرنگی جو اس رسالہ میں لیفٹیننٹ تھا آیا۔ رسالدار صاحب ننگے سر کھڑے تھے اور سر کے بال فیشن ایبل تھے (سر کے اگلے حصہ پر تراشے ہوئے بالوں کا گچھا تھا) اس انگریز نے جب رسالدار کے سر کے بالوں کا یہ فیشن دیکھا تو بڑا غضب ناک ہوکر بولا " ویل! ڈیم سردار صاحب تم بھی انگریز بننا چاہتا ہے؟" یہ سُن کر رسالدار کا رنگ فق ہوگیا اور اس میں اتنی بھی جرأت نہ رہی کہ اس بات کا اسے کوئی جواب دیتا۔ میں نے جب یہ نظارا دیکھا تو اس کا مجھ پر بڑا سخت اثر ہوا۔ مجھے تو "بابائی کاکا" فوجیوں کی عزت کی باتیں سُنایا کرتا تھا لیکن یہاں مجھے ذلت ہی ذلت نظر آئی۔ پھر کیا تھا میں نے اسی دن سے انگریزوں کی نوکری کا خیال ہی چھوڑ دیا، لیکن میرے ابا جان نے میرے اس خیال کی سخت مخالفت کی۔ وہ مجھ سے ناراض بھی ہوگئے، کیونکہ ان دنوں ڈائریکٹ کمیشن حاصل ہونا ایک بہت بڑی چیز تھی، لیکن مجھے وہ بڑی چیز نہیں دکھائی دی اور نہ ہی مجھے اس میں کسی قسم کی کوئی عزت نظر آئی بلکہ مجھے تو وہ ایک حقیر ہلکی اور گری ہوئی چیز دکھائی دی۔

ڈائریکٹ کمیشن ٹھکرا دینے کی وجہ سے بابا جی مجھ سے سخت ناراض تھے، لہٰذا میں نے اس کے متعلق اپنے بھائی ڈاکٹر خان صاحب کو ایک خط بھیجا اور اس میں میں نے یہ لکھا کہ "میں نے انگریزوں کی نوکری کا خیال ترک کر دیا ہے کیونکہ اس میں کوئی عزت نہیں ہے بلکہ غلامی اور ذلت ہے۔" ڈاکٹر خان صاحب میرے اس فیصلہ سے بہت خوش ہوئے اور انھوں نے ابا جان کو لکھ دیا کہ میں نے جو فیصلہ کیا ہے وہ صحیح اور شائستہ فیصلہ ہے لہٰذا وہ مجھے مجبور نہ کریں اور نہ ہی ناراض ہوں۔

میں نے پھر تعلیم کی طرف رجوع کیا۔ انہی دنوں میں اپنے ایک اور ساتھی

کے ہمراہ کیمبل پور چلا گیا۔ اور کیمبل پور کے ہائی اسکول میں از سر نو داخل ہو گیا لیکن اس جگہ بڑی سخت گرمی تھی اور میری طبیعت وہاں نہ لگ سکی۔ میں اس جگہ سے قادیان چلا گیا لیکن یہاں کی فضا بھی مجھے پسند نہ آئی۔ وہاں رات کو میں نے ایک خواب دیکھا۔ کہ میں ایک خوبصورت گہرے کنوئیں میں گر پڑا ہوں۔ اسی اثنا میں ایک آدمی وہاں آتا ہے اور کنوئیں کے اندر میری جانب اپنا لمبا ہاتھ بڑھاتا ہے اور میں اس کے ہاتھ کو پکڑ لیتا ہوں اور وہ شخص مجھے کنوئیں سے باہر نکال لیتا ہے۔ اس کے بعد وہ حیرت سے میری طرف دیکھ کر کہتا ہے "کیا تم کو یہ کنواں نظر نہیں آتا، آخر اس میں اپنے آپ کو کیوں پھینکتے ہو؟" علی الصباح جاگا تو یہ قصہ میں نے اپنے اس ساتھی کو سنایا اور ہم دونوں اس بات پر متفق ہو گئے کہ اس جگہ سے نکل جائیں۔ چنانچہ ہم وہاں سے واپس اپنے گاؤں آگئے۔

میرا وہ ساتھی تو پشاور کے ایک ہائی اسکول میں داخل ہو گیا اور میں اپنے گاؤں سے علی گڑھ چلا گیا وہاں کالج میں داخل ہو گیا۔ لیکن مجھے رہائش کے لئے بورڈنگ میں جگہ نہ ملی۔ چنانچہ میں نے علی گڑھ کے ایک ہوٹل میں رہائش اور خورد و نوش کا انتظام کر لیا۔ یہ کالج علی گڑھ شہر سے، جہاں وہ ہوٹل تھا، دُور تھا۔ دن کا وقت میں کالج میں گزارتا اور رات کو شہر چلا آتا۔ کچھ دنوں کے بعد کالج میں گرمیوں کی چھٹیاں ہو گئیں اور میں واپس اپنے گاؤں چلا آیا۔ گاؤں آکر مجھے معلوم ہوا، کہ ولایت سے میرے بھائی کا ایک خط میرے باباجی کے نام آیا ہے۔ اس خط میں میرے متعلق لکھا تھا کہ بہتر یہ ہوگا کہ میں انجینئرنگ کی تعلیم حاصل کرنے کے لئے ولایت چلا جاؤں اور انہی کے پاس ٹھہروں۔ وہاں بھائی صاحب نے الٹری پڑھ رہے تھے اور میرے لئے انہوں نے انجینئرنگ کا موضوع تجویز کیا تھا۔ اس کی وجہ یہ تھی کہ میں جیومیٹری میں بہت لائق تھا۔ بھائی صاحب کی اس

تجویز کے پیشِ نظر ابا جان نے میرے ساتھ صلاح مشورے کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ میں بھی لندن چلا جاؤں۔ اس فیصلہ کی اطلاع ڈاکٹر خان صاحب کو بھجوا دی۔ ڈاکٹر صاحب نے میرے لئے پی۔ این۔ او جہاز میں جگہ ریزرو کروالی۔ اور بابا نے مجھے تین ہزار روپے بھی دے دیئے اور میں جانے کے لئے بالکل تیار ہو گیا، لیکن جب میں رخصت لینے کے لئے اپنی والدہ صاحبہ کے پاس گیا اور جانے کے لئے اُن سے اجازت مانگی تو وہ رونے لگیں۔ مجھے انھوں نے جانے کی اجازت نہ دی۔ میں نے انھیں سمجھانے کی انتہائی کوشش کی لیکن میں انھیں قائل نہ کر سکا۔ میں نے اُن سے یہ بھی کہا کہ وہ ذرا اپنے دیش کو تو دیکھیں کہ اس کی کیا حالت ہے۔ انگریزوں نے یہاں کے لوگوں میں پھوٹ، پارٹی بازی اور طرح طرح کے نفاق پیدا کر رکھے ہیں۔ یہاں بے گناہ لوگ موت کے گھاٹ اتارے جاتے ہیں۔ پھر بے گناہ لوگوں پر ہی مقدمے اور دعوے دائر ہوتے ہیں۔ آپس کی پارٹی بازی اور بغض و عناد کی وجہ سے اکثر گنہگار بری ہو جاتے ہیں اور بے گناہ قید کی اذیتیں جھیلتے ہیں۔ یہاں تو کسی بھی انسان کی زندگی محفوظ نہیں ہے۔ یہاں سیکھنے کو کیا رکھا ہے؟ میری ان باتوں کا والدہ صاحبہ پر کچھ اثر نہ ہوا۔ وہ میرے ساتھ متفق نہ ہوئیں۔ لوگوں نے اُن کے دماغ میں یہ بات بٹھلا دی تھی کہ ایک دفعہ اگر کوئی اس ملک سے ولایت چلا جاتا ہے تو وہ ایسا ملک ہے کہ اس سے کوئی بھی واپس نہیں آتا۔ اُن کا ایک بیٹا پہلے ہی ولایت جا چکا ہے وہ تو واپس آنے سے رہا۔ اور اب یہ دوسرا بھی اس کے پیچھے چلا گیا تو ان کی بھی یہی حالت ہوگی جو لاوارث اور اولادِ نرینہ سے محروم ماں کی ہوتی ہے مطلب یہ کہ اُن کا بھی کوئی نام لیوا اور پانی دیوا نہیں رہے گا۔

چونکہ ہم دو ہی بھائی تھے۔ ایک تو پہلے ہی ولایت جا چکا تھا اور اب میں ہی اُن کی دلجمعی کے لئے پاس تھا۔ بھائی صاحب کی عدم موجودگی میں وہ مجھے ہی دیکھ کر

دل کو تسکین دے دیا کرتی تھیں۔ انھیں میری جدائی گوارا نہیں تھی، اس لئے وہ مجھے بدیس جانے کی اجازت نہیں دیتی تھیں۔

دراصل ماں سے مجھے بھی بہت محبت تھی اور وہ بھی مجھ سے بے حد پیار کیا کرتی تھیں۔ میں اُن کی اجازت کے بغیر انگلینڈ نہیں جانا چاہتا تھا۔ اور جب اُنہوں نے مجھے جانے کی اجازت نہ دی تو میں انگلینڈ جانے سے رہ گیا اور ولایت کا خیال ہی میں نے ترک کر دیا۔ اب میں نے ملک و ملت اور خدا کی مخلوق کی خدمت کرنے کا ارادہ کر لیا۔

(۳)

سنہ ۱۹۰۱ء میں انگریزوں نے ہمارے صوبے کو پنجاب سے علیحدہ کر لیا۔ اور ہمارے صوبے میں ایک وحشیانہ قانون کا نفاذ کر دیا۔ ایسا قانون تو شاید ہلاکو خاں نے بھی لوگوں پر نافذ نہیں کیا تھا۔ اس کا نام "فرنٹیئر کرائمز ریگولیشن ایکٹ" تھا۔ ایک تو یہ قانون بذاتِ خود بہت سنگدلانہ تھا اور اسے کالا قانون کہا جاتا تھا اس پر غضب یہ تھا کہ فرنگیوں نے اسے ایسے برے طریقے سے استعمال کیا کہ اس سے پٹھانوں میں پارٹی بازی، پھوٹ اور باہمی دشمنیاں پیدا ہو گئیں۔ ان کی وہ اجتماعی زندگی انفرادی زندگی میں بدل گئی۔ علاوہ ازیں اس گندے قانون نے ہماری عزت اور خودداری کو زبردست نقصان پہنچایا اور ہماری مستورات کو کھینچ کر کچہریوں میں پہنچا دیا۔ یہ اس قسم کا کالا قانون تھا کہ جو آدمی انگریزوں کو ناپسند ہوتا تھا اس پر پولیس ایک فرضی مقدمہ بنا لیتی۔ ایسے مقدموں میں ثبوت کی کوئی ضرورت نہیں ہوتی تھی۔ فرنگی اس آدمی پر جرگہ بٹھا دیا کرتا تھا۔ اہلِ جرگہ بھی ان کے اپنے ہی آدمی ہوا کرتے تھے جو اس آدمی کو چودہ سال قید کی سزا دے دیتے تھے۔

ایک مثال حبیب نوری کی پیش کرتا ہوں۔ سنہ ۱۹۳۱ء میں کانگریس کی تحریک میں جب

چارسدہ میں انگریزوں نے خدائی خدمت گاروں پر بے حد مظالم برپا کئے تو اُس سے حبیب نور کو بہت صدمہ پہنچا۔ اُن کے دل میں ایک شعلہ سا بھڑک اٹھا۔ پھر کیا تھا جب چارسدہ کا انگریز اسسٹنٹ کمشنر کچہری جانے لگا تو یہ اُس کے پاس چلے گئے اور انگریز اسسٹنٹ کمشنر کو اپنے طمنچے یعنی پستول سے جہنم رسید کرنا چاہا لیکن اُن کا پستول فیل ہوگیا۔ تب حبیب نور نے اس فرنگی کو اُوپر اٹھالیا اور زمین پر زور سے پٹک دیا اور کہا "تو تمہیں مار تو نہیں سکا چلو ذلیل کردوں"۔ پولیس موقع پر پہنچ گئی۔ انہیں گرفتار کرلیا گیا اور چوبیس گھنٹے کے اندر اندر پھانسی دے دی گئی۔ یہ تو میں نے آپ لوگوں کے سامنے صرف ایک ہی مثال بیان کی ہے۔ اسی طرح اور بے شمار لوگ تھے جن کے ساتھ اس سے بھی زیادہ ظلم ہوئے۔

اس کالے قانون کی ایک اور دفعہ ہے جسے "دفعہ چالیس" کے نام سے پکارا جاتا تھا۔ یہ دفعہ اخلاقی جرم سے متعلق تھی لیکن انگریز عمر بھر اسے سیاسی تبدیلیوں کے خلاف استعمال کرتے رہے۔ انگریز تو خیر غیر ملکی حکمران تھے، اُن سے کیا گلہ یا شکوہ شکایت ہوسکتی تھی غضب تو یہ ہے، پاکستان کے ملکی حکمرانوں نے بھی ابھی اس کالے قانون کو وطن پرست پٹھانوں پہ لاگو کر رکھا ہے۔ اگر ایک آدمی راستہ پر چل رہا ہوگا تو یہ اسے پکڑلیں گے اور کہیں گے کہ ضمانت دے دو۔ وہ انہیں کہے گا کہ میں نے کیا گناہ کیا ہے؟ اس کا جواب یہ ہوگا کہ اس بات کے بتانے کی چنداں ضرورت نہیں اگر ضمانت دیتے ہو تو بہتر ورنہ جاؤ تین سال کے لئے قید خانے کی ہوا کھاؤ۔

میں نے اور میرے ہزاروں خدائی خدمتگار بھائیوں نے اس دفعہ کے تحت قیدیں کاٹی ہیں۔ سنہ ۱۹۰۱ء میں انگریزوں نے جب ہمیں پنجاب سے جدا کیا تھا۔ اور اس قسم کے ظالمانہ قوانین ہمارے لئے بنائے تھے تو اس کی وجہ یہ تھی کہ فرنگیوں کے خلاف پٹھانوں میں یہ خیال پیدا ہوگیا تھا کہ فرنگی (انگریز) ہمارے دشمن ہیں اور

انھوں نے زور ظلم سے ہمیں اپنا غلام بنا رکھا ہے۔ انگریزوں کے خلاف پٹھانوں کے اندر ایک پُرتشدد تحریک جاری ہوئی تھی۔ اس تحریک کا نتیجہ یہ نکلا کہ پٹھان جہاں بھی انگریز کو دیکھ لیتے اُسے نقصان پہنچانے کی کوشش کرتے۔ اس طرح بہت سے انگریز موت کے گھاٹ اُتارے جاتے تھے اور پاداش میں بہت سے پٹھان پھانسی کے تختوں پر لٹکائے جاتے تھے۔ یہ قانون اور یہ صوبہ انگریزوں نے اپنی اس خصوصی غرض اور مطلب کے لئے بنایا تھا کہ وہ انگریز کے خلاف پٹھانوں کی اس تحریک کو علیحدہ طور پر کچل کر رکھ دیں۔

ہمارے وطن میں نام نہاد مُلا مولانے اور "حضرت" "بزرگ" انگریزوں کے ہاتھ میں کٹھ پُتلی بن کر رہ گئے تھے اور لوگوں کو تعلیم حاصل کرنے سے بدستور منع کرتے رہتے تھے۔ انگریزوں نے ان کے دماغ میں یہ بات بٹھا رکھی تھی کہ اگر پٹھان تعلیم حاصل کرے گا اور اس میں سوجھ بوجھ پیدا ہو جائے گی تو تمہاری یہ چلی چلائی دوکان ٹھنڈی پڑ جائے گی۔ اور پھر تمہیں خیرات اور شکرانے و نذرانے دینا بند کردیں گے۔ میں ان مُلاؤں کو بہت سمجھاتا تھا مگر یہ کب سمجھتے تھے۔ میں انہیں کہتا تھا: "دیکھو، اسلام میں علم حاصل کرنا مرد اور عورت کا یکساں فرض ہے۔ یہ اچھا ہے کہ تم اس قوم کو یہ کہتے ہو کہ اِن انگریزی مدرسوں میں تعلیم حاصل مت کرو؛ اس حالت میں ضرورت اس بات کی ہے کہ تم قوم کے بچّوں کے لئے اپنے مدرسے جاری کرو اور انہی میں انھیں پڑھاؤ۔ اور اگر تم اپنے قومی مدرسے نہیں بنا سکتے تو پھر اِس جہالت سے تو انگریزوں کے بنائے ہوئے یہ مدرسے اچھے ہیں۔ کیونکہ انسان ان میں کچھ نہ کچھ تو سیکھ ہی لے گا۔"

لیکن وہ کسی حالت میں اس بات کے لئے تیار نہیں ہوتے تھے۔ ایک دن میں کوہ مری میں تھا۔ گرمی کا موسم تھا۔ ایک مُلا صاحب میرے مہمان بنے۔ شام کا

وقت تھا۔ ہم سیر کے لئے باہر نکلے۔ جب سڑک پر چل رہے تھے اور سیر کر رہے تھے۔ چلتے چلتے ایک بنگلے کے پاس پہنچ کر میں نے مُلّا صاحب سے کہا۔

"مُلّا صاحب! ذرا اس بنگلے کو تو دیکھئے، یہ کیسا بنگلہ ہے؟"

اس نے جواب دیا: "بڑا شاندار بنگلہ ہے اور بہت خوبصورت ہے۔"

میں نے اُسے دوبارہ کہا: "اس آدمی کو دیکھئے جس کا یہ بنگلہ ہے اور ان پھولوں کو دیکھئے۔ اچھا جانتے ہیں یہ آدمی کون ہے؟"

مُلّا صاحب نے جواب دیا: "نہیں میں اُسے نہیں پہچانتا۔"

میں نے اُسے کہا: "یہ آدمی فرنگیوں (انگریزوں) کا مُلّا ہے۔ اور یہ بھی دیکھئے کہ اس قوم نے ترقی کی ہے تو اس کے مُلّا نے بھی ترقی کی ہے اور یہ قوم جو بنگلوں میں رہتی ہے، موٹروں میں گھومتی اور سیر کرتی ہے۔ اس کا مُلّا بھی بنگلے میں رہتا ہے اور موٹروں میں پھرتا ہے اور ہم لوگ جب خود خوار و ذلیل ہیں اور ترقی یافتہ نہیں ہیں تو ہمارا مُلّا بھی ذلیل و خوار ہے۔ اس لئے مُلّا صاحب! آپ اگر یہ بات ذہن نشیں کریں کہ اگر ہم لوگوں نے ترقی کر لی تو آپ بھی ترقی یافتہ ہو جائیں گے۔ اور اگر ہمارا حال بُرا ہے تو آپ سوچئے کہ ہمارے ساتھ آپ کی حالت بھی خراب ہے۔ آپ کے ہاتھوں میں ہر وقت یہی ٹوکری ہوتی ہے اور گلی کوچوں میں روٹی وظیفے مانگتے پھرتے ہیں۔ اپنی موجودہ زندگی اور اس انگریز مُلّا کی زندگی پر کچھ سوچ بچار کیجئے اور دونوں میں فرق سمجھنے کی کوشش کیجئے۔"

مُلّاؤں کو میرا یہ سمجھانا بیکار رہا۔ کیوں نہ رہتا۔ اُنہیں جب خدا نہیں سمجھا سکا تو میں کیا سمجھاتا۔

(۴)

میں نے مشن اسکول میں تعلیم حاصل کی تھی۔ یہ پادریوں یعنی مسیحی مشنریوں کا

اسکول تھا۔ اور میرے بہت سے ساتھیوں نے اسلامیہ اسکول میں تعلیم حاصل کی تھی۔ میری تعلیم نے میرے دل میں ملک وملت سے پیار و محبت اور خدمت کا جذبہ پیدا کیا تھا، لیکن میرے جو اور ساتھی تھے اُن کے دلوں میں نہ تو ملک وقوم سے کوئی محبت تھی اور نہ ہی ان میں خدمت گذاری کا جذبہ تھا۔ میں نے اس مسئلہ پر جس قدر بھی غور وفکر کیا ہے، میں اس نتیجہ پر پہنچا ہوں کہ میرے اندر جو حب الوطنی کا جذبہ پیدا ہوا ہے اس کے لئے بھی تعریف و توصیف کا حق میرے ان اُستادوں کو پہنچتا ہے جن سے میں متاثر اور فیضیاب ہوا تھا۔

شاگرد پر اُستاد کا اثر ہونا ایک لازمی امر ہے۔ مجھ پر بھی اپنے اُستاد کا بہت اثر پڑا تھا اور اس سے میرے اندر خلقِ خدا کی خدمت کرنے کا خیال پیدا ہوگیا تھا۔ میرا اُستاد ایک انگریز پادری ایم۔ ای۔ وِگرم تھا اور اس کا ایک بھائی ڈاکٹر تھا۔ کہتے ہیں یہ دونوں بھائی ایک بڑے ممتاز خاندان کے چشم وچراغ تھے۔ اور ان دونوں بھائیوں کو باپ نے مشن کو دان کردیا تھا اور انھیں تنخواہ بھی باپ اپنی جیب سے دیا کرتا تھا۔ ان میں سے بڑا بھائی مشن ہائی اسکول کا ہیڈ ماسٹر تھا اور چھوٹا بھائی مشن ہسپتال میں ڈاکٹر تھا۔ یہ دونوں بھائی جس خلوص ومحبت سے لوگوں کی خدمت کرتے تھے اسے میں دیکھا کرتا تھا۔ کیونکہ میں بورڈنگ ہاؤس میں رہتا تھا، اس کے قریب ہی ان کا بنگلہ تھا۔ اس زمانے میں ہمارا بورڈنگ ہاؤس اسی جگہ پر واقع تھا جہاں آج مشن کالج کی عمارت کھڑی ہے۔ ہمارے بھی ہیڈ ماسٹر ایم۔ ای۔ وِگرم صاحب تین چار غریب یا یتیم طلبا کو اپنی تنخواہ میں سے وظیفے بھی دیا کرتے تھے۔ اس بات نے مجھ پر بے حد اثر کیا۔ میں اپنے دل میں کہا کرتا تھا کہ ایک طرف ہمارے اِن مسلمان پٹھان بھائیوں کو دیکھئے کہ ان میں اتنی بھی ہمدردی نہیں ہے کہ اپنے کسی غریب بھائی کی کوئی امداد اور خدمت کریں اور دوسری طرف

ان کو دیکھئے کہ یہ ایک غیر ملک کے لوگ ہیں اور غیر قوم اور جدا مذہب رکھتے ہیں۔ لیکن ان لوگوں میں اپنے ملک و قوم کے سنے تو کیا غیروں کے لئے بھی کتنی ہمدردی ہے۔ یہ کتنی دُور سے یہاں آئے ہیں اور ہماری خدمت کرتے ہیں۔ مثل مشہور ہے کہ "خربوزہ را خربوزہ دیدہ رنگ مے گیرد" یہ مثل مجھ پر بھی خوب صادق آئی تھی۔ ان لوگوں کے نیک اوصاف کا مجھ پہ گہرا رنگ چڑھ گیا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ مَیں انگلینڈ جا کر انہی قسم کے لوگوں کے درمیان تعلیم حاصل کرنے کے لئے بہت خواہش مند ہو گیا تھا۔ لیکن اماں جان سے اجازت نہ پا کر میں نے انگلینڈ جانے کا ارادہ ترک کر دیا تھا اور اپنی زندگی کو خلقِ خدا کی خدمت کے لئے وقف کر دینے کا تہیہ کر لیا تھا۔ کیونکہ اُن دنوں ہمارے لوگ جہالت اور لاعلمی کی وجہ سے تباہی و بربادی کی طرف جا رہے تھے۔ چنانچہ میں نے اپنی خدمتِ خلق کا آغاز اپنی پٹھان قوم سے جہالت اور لاعلمی دُور کرنے کی کوششوں کے ساتھ کیا۔

میں نے اپنے چند ہم خیال ساتھیوں کو جمع کیا اور اُن سے مل کر صلاح مشورہ شروع کر دیا کہ اپنے وطن میں علم کی روشنی پھیلانے کے لئے کیا اقدام کئے جائیں۔ خیر ہم نے اس سمت میں قدم اُٹھائے اور خدا کے فضل سے ہمیں حاجی صاحب

ؔ حاجی صاحب آف ترنگ زئی کی سرگرمیوں کا آغاز تبلیغی اور اصلاحی مشن سے ہوا تھا۔ انھوں نے فضول رسم ورواج بند کرانے اور اسلامی مدرسے قائم کرنے میں بڑی جدوجہد کی۔ اور اس طرح سے پشتون قوم میں ایک نئی زندگی پیدا کر دی۔ حاجی صاحب کی مجاہدانہ سرگرمیوں نے انگریز حکومت کو بدحواس کر دیا اور وہ بوکھلا اُٹھی۔ سرکار نے آپ کو گرفتار کر لیا۔ اُن کے عقیدتمندوں کا جوش وخروش دیکھ کر حکومت گھبرا گئی اور حاجی صاحب کو رہا کر دیا۔ حاجی صاحب نے انگریزی حکومت کو ختم کرنے کے لئے علاقہ غیر میں ہجرت کر لی اور زندگی کے آخری دَور

(باقی حاشیہ اگلے صفحہ پر)

آف ترنگ زئی کا تعاون حاصل ہو گیا۔

حاجی صاحب ایک سچے قوم پرست بزرگ تھے۔ اُن کی سرپرستی میں گدر کے مقام پر ایک دارالعلوم قائم ہو گیا جس کے مہتمم مولوی تاج محمد صاحب مقرر ہوئے۔ اور مولوی فضل ربی صاحب اور مولوی فضل محمود مخفی صاحب ان کے ساتھ کام کرنے لگے۔ میں نے اور مولوی عبدالعزیز صاحب نے سنہ ۱۹۱۰ء میں اتمان زئی میں ایک قومی و اسلامی مدرسہ قائم کیا۔ اسی طرح ہماری کوششوں سے صوبہ بھر میں بہت سے مدرسے کھل گئے اور بہت سے طلبا ان میں تعلیم حاصل کرنے لگے۔ رفتہ رفتہ لوگوں میں تعلیم کا شوق پیدا ہو گیا۔ اُس زمانہ میں ظفر علی خاں کے اخبار "زمیندار" اور مولانا ابوالکلام آزاد کے 'الہلال' اور 'البلاغ' اور 'مدینہ' کو دنیائے صحافت میں بڑی شہرت حاصل تھی اور انھیں ہم بھی منگوایا کرتے تھے۔ ان اخبارات کو جہاں ہم خود بڑے شوق سے پڑھا کرتے تھے وہاں دوسرے لوگوں کو بھی سُنایا کرتے تھے۔ کیونکہ ان دنوں لوگوں میں اخبار پڑھنے کا شوق نہیں تھا لیکن ہمارے پڑھ کر سنانے سے لوگوں میں اخبار بینی کا شوق پیدا ہو گیا۔ جو لوگ 'الہلال' اور 'البلاغ' منگوایا کرتے تھے ان کے نام پولیس اور سی۔ آئی۔ ڈی اپنے پاس درج کر لیتی تھی اور وہ آدمی مشتبہ سمجھے جاتے تھے۔

ہمارے صوبہ کے بعض طلبا دیوبند میں تحصیل علم کیا کرتے تھے اور دیوبندیوں کے ساتھ ہمارے مولوی فضل ربی اور مولوی فضل محمود مخفی کے گہرے تعلقات تھے

(باقی حاشیہ صفحہ گزشتہ) تک انگریزی حکومت کے خلاف برسرپیکار رہے۔ انہی کے متعلق انگریز نے کہا تھا: "حاجی صاحب ترنگ زئی کا ہمارے ہاتھ سے نکل جانا ہندوستان میں ہماری سب سے بڑی ناکامی ہے"

مولوی فضل ربی نے تو دیوبند میں تعلیم حاصل کی تھی اس لئے ہم کبھی کبھار دیوبند جایا کرتے تھے۔ دیوبند کے تعلیمی ادارہ کے صدر شیخ الہند مولانا محمود الحسن صاحب جہاں بہت بڑے عالم تھے وہاں نیک خصالی اور پاکبازی میں اپنی مثال آپ تھے۔ اُن سے بھی ہمارے تعلقات پیدا ہو گئے۔ کیونکہ ان کے دل میں ملک و ملت کے لئے بے حد ہمدردی و محبت تھی اور ہم بھی اسی مرض میں مبتلا تھے۔ وہ بھی اسی فکر میں تھے کہ یہ ملک فرنگی کی غلامی سے کیسے نجات حاصل کرے گا اور ہم بھی انہی تفکرات میں مبتلا تھے۔ انہیں کے ذریعہ مولانا عبیداللہ سندھی[1] سے بھی ہماری ملاقات ہو گئی اور ہم ایک دوسرے کے خیالات سے واقف ہو گئے۔ مولانا صاحب ان دنوں فتح پوری میں انگریزی تعلیم یافتہ نوجوانوں کو قرآن شریف کا درس دیا کرتے تھے اور ہر ایک بی۔اے پاس طالب علم کو پچاس روپے ماہوار وظیفہ بھی دیا کرتے تھے۔ ان کا یہ خیال تھا کہ یہ انگریزی تعلیم یافتہ طبقہ مذہب سے بے خبر ہے اور اگر یہ لوگ مذہب سے واقف و باخبر ہو جائیں تو پھر ان میں ملک و ملت سے محبت، عقیدت اور خدمت خلق کا جذبہ پیدا ہو جائے گا۔ مولانا صاحب نے اس سلسلے میں بڑے ایثار و محنت کا ثبوت دیا لیکن وہ اپنے اس خیال میں کامیاب نہ ہو سکے اور سب سے زیادہ رنجدہ بات یہ ہوئی کہ مولانا صاحب کا ایک بہت بڑا شاگرد جس کی تربیت پر انھوں نے بے حد محنت و مشقت صرف کی تھی اور اپنا بڑا وقت لگایا تھا، وہی مخبر یعنی جاسوس نکلا وہ چند ٹکوں کی خاطر تمام باتیں حکومت

---

[1] مولانا عبیداللہ سندھی عظیم انقلابی رہنما تھے۔ انگریزی دور میں ان کا زیادہ وقت غیر ممالک کی انقلابی قوتوں کو منظم کرنے میں گزرا۔ میں نے انھیں زندگی کے آخری دور میں دیکھا تھا۔ بوڑھاپے کے باوجود ان کے جذبات جوان تھے۔

تک پہنچا دیا کرتا تھا۔ اب غور کیجیے جس قوم کے تعلیم یافتہ لوگوں کی زرپرستی اور حرص و آز کا یہ عالم ہو کہ چند ٹھیکروں کے لئے اپنے ملک و ملت کو بیچنے پر تل جائیں اُن میں ملک اور قوم کی محبت اور خدمت کا جذبہ کیسے پیدا ہو سکتا تھا۔

مسلمانوں کی تباہی و بربادی کی وجہ بھی یہی تھی کہ ان کو دولت سے پیار ہو گیا اور جب یہ چیز ان میں پیدا ہو گئی تو یہ لوگ خدا پرستی چھوڑ کر زرپرست بن گئے۔ اور دنیا میں ذلیل و خوار ہو گئے۔ فتح پوری میں مولوی سیف الرحمٰن سے بھی شرف ملاقات حاصل ہونے کے بعد اُن سے اچھی جان پہچان ہو گئی تھی۔ وہ ہمارے علاقے کے رہنے والے تھے لیکن عرصہ دراز سے فتح پوری کے عربی مدرسے کے مدرس تھے۔ اس زمانہ میں انگریزوں نے لوگوں کے دلوں میں انتہائی ڈر پیدا کیا ہوا تھا اور لوگ حکومت سے سخت خائف تھے۔ ہم لوگ چھپ چھپ کر کبھی کبھار صلاح و مشورہ کے لئے دیو بند جایا کرتے تھے

۱۹۱۲ء میں ماں باپ نے میری شادی کر دی۔ اور ۱۹۱۳ء میں میرے یہاں بیٹا غنی پیدا ہوا۔ اس زمانہ میں ہمارے صوبہ میں جلسہ جلوس کی بات کوئی نہیں جانتا تھا اور اگر کوئی ان کا خیال بھی دل میں لاتا تو وہ ڈر کے مارے ان کا اہتمام نہ کر پاتا۔ ۱۹۱۳ء کے اخبارات میں ہم نے بڑے بڑے مضامین اور اعلانات دیکھے کہ آگرہ میں مسلم لیگ کا ایک بہت بڑا سالانہ اجتماع ہوگا اور اس کے صدر سر ابراہیم رحمت اللہ ہوں گے۔ اور اس جلسہ میں سر آغا خان اور مولانا ابوالکلام آزاد بھی شریک ہوں گے۔ ہمارے دل میں بھی اس جلسہ کو دیکھنے کا شوق پیدا ہو گیا اور میں اور میرے ساتھی آگرہ روانہ ہو گئے اور وہاں پہنچ کر مسلم لیگ کے جلسہ میں شامل ہوئے۔ مسلم لیگ کے صدر کا خطبہ ہم نے سنا اور سر آغا خان اور مولانا ابوالکلام آزاد اور بہت سے دوسرے مقررین کی تقاریر بھی سنیں جلسہ

بہت عظیم الشان تھا اور ہم نے اس میں شریک ہو کر بہت کچھ سیکھا اور سمجھا۔ اختتام جلسہ کے بعد ہم واپس چلے آئے۔ آگرہ سے دہلی پہنچے۔ وہاں مولوی فضل الرحمٰن کے بھتیجے کے ساتھ میں نے چند دن دہلی میں گزارے۔ اسی اثنا میں میں بیمار ہو گیا اور ہم دہلی سے اپنے گاؤں لوٹ آئے۔

(۵)

۱۹۱۴ء میں شیخ الہند صاحب کا ایک خط مجھے ملا۔ اس میں لکھا تھا۔ کہ خط دیکھتے ہی میں دیوبند چلا آؤں۔ میں، مولوی فضل محمود صاحب اور فضل ربی صاحب روانہ ہو گئے۔ جب ہم دیوبند پہنچے تو وہاں دیگر کئی مولوی بھی ہمارا انتظار کر رہے تھے۔ بحث اس بات پر جاری تھی کہ ہندوستان کی آزادی کے لئے صوبہ سرحد کے آزاد علاقہ میں ایک مرکز ہونا چاہیئے جہاں ملک کی آزادی کی خاطر انگریزوں کے مقابلہ کے لئے ایک انتظام کیا جائے اور جدوجہد شروع کی جائے۔

اس سے پہلے ہندوستان کی اس جماعت کا خیال یہ تھا کہ بونیر کے آزاد علاقہ میں مجاہدین کا جو مرکز ہے وہ شاید ایک بہت بڑی طاقت کا حامل ہے۔ لیکن درحقیقت اس بارے میں ہندوستان کے لوگوں کو غلط فہمی میں رکھا گیا تھا۔ وہ مرکز کوئی بڑی طاقت نہیں تھا۔ اور اس مرکز کے لوگ اتنے بیکار تھے کہ اس آزاد علاقہ میں جو لوگ ان کے اردگرد اڑوس پڑوس میں رہتے تھے ان سے بھی انھوں نے کوئی رابطہ پیدا نہیں کیا تھا اور نہ ہی انھوں نے ان میں کوئی تبلیغ یا کام کیا تھا۔

ان لوگوں کی ایک نہایت مختصر سی جماعت تھی جسے ہندوستان سے روپے ملا کرتے تھے اور وہ مزے اڑایا کرتے تھے۔ ان کا کوئی بھی کام دھندا نہیں تھا۔ تنخواہ خور تھے۔ اُن کا ایک امیر تھا جس کا نام نعمت اللہ تھا۔ وہ ہمارے صوبہ

سرحد کا باشندہ تھا۔ اس کی ہمارے صوبہ کے خفیہ پولیس کے بڑے افسر شارٹ سے ساز باز تھی۔ ان میں بعض لوگ جاسوس تھے۔ مجاہدین کی یہ جماعت ان لوگوں پر مشتمل تھی جو سکھوں کے مقابلے کے لئے سید احمد صاحب اور سید اسمٰعیل صاحب شہید کے ہمراہ ہندوستان کے شہر بریلی سے آگئے تھے اور جب سید احمد صاحب اور سید اسمٰعیل صاحب شہید ہزارہ میں سکھوں کے ہاتھوں شہید ہوگئے تو ان کے یہ باقی ساتھی بونیر کے اس آزاد علاقہ میں آگئے اور یہاں آباد ہوگئے۔ جب ان لوگوں کی حقیقت ہندوستان کے لوگوں کو معلوم ہوگئی اور یہ جان گئے کہ یہ فضول لوگ ہیں تو شیخ الہند کی جماعت کو ایک نیا مرکز قائم کرنے کی ضرورت محسوس ہوئی۔ بہت بحث مباحثوں کے بعد فیصلا اس بات پر ہوا کہ میں اور فضل محمود صاحب باجوڑ کی ان آزاد قوموں میں چلے جائیں اور وہاں ایک محفوظ جگہ مرکز کے لئے منتخب کریں۔ کچھ دنوں کے بعد اس مرکز کے ملاحظہ کے لئے مولوی عبیداللہ سندھی صاحب جائیں۔

اس فیصلہ کے بعد ہم لوگ واپس اپنے گاؤں آگئے۔ اور کچھ دنوں کے بعد میں اور مولوی فضل محمود صاحب خفیہ طور پر باجوڑ چلے گئے۔ تخت بائی سے ہم لوگ ریل گاڑی میں بیٹھ گئے۔ اور درگئی اسٹیشن پر ریل سے اتر پڑے۔ اور اس جگہ سے ہم ٹم ٹم میں سوار ہوئے۔ جب مالاکنڈ کے دروازے پر پہنچے تو ہمیں بڑی فکر لاحق تھی۔ کیونکہ اس جگہ پولیس چوکی بیٹھی ہوئی تھی اور وہاں ہر ایک شخص کی، چاہے وہ پیادہ ہوتا یا سوار، تلاشی لی جاتی تھی۔ چھان بین اور پوچھ تاچھ کے بعد اگر کسی پر ذرا بھی شک ہوتا تھا تو اسے پکڑ لیا جاتا تھا۔ میری شکل و صورت اور قد و قامت چھپانے کا نہیں تھا، اس لئے مجھے سب سے زیادہ فکر تھی کہ میں کیسے اس چوکی سے گزروں گا۔ میں ٹم ٹم میں پیچھے بیٹھا ہوا تھا

اور میں نے اپنے جسم کے ارد گرد پورے طور پر چادر اوڑھ رکھی تھی۔

پولیس چوکی پر پہنچ کر ہماری ٹم ٹم کھڑی ہو گئی اور ہمیں دیکھنے کے لئے ایک سپاہی آگیا۔ یہ شام کا وقت تھا۔ میرے دوسرے ساتھی ٹم ٹم سے اتر پڑے اور میں گٹھری سی بنا بیٹھا رہا۔ ہماری ٹم ٹم والا بڑا ہوشیار تھا۔ اس نے سپاہی سے کہہ دیا کہ صاحب! کچھ بھی نہیں ہے۔ وہ سپاہی قریب آیا۔ میرے نیچے اوپر نظر دوڑائی اور کہہ دیا کہ جا سکتے ہو۔ میں بڑا خوش ہوا کہ ایک بہت بڑی بلا سے نجات ملی۔

ہم بٹ خیل پہنچ کر ٹم ٹم سے اتر پڑے۔ وقت بہت گزر چکا تھا ہم نے وہیں رات گزاری۔ صبح سویرے مُلّا کی بانگ کے وقت اس جگہ سے روانہ ہو پڑے۔ چکدرے کے پل کو پار کر رہے تھے کہ یہاں بھی سپاہی کھڑے تھے، لیکن ان سے بھی بخیر و خوبی گزر گئے۔ سارا دن پا پیادہ چلتے رہے شام کو دریا کے کنارے پہنچے۔ دریا کے دوسرے کنارے پر مولوی فضل محمود صاحب کا گاؤں تھا۔ سردی کا موسم تھا۔ دریا میں پانی کم تھا۔ ہم نے دریا کو پار کر لیا۔ دن کے بہت تھکے ماندے اور بھوکے تھے۔ کھانا کھانے کے بعد سو گئے۔ کیونکہ ہم بہت تھکے ہوئے تھے اس لئے اسی گاؤں میں ایک رات آرام کیا اور دوسرے روز فضلِ محمود صاحب خود تو مولوی عبید اللہ سندھی کے لئے یہاں رک گئے اور میرے ہمراہ اپنا خالہ زاد بھائی بھیج دیا۔ میں اور وہ اس جگہ سے باجوڑ کو روانہ ہو گئے۔ یہ دیر کا علاقہ تھا۔ ہم اس جگہ سے باڑہ چلے گئے۔

پھر کند میں ہڈہ کے ملا صاحب کے پاس پہنچ گئے وہ خود تو رحلت فرما چکے تھے لیکن ان کے ایک شیخ وہاں موجود تھے۔ بہت اچھے انسان تھے۔ اس جگہ بھی پہاڑ کے اوپر تھوڑی سی جگہ تھی لیکن وہ بہت خوبصورت تھی۔ یہ شیخ صاحب

نے اڈے صاحب کا وہ خلوت خانہ اور لنگر خانہ دکھلایا اس جگہ اور کوئی بھی نہیں تھا، صرف شیخ صاحب کا ایک چھوٹا سا گھر تھا۔ شیخ صاحب نے اپنے گھر میں شہد کی مکھیاں بھی پال رکھی تھیں اور اسی دھندے پران کا گزر بسر تھا۔ ہم نے شیخ صاحب کے پاس رات گزاری۔ صبح ہم ان سے رخصت ہوئے۔ اور کوٹکی پہنچ گئے۔ کوٹکی کے خوانین زغرا ورخان اور زرہ ورخان بہت بھلے خانخیل تھے اور انگریز جہاں بھی قبائل پر چھاپے مارتے تھے، یہ لوگ انگریزوں کے خلاف ہر ایک جنگ میں شامل ہوا کرتے تھے۔ اس جگہ سے پھر سالارزیون میں آگئے اور وہاں سے ماموندوں میں چلے گئے۔ یہ دونوں قومیں باجوڑ کی آزاد اقوام تھیں اور بہت اچھے پختون تھے۔ پختونوں کی دیگر اقوام و قبائل کی طرح فرنگیوں کے زیر اثر نہ تھے اور نہ ہی ان سے پیسے یا مواجب لیا کرتے تھے۔ بلکہ جہاں کہیں بھی انگریزوں سے جنگ ہوتی تھی یہ اس میں شریک ہوتے تھے۔

ہم نے شنگر گل، اگبرے، کٹ کوٹ اور اسی طرح کچھ اور گاؤں میں بھی راتیں گزاریں۔ اور یہ سارا علاقہ گاؤں بہ گاؤں ہم نے دیکھا اور مرکز کے لئے ہم نے ماموندوں کے علاقہ میں "زگئے" نام کا گاؤں پسند کیا۔ یہاں ہم مولوی عبیداللہ صاحب سندھی کے انتظار میں تھے۔ ایک دو دن جب انتظار کر چکے اور وہ نہ آئے تو ہم نے یہ خیال کیا کہ ایسا نہ ہو کہ کہیں لوگوں کو ہم پر کسی قسم کا شک پیدا ہو جائے، میں نے ایک چلہ کاٹنے کا فیصلہ کیا۔ مسجد میں ڈیرا لگا رکھا تھا اس مسجد میں ایک چھوٹی سی کوٹھڑی تھی۔ میں نے اسی میں چلہ شروع کر دیا جب چلہ گزر جانے پر بھی عبیداللہ صاحب سندھی نہ آئے تو ہم اس جگہ سے چل پڑے۔ ما لاکنڈ تک تو فضل محمود صاحب کا وہ خالہ زاد بھائی میرے ساتھ رہا اور ما لاکنڈ سے میں نے اسے رخصت کر دیا۔

مالاکنڈ کے ایک پولیٹیکل ایجنٹ نے وہاں کے لوگوں پر ایسی دہشت بٹھا رکھی تھی کہ ان کے بڑے بڑے آدمی بھی جب کسی انگریز کو دیکھ لیتے تھے تو ان پر لرزہ طاری ہو جاتا تھا اور بہت دور سے اس کے آگے جھک جاتے تھے۔ اور بڑے ادب سے اُسے سلام کرتے تھے۔ اس کی وجہ ایک یہ بھی تھی کہ اگر کوئی آدمی انگریز کے سامنے آجاتا اور وہ انگریز کو سلام نہ کرتا تو اسے گرفتار کر لیا جاتا تھا اور اسے "کاٹھ" میں ڈال دیا جاتا تھا۔ کاٹھ ایک بڑی بھاری وزنی اور لمبی لکڑی ہوتی تھی۔ اس میں سوراخ ہوا کرتے تھے۔ ان سوراخوں کے اندر آدمی کے پاؤں دبا دیئے جاتے تھے اور اوپر سے لکڑی کے ڈھکنے کو ٹھوک ٹھوک کر بند کر دیا جاتا تھا۔ اس طرح آدمی اس میں بندھا ہوا پڑا رہتا تھا۔ میں بھی ڈرتا ڈرتا مالاکنڈ سے درگئی کی طرف نیچے اتر آیا اور درگئی پہنچ کر ریل گاڑی کے اندر بیٹھ گیا۔ اور تخت بائی چلا گیا۔ تخت بائی سے میں اپنے زراعتی فارم یعنی مہندناڑی کے گاؤں میں آگیا۔ وہاں میں نے رات گزاری اور دوسرے دن اپنے آبائی گاؤں اتمان زئی چلا آیا۔

دوسرے دن صبح بہت سے لوگ مجھے خوش آمدید کہنے آئے۔ کیوں کہ جاتے وقت میں نے یہ بات مشتہر کر دی تھی کہ میں اجمیر شریف جا رہا ہوں۔ تھوڑے دنوں کے بعد یورپ کی جنگ عظیم اول شروع ہو گئی اور مرکز قائم کرنے کی ہماری وہ اسکیم اسی جگہ رہ گئی۔ پھر اس کے بعد ہمیں ایک دوسرے کا کوئی حال احوال نہیں معلوم ہوئے۔ شیخ الہند محمود الحسن صاحب حج معلّٰے کے لئے مکہ شریف چلے گئے۔ انھیں مکہ میں شریف مکہ نے پکڑ کر انگریزوں کے حوالے کر دیا۔ انگریزوں نے انھیں مالٹا میں قید کر دیا، کیونکہ وہ ترکوں کی خلافت کے حق میں تھے مولوی عبیداللہ صاحب سندھی افغانستان چلے گئے اور مولوی سیف الرحمٰن صاحب

سرحد کی طرف واپس آگئے اور حاجی صاحب ترنگ زئی سے بلے اور اسی جگہ سے ہجرت کرکے بونیر کے آزاد علاقے میں چلے گئے۔

حاجی صاحب کے ہمراہ میرے کار گزار ساتھی مولوی تاج محمد صاحب جو بگدر دار العلوم کے مہتمم تھے، فضل ربی صاحب، مولوی فضل محمود صاحب اور مولوی عبد العزیز[1] صاحب بھی ہجرت کرکے چلے گئے۔ کچھ دن کے بعد میں بھی ملک چھپ کر ان کے پیچھے بونیر چلا گیا۔ بونیر کے لوگوں نے حاجی صاحب ترنگ زئی کو ایک بہت بلند سطح اور خوبصورت جگہ دے رکھی تھی۔ اور اس کی تعمیر کے لئے بہت سی عمارتی لکڑی بھی لے آئے تھے۔ لیکن اس علاقہ کے جو پیاں، ملّا اور مذہبی بزرگ تھے، وہ حاجی صاحب کی آمد سے خوش نہیں تھے۔ کیونکہ اُن کی آمد سے لوگوں کی تمام تر توجہ ان کی طرف مبذول ہو گئی تھی اور ان کے مقابلے میں مقامی نام نہاد دینی رہنماؤں کی کوئی وقعت نہیں رہی تھی، اس لئے ان لوگوں نے حاجی صاحب کے خلاف پراپیگنڈہ شروع کردیا کہ آیا یہ یہاں جہاد کے لئے آئے ہیں یا جائیداد کے واسطے؟

اس پراپیگنڈے سے حاجی صاحب اور اُن کے عزیز بادشاہ گل بڑے متاثر ہوئے تھے اور جنگ کرنے کا ارادہ رکھتے تھے۔ میں نے تو اُن کے اس ارادے کی بڑی سخت مخالفت کی اور انہیں سمجھایا کہ یہ خود غرض لوگ ہیں۔ ان کی باتوں کے پیچھے مت جائیے۔ آپ لوگ اپنا کام کرتے رہیں۔ یہ قوم انگریزوں کے مقابلے کے قابل نہیں ہے اور اگر آپ لوگوں نے انگریزوں سے

---

[1] مولوی عبد العزیز انتہائی طور پر انگریز دشمن تھے یہاں تک کہ وہ کسی انگریز کو دیکھتے تو آنکھیں بند کر لیتے تھے۔ مولانا انگریزوں کی سازش سے علاقہ سوات میں قتل کر دیئے گئے۔

جنگ شروع کردی تو یہ لوگ جنگ کے ناقابل ہونے کی وجہ سے مفید ثابت نہیں ہوں گے۔ مجھے تو ایسا لگتا ہے کہ یہ لوگ آپ لوگوں کو گرفتار کر کے انگریزوں کے حوالے کر دیں گے۔" لیکن میرا مشورہ انہیں اپنے ارادے سے باز نہ رکھ سکا۔ اور جب میں وہاں سے واپس چلا آیا تو چند دن بعد انھوں نے انگریزوں سے لڑائی شروع کردی۔ بونیری انگریزوں سے جنگ کہاں کر سکتے تھے اور ٹھیک وہی کچھ ہوا جو میں نے انہیں کہا تھا۔

بونیر کے لوگوں نے حاجی صاحب کو پکڑنے کی کوشش کی تاکہ انہیں پکڑ کر انگریزوں کے سپرد کر دیں۔ لیکن حاجی صاحب کو اس سازش کا علم ہوگیا۔ اور وہ رات ہی رات وہاں سے نکل کر مہمندوں کے قبیلے میں پہنچ گئے۔ لیکن انگریزوں نے اس سے بھی ایک ناجائز فائدہ اُٹھالیا۔ کیونکہ وہ تو یہ نہیں چاہتے تھے کہ پٹھانوں کے بچے تعلیم کے زیور سے مرصع ہوں۔ انہیں تو ہمارے یہ قومی مدرسے سخت ناپسند تھے۔ انگریز ان مدرسوں کو اپنے لئے ضرر رساں سمجھتے تھے۔ چنانچہ حاجی ترنگ زئی کی انگریزوں کے خلاف نبردآزمائی نے انگریزوں کے لئے یہ موقع اور بہانہ پیدا کر دیا کہ وہ ہمارے ہاں کے تمام قومی مدرسے بند کر دیں۔ انھوں نے یہ مدرسے تو بند کر ہی دیئے اور ساتھ ہی ان کے تمام اُستادوں کو گرفتار کر کے ڈیرہ اسماعیل خاں کے عادی مجرموں کے لئے مخصوص جیل میں ڈال دیا۔ انگریزوں نے ہمارے لوگوں پر ایسا خوف و ہراس طاری کر دیا کہ کوئی بھی شخص قوم کا نام لینے کی جرأت نہیں کر سکتا تھا۔ اور اگر شاذ و نادر کوئی ایسی بات منہ سے نکالتا بھی تو اسے جیل خانے میں ٹھونس دیا جاتا تھا۔

دسمبر ۱۹۱۵ء میں میرا لڑکا ولی پیدا ہوا۔ غنی اس وقت لگ بھگ تین

برس کا تھا۔ پھر جب پہلی جنگِ عظیم کے اختتام کے بعد ہندوستان بھر کو انفلوئنزہ کی نامراد بیماری نے لپیٹ میں لے رکھا تھا۔ ان بچوں کی ماں کو بھی اس بیماری نے آدبوچا اور وہ جہانِ فانی سے رخصت ہو گئی۔ اس کی وفات ایک عجیب غریب واقعہ تھا۔ خدا کی قدرت کا ایک غیر معمولی کرشمہ دیکھنے میں آیا۔ وہ بالکل چنگی بھلی تھی لیکن بیٹا غنی انفلوئنزا میں مبتلا تھا اور بے ہوش پڑا ہوا تھا اور اس کے بچنے کی کوئی امید نہیں تھی۔ موت اس کے سر پر منڈلا رہی تھی۔

شام کا وقت تھا۔ میں مصلّے پر بیٹھا ہوا تھا۔ عصر (شام) کی نماز میں نے ادا کر لی تھی اور دعا مانگ رہا تھا۔ قریب المرگ غنی کی چارپائی میرے سامنے پڑی تھی۔ اس اثنا میں اس کی ماں آگئی اور اس کی چارپائی کے چاروں طرف گھومی اور اس کے سر کی طرف آکر کھڑی ہو گئی۔ پھر اس نے دعا کے لئے ہاتھ اُوپر اُٹھا لئے اور اس کی آنکھوں سے آنسو بہنے لگے۔ وہ خدا سے عاجزانہ لہجہ میں کہہ رہی تھی "اے خدا! اس معصوم کی تکلیف اور بیماری مجھے منتقل کر دے اور اسے تندرست کر دے۔ یا خدا! اس کی بیماری مجھے لگا دے"۔

خدا کی قدرت دیکھیئے کہ جونہی رات گزری اور صبح ہوئی تو غنی آہستہ آہستہ اچھا ہونے لگا اور اس کی ماں آہستہ آہستہ بیمار پڑنے لگی۔ انجام کار غنی صحت یاب ہو گیا اور اس کی ماں جاں بحق ہو گئی۔

(۶)

۱۹۱۸ء میں جب پہلی جنگِ عظیم ختم ہو گئی تو لوگوں نے تھوڑا سکھ کا سانس لینا شروع کیا۔ لیکن جلد ہی ایک نیا ہنگامہ بپا ہو گیا۔ ہندوستان کے عوام آس لگا بیٹھے تھے کہ جنگِ عظیم میں ہندوستانی جوانوں کی قربانیوں اور خدمات کے صلہ میں انہیں کچھ نہ کچھ حقوقِ آزادی یا سیاسی مراعات فراواں کر دیئے جائیںگے۔

لیکن بسا آرزو کہ خاک شد۔ مراعات کے بدلے ۱۹۱۹ء کا رولٹ ایکٹ سا ایک کالا قانون بصورتِ تلوار گردنوں پر آویزاں کر دیا گیا۔ پھر کیا تھا ، ہندوستان میں غصّے کی ایک لہر دوڑ گئی۔ اس ایکٹ کے خلاف زبردست ایجی ٹیشن شروع ہو گئی۔ ہم بھی اس تحریک میں کود پڑے۔ اس ایکٹ کے خلاف جب ہم نے دوسرا جلسہ منعقد کیا تو لوگوں میں اس قدر جوش تھا کہ جلسہ میں ایک لاکھ سے زیادہ لوگ شامل ہوئے۔
اِنہی جلسوں کے ذریعے پٹھانوں میں ایک نئی زندگی پیدا ہوئی۔ ایک دن تہکال (اسلامیہ کالج پشاور کے قریب ایک گاؤں) میں جلسہ ہونے والا تھا ہم اس جلسے میں شامل ہونے کے لئے جا رہے تھے کہ راستے میں ہمیں پتہ لگا کہ مارشل لا جاری ہو گیا ہے۔ اس وقت افغانستان اور انگریزوں میں بھی جھگڑا شروع ہو چکا تھا ہم چند ساتھیوں نے مارشل لا سے محفوظ رہنے کے لئے افغانستان چلے جانے کا ارادہ کر لیا ہم نے سوچا کہ پہلے ہم مہندوں میں چلے جائیں گے اور پھر اس جگہ سے افغانستان چلے جائیں گے لیکن ہم بمشکل مہندوں کے علاقے ہی میں پہنچے تھے کہ میرے پیچھے میرے والد صاحب آ گئے اور انہوں نے ہمیں افغانستان جانے سے منع کر دیا۔
وہ ہمیں اپنے زراعتی فارم "مہندناڑی" لے آئے۔ وہاں ہم حکومت کے ڈر کے مارے کہیں چھپے رہتے تھے۔ اور رات کو گھر آتے تھے۔

آخر پولیس کو ہمارا پتہ لگ گیا۔ وہ آ گئی اور مجھے گرفتار کر لیا اور مجھے مردان لے جا کر جیل میں ڈال دیا۔ دوسرے دن مجھے پولیس کپتان کے سامنے پیش کیا گیا۔
اس نے حکم دے دیا کہ مجھے بیڑیاں پہنا دی جائیں مجھے پھر جیل خانے لے جایا گیا لیکن سارے جیل خانے میں میرے پاؤں کے ناپ کی بیڑیاں نہ ملیں کیونکہ اس زمانے میں میری صحت بہت اچھی تھی اور میں بڑا مضبوط و توانا تھا۔ تب انگریز کے ڈر کے مارے جیل والوں نے میرے پاؤں میں ایسی بیڑیاں ڈال دیں جو میرے

پاؤں میں بڑے عذاب سے آتی تھیں۔ مجھے موٹر میں بٹھا دیا گیا اور میرے ساتھ اسی موٹر میں سپرنٹنڈنٹ پولیس اور مردان کے اسسٹنٹ کمشنر بھی بیٹھ گئے۔ وہ مجھے پشاور لے گئے اور وہاں مجھے بڑے کپتان کے سامنے پیش کیا۔ پھر مجھے چھاؤنی کی حوالات میں بھیج دیا گیا جس وقت پولیس مجھے حوالات کی طرف لے جا رہی تھی تو وہ بیڑیاں جو زبردستی سے میرے پاؤں میں پہنادی گئی تھیں، میرے پاؤں کو ریتنے لگیں نتیجہ یہ ہوا کہ میرے پاؤں خون بہنے سے لت پت ہوگئے۔ اُن کی جلد بالکل اُدھڑ گئی۔ دوسرے دن میرے پاس ایک پولیس انسپکٹر آیا۔ وہ ایک آفریدی پشتون تھا۔ اس نے مجھ سے کہا "باہر نکل آؤ۔ تمہاری تاریخ پیشی ہے"

میں نے اُسے جواب دیا "اجی! میرے تو یہ پاؤں بالکل زخمی ہیں اور میں پیدل نہیں جا سکتا"

پولیس انسپکٹر بگڑ کر مجھ سے کہنے لگا "چلنے تو کر سکتے ہو لیکن پیشی کے لئے عدالت تک نہیں جا سکتے"

میں نے اس کے ساتھ بحث میں پڑنا مناسب نہ سمجھا لہٰذا میں نے اُسے صرف اتنی بات کہہ دی "میں پیدل چلنے کے قابل نہیں ہوں۔ اگر تم ٹم ٹم لے آؤ تو چلا چلوں گا اور اگر ٹم ٹم نہیں لاؤ گے تو نہیں جاؤں گا"

پولیس انسپکٹر ٹم ٹم لے آیا اور اس میں مجھے بٹھا کر عدالت میں لے گیا۔ مجھے کمرۂ عدالت سے باہر بٹھا دیا گیا اور مجھ سے پہلے ایک اور قیدی کو عدالت کے سامنے پیش کیا گیا۔ وہ قیدی ہمارے گاؤں کا رہنے والا تھا۔ اُس نے تار کاٹا تھا اور اس جرم میں وہ دو سال کے لئے قید تھا۔ اُسے آج پھر عدالت میں کیوں پیش کیا گیا تھا، اس بات کا راز اس وقت کھلا جب پیشی کے بعد اس آدمی کو میں نے

جیل خانے میں دیکھا اور اس نے مجھے بتایا کہ اس کو اس غرض کے لئے اس فوجی عدالت میں لے جایا گیا تھا کہ وہ اس امر کی شہادت دے کہ اس نے تار کاٹنے کا جرم عبدالغفار خان کی ہدایت پر کیا تھا۔ اُسے یہ یقین دلایا گیا تھا کہ اگر وہ ایسی شہادت دیدے گا تو اس کو دو سال کی قید معاف کر دی جائے گی۔ لیکن اس آدمی نے ایسی شہادت دینے سے انکار کر دیا۔

اس کے بعد مجھے پیش کیا گیا تب ایک کی بجائے تین انگریز عدالت میں بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ مجھ پر کئی طرح کے سوالات کرنے لگے میں کیا جواب دیتا ہم نے تو جلسوں میں کچھ کہا نہیں تھا صرف قراردادیں منظور کی تھیں

ایک انگریز نے مجھ پر سوال کیا "کیا تم حکومت کے خلاف لوگوں میں گھوما پھرا کرتے تھے؟"

میں نے اُسے جواب دیا "جن لوگوں کے پیچھے میں پھرتا ہوں وہ سب تمہارے خوانین و ملکان یا پنشن ہیں اور سرکار کے وفادار ہیں"

سوالات کے بعد انہوں نے پھر مجھے باہر بھیج دیا۔ باہر کچھ وقت تک بٹھلایا گیا۔ کیونکہ اندر وہ میرے بارے میں فیصلہ کر رہے تھے۔ حقیقت یہ تھی کہ ان دنوں ہمارے علاقے کے چیف کمشنر سر جارج روس کیپل تھے۔ انھیں پٹھان بہت پسند تھے اور ان کے ساتھ ہمدردی بھی رکھتے تھے۔ چونکہ مارشل لا کے سب سے بڑے افسر وہ خود ہی تھے اور تمام اختیارات اُنہی کے ہاتھ میں تھے اس لئے وہ کسی کو زور ظلم کرنے کی اجازت نہیں دیتے تھے۔

ایک گھنٹے کے بعد سپاہی مجھے جیل خانے میں لے آئے اور مجھے ایک ایسی بارک میں بند کر دیا گیا جس میں بہت سے کابلی پٹھان بھی مقید تھے۔ کچھ دنوں کے بعد اچانک میرے ضعیف العمر والد صاحب اپنے لواحقین اور اُس جگہ کے چند ساتھیوں کو

لے کر وہاں آ گئے۔ ابا جان نے جونہی مجھے دیکھا تو وہ بہت خوش ہوئے کیونکہ باہر یہ بات مشہور ہو گئی تھی کہ مجھے پھانسی دے دی گئی ہے (اور میں یہاں زندہ تھا)۔

انہوں نے مجھے ایک واقعہ سنایا کہ ادھر فوج گئی تھی اور اس نے اتمان زئی گاؤں کا محاصرہ کر لیا تھا۔ گاؤں کے تمام لوگوں کو ورسے کے میدان میں جمع کر لیا گیا تھا فوج کے ساتھ توپیں بھی تھیں۔ جب اس نے گاؤں کے لوگوں کو اس طرح ایک جگہ بٹھا دیا تو توپوں کے منہ ان کی طرف پھیر دیئے گئے تھے اور گورے توپچی توپوں کے اوپر چڑھ گئے تھے اور توپوں سے ایسی آواز پیدا کرنے لگے تھے جو ان کے داغنے سے پہلے پیدا ہوتی ہے۔ لوگوں کو ایسا لگا کہ انھیں توپوں سے اڑا دیا جائے گا۔

انہوں نے درود اور قرآن کی آیتیں پڑھنی شروع کر دیں تھیں لیکن توپوں سے گولے نہ برسے تھے اور نہ ہی بندوقوں سے گولی چلی تھی بلکہ خیر و عافیت سے آئی بلا سر سے ٹل گئی تھی لیکن اس سے لوگوں میں زبردست خوف و ہراس پھیل گیا تھا۔ ڈر کا یہ عالم تھا کہ ان کی آنکھوں کے سامنے محشر کا منظر گھومنے لگا تھا۔ خیر زندگیاں تو ان کی بچ گئی تھیں لیکن ان فوجیوں نے گاؤں میں لوٹ مار کرنے سے دریغ نہ کیا تھا۔ ہمارے گھر سے ایک انگریز خود ایک شکاری بندوق اٹھا کر لے گیا تھا۔ ڈپٹی کمشنر نے ہمارے گاؤں کے لوگوں پر تیس ہزار روپے اجتماعی جرمانہ کیا۔ لیکن پولیس اور خان بہادر عمر خان نے زور ظلم کے ذریعے گاؤں سے تیس ہزار روپے کی بجائے ایک لاکھ سے بھی زیادہ روپیہ لوگوں سے وصول کیا۔ ایک سو پچاس آدمی گرفتار بھی کیے گئے اور ان گرفتار شدگان میں سے اکیسو آدمیوں کو یرغمال قرار دیا گیا اور کہا گیا کہ جب جرمانہ وصول ہو جائے گا تب یہ رہا کر دیئے جائیں گے۔

اس وقت پولیس نے تو بے حد کوشش کی تھی اور بعد میں بھی کرتی رہی نہ

ہمیں افغانستان کی شورش سے وابستہ کردے اور اس نے ہم میں سے ایک آدمی کو جس کا نام "احمد استاد" تھا، سرکاری گواہ بن جانے کے لئے تیار بھی کر لیا تھا، لیکن پولیس اپنے مقصد میں کامیاب نہ ہوئی کیونکہ سرحد کا چیف کمشنر روس کیپل صاحب ہمارے خلاف مقدمہ نہیں چلانا چاہتا تھا تاہم ہمارے گاؤں کے اکثر خوانین کو جیل خانے بھیج دیا گیا تھا لیکن ایک خان جس کا نام محمد عمر خاں تھا۔ وہ انگریزوں یعنی حکومت کا ایسا پٹھو تھا کہ اس شخص نے پولیس کے ساتھ ساز باز کر کے لوگوں پر بہت زیادتیاں کیں اور ان پر مظالم توڑے اور لوگوں سے تین تین مرتبہ جرمانہ وصول کیا جب جرمانہ ادا ہو گیا تو وہ ایک سو آدمی رہا کر دیئے گئے اور ساڑھے تین مہینے بعد وہ دوسرے قیدی بھی چھوڑ دیئے گئے جو گاؤں پر چڑھائی کے وقت پکڑے گئے تھے۔ صرف میں ہی اکیلا رہ گیا تھا، لیکن چھ ماہ کے بعد مجھے بھی رہا کر دیا گیا۔ مصائب اور تکالیف تو ہم نے برداشت کرلیں، لیکن اس سے ہماری قوم کو ایک بہت بڑا فائدہ پہنچا اور وہ یہ کہ اس کی وجہ سے پٹھانوں میں سیاسی زندگی کی ابتدا ہوئی۔

(۷)

میں نے اپنی زندگی میں اس وقت تک دو مارشل لا دیکھے ہیں۔ ایک ۱۹۱۹ء میں انگریزوں کے زمانے میں، دوسرا پاکستان بن جانے کے بعد ۱۹۵۸ء میں۔ یہ دونوں مارشل لا میری طرف سے خواہ ایک مختصر اشارہ کر دیئے جانے کے حاجت مند ہیں، تاکہ دونوں حکومتوں کے طرزِ عمل کا موازنہ کیا جاسکے۔

انگریزوں نے جب مارشل لا لگایا تھا اس وقت ایک طرف تو افغانستان سے ان کی جنگ جاری تھی اور دوسری طرف ہنگامی اور تشدد کی کارروائیاں اتنا زور پکڑ گئی تھیں کہ انگریزوں نے ملک میں امن وامان کے قیام اور اپنی حکومت

کے ڈھانچے کو بحال رکھنے کے لئے سوائے اس کے اور کوئی چارہ نہ دیکھا تھا۔ انہوں نے یہ مارشل لا صرف دو تین مہینے جاری رکھا تھا۔

اب ذرا پاکستان کے مارشل لا کا بھی تجزیہ کر لیا جائے۔ پاکستان میں امن و امان تھا۔ حکومتی ڈھانچہ، عدالتی نظام اور عوامی تنظیمیں سب اپنی اپنی جگہ قائم تھیں کہ اچانک مارشل لا لگا دیا گیا۔ اور اس سے غرض یہ تھی کہ چند مخصوص آدمیوں کی حکومت زبردستی سے ملک پر ٹھونس دی جائے۔ لوگوں کو ان کے جمہوری حقوق سے محروم کر دیا جائے اور الیکشن کے آگے بھی بنا تے بند ڈال دی جائے۔ یہ مارشل لا قریباً چار سال جاری رہا۔ البتہ نتیجے کے لحاظ سے دونوں مارشل لا ایک ہی جیسی نوعیت رکھتے ہیں۔ انگریزوں کے مارشل لا نے ہندوستانی عوام میں یہ احساس پیدا کر دیا کہ اس غیر ملکی حکومت کے جوئے سے نجات حاصل کر لینا چاہیئے۔ چنانچہ ملک میں آزادی کی تحاریک دن بدن زیادہ ہونے لگیں اور انجام کار انگریز مجبور ہو گئے کہ ملک کو آزاد کر دیں اور یہاں سے نکل جائیں۔ پاکستان کے مارشل لا نے بھی عوام الناس میں یہ احساس اور جذبہ مضبوط کر دیا ہے کہ پاکستان کی حکومت عوام کی نمائندہ حکومت نہیں ہے بلکہ زور زبردستی، ظلم اور جبر و استبداد کے ذریعے ان کی پیٹھ پر سوار ہو گئی ہے۔ جس طرح انگریز اپنے اس مقصد میں کامیاب نہ ہو سکے کہ زور، زیادتی اور تم رانی سے اپنی حکومت کو قائم رکھ سکیں اسی طرح پاکستان کے حکمران طبقے کے لوگ بھی اپنے مقصد میں ہرگز کامیاب نہیں ہو سکیں گے۔ اور ایک دن یہ بھی ایسے ہی ختم ہو جائیں گے جیسا کہ انگریز ختم ہو گئے۔

میں جب قید سے رہا ہو کر آ گیا تو میں نے لوگوں میں ایک نیا جوش اور ولولہ دیکھا اور جہاں کہیں بھی ہم غم و خوشی کے موقع پر اکٹھے ہوتے وہاں لوگ ملک و ملت کی باتیں کرتے نظر آتے۔ اب لوگوں کے دلوں میں وہ خوف بھی نہیں رہا تھا۔

پیدا کرچکے رہا کرتا تھا۔ اُس وقت خلافت کی تحریک بھی بڑے زور وشور سے شروع ہو چکی تھی۔ ہندوستانی بھی ایک عجیب قوم ہیں۔ بیرونی ملکوں میں ان کی بڑی دلچسپی رہتی ہے۔ جتنی دلچسپی ہندوستان کے مسلمانوں نے اس تحریک میں لی تھی اگر اتنی دلچسپی انہوں نے اپنے ملک کی قومی تحریک میں لی ہوتی تو آج وہ دنیا کی قوموں کی صف میں اتنے دور افتادہ اور پس ماندہ نہ ہوتے۔ لیکن پھر بھی اس تحریک نے انھیں بہت بڑا فائدہ پہنچایا تھا۔ اور وہ یہ کہ ان کی تنظیم بن گئی شہروں کی تو بات ہی کیا ہے، دیہات میں بھی خلافت کمیٹیاں بن گئیں، لیکن اس بات کا افسوس ضرور ہے کہ یہ اس تنظیم کو قائم نہیں رکھ سکے۔ وجہ یہ تھی کہ ابھی لوگوں میں تنظیم قائم رکھنے کی اہلیت پیدا نہیں ہوئی تھی۔ اور جب تک یہ اہلیت پیدا نہیں ہوتی تب تک کوئی بھی قوم یا ملک کسی قسم کی تنظیم قائم نہیں کر سکتا۔ اہلیت پیدا کرنے کے لئے دو چیزوں کی اشد ضرورت ہوتی ہے۔ اول صحیح عقیدہ یا راستہ اور دوسرا اس راستے پر چلنے کے لئے صحیح لوگوں کا آگے آنا جو اس راستے، عقیدے یا مذہب کے علمبردار بن جائیں۔

دنیا میں بڑے بڑے پیغمبر آئے ہیں لیکن آپ دیکھ لیجئے کہ اگر انہوں نے اپنی اس قوم میں ایسے نیک اور پاک و بے غرض لوگ نہیں پیدا کئے جنہوں نے اُن کے ساتھ خدا کے واسطے کمر کسی ہو تو وہ پیغمبر بھی اپنے مقصد میں کامیاب نہیں ہوسکے۔ مذہب بھی ایک تحریک ہی ہوتی ہے۔ اگر اس تحریک میں بے لوث بے غرض اور پاک لوگ شریک ہوتے ہیں جنہوں نے خدا کے واسطے اپنے ملک اور قوم کی خدمت کے لئے کمر کسی ہوتی ہے تو وہ مذہب بصورت تحریک ثمر کامیابی کی سزاوار ہوتا ہے۔ ایسے لوگ خلقِ خدا کو بھی فائدہ پہنچا سکتے ہیں اور اپنے ملک و ملت کو بھی سُرخ رُو و شاداب کر سکتے ہیں۔

(۸)

میں جب تیراہ سے باہر آیا تو ماں باپ نے میری منگنی کر رکھی تھی۔ اور ان کی خواہش تھی کہ میری شادی ہو جائے۔ چنانچہ میں اور میرا ایک دوست محمد عباس خان سودا سلف لینے کے لئے پشاور روانہ ہو گئے۔ جب ہم سردریاب پہنچے تو پل کے کنارے پولیس ہمارے لئے بیٹھی ہوئی تھی۔ اس نے ہم دونوں کو پکڑ لیا۔ اور ہمیں واپس چارسدہ کے تھانے میں لے آئے۔ اس جگہ سے ہمارا چالان پھر پشاور کر دیا۔ پولیس افسروں کے ہمراہ جب ہم پشاور پہنچے تو سیدھے سی۔ آئی۔ ڈی کے بڑے افسر مسٹر شارٹ کے بنگلے پر لے جائے گئے۔ ہمیں بنگلے کے باہر سڑک پر کھڑا کر دیا گیا۔ ایک پولیس افسر اندر چلا گیا اور اُس نے شارٹ کے پاس ہماری رپورٹ کر دی۔ ہم سڑک پر کھڑے تھے۔ دیگر پولیس افسر بھی ہمارے ساتھ کھڑے تھے۔ شام کا وقت تھا اور دسمبر کا مہینہ، خوب کڑاکے کی سردی پڑ رہی تھی۔ ہم ایسی سخت سردی میں باہر سڑک پر کھڑے ہوئے تھے اور فرنگی کے لئے کمرے میں آگ جل رہی تھی۔ اور وہ بڑے آرام سے آگ کے سامنے بیٹھا ہوا تھا۔ اس میں اتنی انسانیت بھی نہیں تھی کہ ہماری تکلیف کا شمہ بھر بھی احساس کرتا۔ میرے ساتھی عباس خان نے مجھ سے پوچھا "ہماری یہ گرفتاری کس جرم میں ہوئی ہے؟ اور جب ہمیں پیش کیا جائے گا تو ہم کیا کہیں گے؟"

میں نے اسے کہا "سچ سچ کہہ دینا۔ خبردار! جھوٹ مت بولنا"

رات کافی گزر چکی تھی۔ یکایک عباس کے نام پر آواز آئی۔ اسے اندر لے جایا گیا اور پھر مجھے بھی شارٹ صاحب کے سامنے پیش کیا گیا۔ شارٹ طبیعت کے لحاظ سے بڑا سخت آدمی مانا جاتا تھا۔

اندر جا کر معلوم ہوا کہ نوشہرہ میں بم پھینکا گیا ہے اور میں اور عباس خان اسی

سلسلے میں گرفتار کئے گئے ہیں۔ شارٹ مجھ پر سوال کرتا تھا اور میں جواب دیتا تھا۔ میں زور زور سے بولتا تھا۔ اس سے شارٹ جھلا کر مجھ سے بولا "آہستہ بات کرو۔"
پھر جب میں نے آہستہ آہستہ بولنا شروع کیا تو اس نے کہا "زور سے بولو۔"
میں نے اسے کہا "اگر میں زور سے بولتا ہوں، تم کہتے ہو کہ آہستہ بولو۔ اور اگر آہستہ بولتا ہوں تو تم کہتے ہو کہ زور سے بولو۔ بہتر یہ ہوگا کہ پہلے تم مجھے باتیں کرنے کا ڈھنگ بتا دو۔"

اس بات سے شارٹ آگ بگولہ ہو گیا، لیکن مجھے اس نے کچھ نہ کہا البتہ اس نے پولیس کو آواز دی اور مجھے اس کے حوالے کر دیا۔ پولیس والے مجھے صدر تھانے لے گئے اور حوالات میں بند کر دیا۔ اس رات کسی نے مجھے روٹی بھی نہ دی۔ اور میں نے بھوکوں رات گزاری۔ میرا ساتھی عباس خان مجھ سے جدا کر دیا گیا تھا۔ اُسے کہیں کسی دوسرے تھانے کی حوالات میں بند کیا گیا۔ ایک طرف سردی تھی۔ دوسری طرف حوالات کا فرش سیمنٹ کا بنا تھا۔ حوالات کی کوٹھری کے دروازے غدار تھے۔ حوالات میں چند ایک گلے سڑے کمبل پڑے تھے جو بدبو اور جوؤں سے بھرے ہوئے تھے۔ انہیں جب میں دیکھتا تھا تو مجھے کراہیت ہونے لگتی تھی۔ لیکن دوسری طرف سردی نے میرا دم ناک میں کر رکھا تھا۔ آخر میں مجبور ہو گیا اور وہی کمبل جسم پر اوڑھ لئے۔ جب صبح سویرے اُٹھا تو میرے کپڑے جوؤں سے بھر چکے تھے مگر "قہر درویش برجان درویش" میں جوؤں کو پکڑتا اور باہر پھینک دیتا۔ ایک ہفتہ میں حوالات کی اسی کوٹھری میں بند رہا۔ اس کے بعد پھر مجھے اُسی فرنگی شارٹ کے سامنے پیش کیا گیا۔ جب میں انگریز کے سامنے لایا گیا تو اس نے مجھے چھوڑ دیا۔
میں نے اس سے پوچھا کہ آخر مجھے یہ تو بتایا جائے کہ مجھے کس بنا پر

گرفتار کیا گیا تھا اور اب کس طرح مجھے رہا کیا جا رہا ہے؟

اس نے مجھے جواب دیا "میں تحقیقات کر رہا تھا"

میں نے پھر استفسار کیا "کیا یہ تحقیقات مجھے گرفتار کرنے سے پیشتر نہیں کی جا سکتی تھی"

اس نے جواب یہ دیا "یہ میری مرضی پر منحصر ہے کہ پہلے تحقیق کروں بعد میں کسی آدمی کو گرفتار کروں، یا پہلے کسی آدمی کو پکڑ لوں اور بعد میں تحقیقات کروں"

میں نے اُسے کہا "آخر میں انسان ہوں۔ میری حیثیت کو دیکھو۔ مجھے بلا وجہ اس قدر تکلیف کیوں دی گئی ہے۔ میں کہیں بھاگتا تو نہیں تھا۔ تم نے تحقیق کی ہوتی۔ اگر میں گناہگار ثابت ہوتا تو پھر تم مجھے گرفتار کر لیتے"

اُس نے چھوٹتے ہی مجھے روکھا سوکھا جواب دیا "تمہاری پوزیشن ہی کیا ہے؟" میں نے اُسے کہا "بہت اچھا......" میں باہر نکل آیا۔ اور اپنے گاؤں کو چلا گیا۔

(۸)

سنہ ۱۹۲۰ء میں میری دوسری شادی ہو گئی۔ اسی سال دہلی میں خلافت کمیٹی کی آل انڈیا کانفرنس منعقد ہوئی۔ میں بھی اس کانفرنس میں شامل ہوا۔ اس کانفرنس میں عزیز نامی ایک جوشیلا نوجوان تھا۔ اس نے ہجرت کی تحریک پیش کی اور کہا کہ ہمیں اس ملک سے ہجرت کرنی چاہیئے۔ یہ بات اس وقت تو ہمیں ایک کھیل نظر آتی تھی، لیکن کھیل سے یہ مذاق اور پھر مصیبت کی شکل اختیار کر گئی۔ اس مصائب انگیز مذاق نے پٹھانوں کو سب سے زیادہ مالی اور جانی نقصان پہنچایا۔ کانفرنس کے بعد پشاور میں ہجرت کمیٹی بن گئی۔ اور جو بھی اصحاب ہجرت کر کے افغانستان جاتے تھے وہ اسی کمیٹی کے ذریعے جاتے تھے اور

یہ ان کے لئے ہر قسم کی سہولیت اور آرام کا انتظام کرتی تھی۔ شروع میں تو انگریزوں کی یہ کوشش تھی کہ لوگ ہجرت کر کے افغانستان نہ جائیں، لیکن جب حکومت نے یہ سمجھ لیا کہ لوگ باز نہیں آتے تو اس نے ایک بات پر زور دیا کہ بے شمار لوگ ہجرت کر کے چلے جائیں، کیونکہ ایک تو وہ افغانستان کے لئے مشکلات پیدا کر دیں گے۔ دوسرے سرکار اس بہانے سے ہندوستان سے سیاسی کارکن بھی باہر نکال دے گی اور خود بے فکر ہو جائے گی۔ اس طرح انگریزوں نے ہر طرف سے فائدہ اٹھایا۔

انگریزوں نے مہاجرین کے ساتھ ساتھ اپنے بہت سے تربیت یافتہ جاسوس بھی افغانستان میں بھیج دیئے۔ ہمارے ملاؤں اور مذہبی رہنماؤں نے فتوے صادر کرنے پر زور لگا رکھا تھا کہ "جو ہجرت نہیں کرے گا اس کا بیوی سے تعلق قطع ہو کر طلاق ہو جائے گی۔ کہتے ہیں کہ ہجرت کی تیز گام تھی جب اسے گھنگرو پہنا دیئے گئے تو پھر کوئی آنکھوں سے نہیں دیکھ سکا کہ کدھر چلی گئی۔ مردوں سے عورتیں زیادہ تیز ہو گئیں۔ میں نے خود ہجرت کی اور یہ سارا تماشہ میں نے اپنی آنکھوں سے دیکھا۔ امان اللہ خان ان لوگوں کو زمینیں دیتا تھا۔ نوکریاں بھی دیتا تھا اور تجارت میں حصہ بھی دیتا تھا لیکن انگریزوں کی طرف سے مہاجرین میں بھیجے ہوئے جاسوس یہ پروپیگنڈے کر رہے تھے کہ بھائی! ہم یہاں زمینیں لینے تو نہیں آئے۔ نہ ہی نوکری یا تجارت کرنے کے لئے آئے ہیں۔ ہم تو یہاں جہاد کرنے کے لئے آئے ہیں۔"

امان اللہ خان ان سے کہتا تھا: "میں تو انگریز کے ساتھ لڑنے کی طاقت نہیں رکھتا۔ میں تمہیں یہاں ایک نوآبادی دے دوں گا۔ تم لوگ پہلے اپنے اندر انگریزوں سے جنگ کرنے کی طاقت تو پیدا کر لو۔ مجھ سے بھی جس قدر ہو سکے گا میں بھی تمہاری

امداد کروں گا تمہیں معلوم ہو کہ انگریز تو کالا سانپ ہے۔ مجھے اطمینان سے نیند لینے نہیں دیتا۔ اس کی طرف سے مجھے ہر وقت یہ خطرہ لگا رہتا ہے کہ ابھی مجھے ڈس لے گا۔"

لیکن انگریزوں کے جاسوسوں نے مہاجرین کے درمیان ایسا کام شروع کر رکھا تھا کہ توبہ بھلی۔ کابل میں بھی ہجرت کا مخالف ایک ایسا ہی گروہ موجود تھا۔ وہ بھی چھپ چھپ کر ہجرت کو ناکامیاب بنانے کی کوشش کر رہے تھے۔ اگرچہ امان اللہ خان نے ان مہاجرین کو گرنے سے بچانے کی بہت زیادہ کوشش کی لیکن وہ لڑھک ہی گئے اور ہجرت ناکام ہو گئی۔

جب میں کابل میں تھا تو ایک دن میں امان اللہ خان سے ملاقات کرنے چلا گیا۔ میں نے اُن سے ملاقات کی۔ انہیں اور تو بہت سی زبانیں آتی تھیں لیکن پشتو نہیں جانتے تھے۔ ملاقات کے بعد میں نے اُن سے کہا۔

"میں آپ سے ایک بات کہنا چاہتا ہوں، بشرطیکہ آپ اجازت دیں"

انہوں نے کہا "ضرور کہو اجازت ہے"

میں نے اُن سے کہا "کتنے افسوس کی بات ہے کہ آپ کو اور زبانیں تو آتی ہیں، لیکن پشتو جو آپ کی اور افغانستان کی قومی زبان ہے، وہ آپ کو نہیں آتی"

اُنہوں نے یہ بات محسوس کی اور جلد ہی انھوں نے پشتو سیکھ لی۔ اس وقت نادر خان وزیر جنگ تھے۔ اور سردار داؤد خان کے باپ سردار عبدالعزیز خان وزیر تعلیم تھے۔ اِن بھائیوں سے میرے اچھے تعلقات تھے۔ سردار عبدالعزیز خان نے ایک دن مجھے کہا کہ میں حبیبیہ کالج دیکھنے جاؤں۔ میں وہاں گیا۔ کالج کے پرنسپل کی اجازت سے میں نے بعض جماعتوں کے لڑکوں سے سوالات پوچھے۔

"شما کیستی" ؟ (تم کون ہو؟)
انہوں نے جواب دیا "افغان ہستیم" (ہم افغان ہیں)
میں نے پھر انہیں کہا "ملکِ شما ؟"
لڑکوں نے جواب دیا "افغانستان"
"زبانِ شما ؟"
"افغانی"

میں نے ان سے پھر پوچھا "شما مے دانی ؟" (تم وہ جانتے ہو)
انہوں نے کہا "نے" اور وہ چپ ہو گئے۔ آنکھیں نیچی کر لیں۔
میں نے انہیں کہا "بگو آغا بگو" (کہو آقا کہو بھی)
جواب ملا "نمے دانم" (میں نہیں جانتا)
اب میں نے انہیں کہا "خوب افغان ہستی، افغانی نمے دانی" (تم خوب افغان ہو کہ اپنی افغانی زبان نہیں جانتے)

محمود طرزی افغانستان کے وزیرِ خارجہ تھے۔ وہ ایک نہایت قابل اور لائق انسان سمجھے جاتے تھے۔ ایک دن انہوں نے ایک بہت بڑی ضیافت کا اہتمام کیا۔ اس میں میں بھی مدعو کیا گیا۔ وہاں ضیافت میں شریک ہوئے اصحاب میں زبان کے سوال پر بحث چھڑ گئی۔ اس موقع پر محمود طرزی نے فرمایا "ہمارے لوگ فارسی بھی بولتے ہیں اور پشتو بھی"

جواب میں میں نے ان سے کہا "پشتو تو افغانستان کی قومی زبان ہے۔ ہم تو فارسی بولنے سے کسی کو منع نہیں کرتے۔ ہم تو یہ کہتے ہیں کہ آپ لوگوں نے اپنی زبان کیوں بھلا دی ہے ؟ پھر یہ تو اکثریت کی زبان ہے۔ انگریز جب ہندوستان میں آئے تھے اس وقت ہندوستان کی ایک بھی زبان ان کی اپنی زبان نہیں تھی

اور نہ ہی ہندوستان میں کسی کو ان کی زبان آتی تھی لیکن انہوں نے ہندوستان کی کسی بھی زبان کو حکومت کے کاموں میں رائج نہیں کیا تھا۔ اور اپنی ہی زبان کو سرکاری زبان بنایا تھا جس کا نتیجہ یہ ہوا کہ آج ہندوستان میں کروڑوں لوگوں نے اسی زبان کو سیکھ لیا ہے اور آج ہندوستان کے بعض حصوں کے لوگ دوسرے حصے کے لوگوں کی زبان تو نہیں سمجھتے، لیکن ہندوستان کا ایسا کوئی حصہ نہیں جسے انگریزی نہ آتی ہو۔ اسی طرح اگر آپ لوگوں نے اپنی اور افغانستان کی قومی زبان (پشتو) اس ملک میں رائج کی ہوتی اور اسے سرکاری زبان بنایا ہوتا تو آج اس ملک میں ایک بھی آدمی ایسا نہ ہوتا جو پشتو نہ سمجھتا۔ اور اس ملک اور قوم نے بڑی ترقی کی ہوتی۔ کیونکہ قوم کی ترقی اس کی اپنی زبان سے ہوتی ہے۔"

(۹)

ہمارے صوبے سے ہجرت کر کے جتنے بھی لوگ افغانستان گئے تھے وہ سب واپس چلے آئے۔ میرے بعض ساتھی تاشقند چلے گئے اور میں چند ساتھیوں کے ہمراہ باجوڑ چلا آیا تاکہ یہاں ان آزاد قوموں کی بستیوں میں مدرسے قائم کئے جائیں۔ دیر کے علاقے میں 'خالو' نام کے ایک گاؤں میں ہم نے ایک مدرسہ بھی کھول دیا اور اس میں مولوی فضل محمود صاحب مخفی کو اس کا انچارج بنا دیا۔ اس گاؤں کے لوگوں میں تعلیم کا بہت شوق ہے اور ان کے بچے بڑے ذہین ہیں۔ لیکن تعلیم حاصل کرنے کے لئے ان کے پاس کوئی ذریعہ نہیں تھا۔ کاب نامی ایک انگریز جو مالاکنڈ کا پولیٹیکل ایجنٹ تھا اور ہمارے ہاں اسسٹنٹ کمشنر بھی رہ چکا تھا۔ وہ پٹھانوں کی اس تحریک کا بہت سخت مخالف اور دشمن تھا۔ اس نے نواب دیر کو بلا بھیجا اور اسے متنبہ کیا: "دیکھو اس تعلیم نے ہمارے لئے کتنی مشکلات پیدا کی ہیں۔ اب تم اپنے لئے مشکلات مت پیدا کرو۔ یہ مدرسہ جو تمہارے علاقے میں کھلا ہے اسے فوراً تباہ کر دو۔" نواب نے مدرسہ مسمار کر دیا۔

اس قسم کے حالات تھے جن میں ہمیں کام کرنا پڑا۔ اور آپ اندازہ کر سکتے ہیں کہ ہمیں کتنی دشواریوں کا سامنا ہوتا تھا

میں نے حتی المقدور اس سمت میں کوششیں ------------ جاری رکھیں اور دیر اور باجوڑ دونوں ریاستوں کا دورہ کیا۔ میرے جو ساتھی تھے وہ سب چلے گئے تھے۔ ان میں سے ایک بھی میرے ساتھ نہ رہا۔ چونکہ اب میں یکسر اکیلا رہ گیا تھا، اسی لئے میں بھی واپس چلا آیا۔

اب میرے دل میں پھر وہی خیال موجزن ہوگیا کہ وہ مدرسے جو انگریزوں نے جنگ کے زمانے میں بند کر دیئے تھے انھیں پھر سے جاری کر دینے کی کوشش کروں

یہ وہ زمانہ تھا جب خلافت اور کانگریس ایک ہی اسٹیج پر جلسے کرتے تھے۔ انھی دنوں علی گڑھ مسلم یونیورسٹی میں کوئی تقریب تھی۔ میرے اور میرے دوست قاضی عطاء اللہ کے نام دعوت نامے آئے۔ ہم دونوں علی گڑھ چلے گئے۔ پھر ہمارا یہ خیال تھا کہ ہم خلافت کے جلسے میں بھی شرکت کریں گے۔

علی گڑھ یونیورسٹی میں ہمارے صوبہ کے بہت سے طلباء تعلیم پا رہے تھے ہم نے ان سے تبادلہ خیالات کیا۔ ان میں ایسے طلبا بھی تھے جنھوں نے ترکِ موالات کی وجہ سے کالج چھوڑ دیا تھا۔ یہ دسمبر ۱۹۲۰ء کے آخری دن تھے۔ میں اور قاضی صاحب بوجہ مصروفیت خلافت کانفرنس کے جلسے میں شامل نہ ہو سکے اور واپس اپنے گاؤں چلے آئے۔ انھی دنوں میرے بھائی ڈاکٹر خان صاحب تقریباً پندرہ سال کے بعد انگلینڈ سے واپس آگئے تھے۔ جنگ کے زمانے میں جب انہوں نے ڈاکٹری پاس کرلی تھی اسی وقت وہاں فوج میں بھرتی ہو گئے تھے۔ اب وہ کپتان تھے اور مردان رجمنٹ گائیڈز میں تعینات تھے۔

فروغ تعلیم کے لئے ہماری کوششیں جاری تھیں۔ سال ۱۹۲۱ء میں ہم نے اتمان زئی

میں دوستوں کی امداد سے ایک آزاد دینی اسکول کی بنیاد ڈالی۔ اس اسکول میں قاضی صاحب عطاء اللہ، میاں احمد شاہ، حاجی عبدالغفار خان، خان محمد عباس خان، عبدالاکبر خان، تاج محمد خان، عبداللہ شاہ اور خادم محمد اکبر خان میرے ساتھی تھے۔

ہم نے ایک انجمن بنائی جس کا نام رکھا "انجمن اصلاح الافاغنہ"۔ ہمارے اسکول میں اُستادوں کی قلت تھی۔ اس کی ایک وجہ یہ تھی کہ تھوڑی تنخواہ پر اچھے اُستاد ملتے نہیں تھے اور ہمارے پاس اتنے پیسے نہیں تھے کہ استادوں کو بڑی بڑی تنخواہیں دے کر ان کی خدمات حاصل کر سکتے۔ اس لئے میں خود لڑکوں کو سبق پڑھایا کرتا تھا۔ انہی دنوں لاہور میں خلافت کانفرنس منعقد ہوئی۔ ہم بھی اس میں شریک ہوئے۔ اس کانفرنس میں ضلع بنوں کے میرخیل گاؤں کے امیر مختار خان سے میری ملاقات ہوئی۔ وہ بھی اسی جلسے میں شریک ہونے کے لئے آئے تھے۔ ان کے ساتھ ان کے دو صاحبزادے بھی تھے۔ جن میں بڑے صاحبزادے کا نام امیر ممتاز خان اور چھوٹے کا نام مقصود جان تھا۔ یہ دونوں بھائی پشاور کے اسلامیہ کالج میں بی۔ اے کی تعلیم حاصل کر رہے تھے۔ ان دونوں نے بھی تحریکِ ترکِ موالات کی وجہ سے کالج چھوڑ دیا تھا۔ یہ دونوں لڑکے اُن کے باپ نے ہمیں ہمارے اسکول کے لئے دے دیئے۔ مقصود جان ہمارے اسکول میں سب سے پہلا ہیڈ ماسٹر تھا اور جب وہ دوبارہ اپنی تعلیم جاری کرنے کے لئے واپس پشاور چلا گیا تو اس کی جگہ اس کا بھائی امیر ممتاز خان ہمارے مدرسے کا ہیڈ ماسٹر ہو گیا۔

انگریزوں کو ہمارا یہ مدرسہ پسند نہیں تھا۔ ہمارے مدرسے میں جو بھی معلم آتا اُن کی طرف سے اُسے ڈرایا دھمکایا جاتا۔ اور جب ڈرانا دھمکانا کارگر ثابت نہ ہوتا تب زیادہ تنخواہ دینے کا لالچ دے کر ہم سے اُسے لے جاتے۔ اسی طرح مقصود جان بے چارہ جب کبھی اتمان زئی آتا تھا تو پولیس اُسے پریشان کرنے کے لئے کئی ہتھکنڈے استعمال کرتی، یہاں تک کہ اُسے سخت سے سخت تکلیف پہنچانے میں دریغ نہ کرتی۔

تحریک خلافت کے سلسلے میں ہم سرگرم رہتے تھے، لیکن دشواریاں اس راہ میں بھی کم نہ تھیں۔ پشاور میں خلافت کے ہمارے ساتھیوں میں نااتفاقی پیدا ہو گئی تھی۔ ان کی دو پارٹیاں بن گئی تھیں۔ ایک دن حاجی جان محمد صاحب اور ان کے ساتھیوں نے شاہی باغ میں ایک جلسۂ عام منعقد کیا اور اس جلسے میں یہ تجویز پیش کی کہ کیا آپ لوگوں کو حاجی جان محمد صاحب خلافت کمیٹی کے صدر منظور ہیں۔ لوگوں نے اس تجویز کی زور شور سے تائید کی اور وہ صدر بن گئے۔ دوسرے دن پشاور کے ایک سید صاحب اور ان کے ساتھی جمع ہو گئے۔ انھوں نے بھی جلسہ بلا لیا اور لوگوں سے کہا کہ یہ سید صاحب آلِ رسولؐ ہیں اور انھوں نے خدمات بھی کی ہیں، اس لئے حاجی جان محمد صاحب سے ان کا حق زیادہ ہے۔ مناسب یہ ہے کہ انھیں خلافت کمیٹی کا صدر بنایا جائے۔ لوگوں نے چلانا شروع کیا کہ "منظور ہے، منظور ہے"۔

اس قسم کے حالات کے درمیان خلافت کا کام چل رہا تھا۔ ارکان کے درمیان دن بدن کشمکش بڑھ رہی تھی اور بیچ بیچ میں کچھ بھی کام نہیں ہوتا تھا۔ کارکنوں کی طرف سے کسی ایک آدمی پر اتفاق نہیں کیا جاتا تھا۔ پشاور کے لوگ اچھے اور کام کرنے والے تھے، لیکن اس بے اتفاقی نے انھیں بے کار بنا رکھا تھا۔ میں کبھی کبھار خلافت کے دفتر میں جایا کرتا تھا تو دونوں فریق مجھ سے یہی باتیں کہتے تھے۔ دونوں پارٹیوں کے میرے ساتھ اچھے تعلقات اور بہت پیار و محبت تھی۔ مجھے دونوں کہا کرتے تھے کہ ہمارا دونوں پارٹیوں کا تمہارے اوپر اعتماد و اتفاق ہے، لہٰذا بہتر یہ ہوگا کہ آپ صدارت منظور کر لیں۔ لیکن مجھے اس میں دلچسپی نہیں تھی، کیونکہ میں صدارتوں اور عہدوں کا شوقین نہیں تھا اور میں ان چیزوں سے دور بھاگتا تھا۔ آخر مجھے انھوں نے مجبور کیا اور میں نے اس شرط پر ان کی صدارت منظور کر لی کہ صوبۂ سرحد میں جس قدر بھی چندہ جمع ہوگا، اُسے اسی صوبہ میں تعلیم پر خرچ کیا جائے گا اور دوسری کسی

طرف بھی نہیں لگایا جائے گا۔ میں خلافت کمیٹی کا صدر بن گیا اور عبدالقیوم خان سواتی سکریٹری ہو گئے۔

میں اسکول کے کام سے بے فکر ہو گیا اور میں نے میاں احمد شاہ کے علاقے میں دورے شروع کر دیئے۔ ایک مقصد یہ تھا کہ لوگوں سے تبادلہ خیالات کے مواقع حاصل ہوں گے دوسرا یہ کہ اپنے وہ پرانے مدرسے پھر سے جاری کئے جا سکیں گے۔
ہمارے مدرسے کو جاری ہوئے ابھی چھ مہینے ہوئے تھے کہ ہمارے صوبہ کے چیف کمشنر نے میرے والد صاحب کو بلایا اور ان سے کہا "دیکھو، سب لوگ آرام سے بیٹھے ہوئے ہیں اور تمہارا یہ لڑکا گاؤں گاؤں میں پھر رہا ہے، دورے کر رہا ہے اور مدرسے کھول رہا ہے۔ جب دوسرے لوگ نہیں کھولتے تو تم بھی مہربانی کرو۔ اپنے اس لڑکے سے کہہ دو کہ یہ بھی اپنے گھر میں آرام سے بیٹھ جائے۔"

جب میرے والد صاحب گھر آئے تو مجھے خلوت میں لے جا کر کمشنر صاحب کی وہ سب باتیں کہہ دیں اور ساتھ ہی سمجھایا "بچہ! آرام سے بیٹھو۔ جب دوسرے لوگ نہیں کرتے تو تم بھی مت کرو۔"

میں ابا جان کی اس بات سے بہت پریشان ہوا اور دل ہی دل میں کہنے لگا کہ دیکھو، یہ انگریز لوگ اپنے مطلب کے لئے باپ بیٹے میں بھی اختلافات پیدا کرتے ہیں۔
میرے والد صاحب ایک مذہبی خیال کے آدمی تھے۔ میں نے ان سے عرض کیا "اگر یہ تمام لوگ نماز ادا نہ کریں تو ابا جان! آپ مجھے یہ تو نہ کہیں گے کہ نماز ادا نہ کرو؟"
والد صاحب نے جواب دیا "واہ، یہ کیسے ہو سکتا ہے نماز تو ایک ضروری فرض ہے۔"
میں نے انھیں کہا "بس جس طرح نماز ایک ضروری فرض ہے اسی طرح علم اور قوم کی خدمت بھی فرض ہے۔"
اب ابا جان نے مجھ سے بڑی سنجیدگی کے ساتھ کہا "اچھا اگر یہ فرض ہے تو پھر

کرتے رہو۔

یہ کہہ کر وہ چلے گئے اور انہوں نے لاٹ صاحب سے کہہ دیا کہ "صاحب بہادر! ہم تمہارے لئے اپنا مذہب نہیں چھوڑ سکتے۔"

تھوڑے دنوں کے بعد حکومت نے مجھے گرفتار کر لیا۔ مجھ سے ضمانت طلب کی گئی میں نے انکار کیا تو ۱۱ر دسمبر ۱۹۳۱ء کو ایف سی آر دفعہ ۴۰ کے تحت مجھے تین سال کے لئے قیدِ سخت کی سزا دی گئی۔ اُس وقت جیل خانے بھی عجیب قسم کے ہوتے تھے۔ خوراک خوراک کی طرح نہیں ہوتی تھی اور کپڑے کپڑے کی طرح نہیں تھے ہمارے گاؤں کا ایک باپ اور بیٹا دونوں بیک وقت قید ہوئے تھے۔ جب اُن کے اپنے کپڑے اُتروا لئے گئے اور جیل خانے کے کپڑے انہیں پہنا دیئے گئے تو وہ بیٹا بے چارہ ان کپڑوں میں اپنے باپ کو نہیں پہچان سکتا تھا۔ وہ چیخ کر کہنے لگا کہ "اے بابا! تم کدھر چلے گئے؟" باپ نے اُسے کہا "بیٹا! میں تو تمہارے پاس ہی کھڑا ہوا ہوں۔"

یہ حال تو اُن باپ بیٹے کا تھا۔ اس روشنی میں اندازہ کیجئے کہ مجھ جیسا آدمی جس کی قد بھی لمبی ہو اور بدن بھی توانا ہو اس کا کیا حال ہوا ہوگا؟ میں نے جب جیل کے کپڑے پہن لئے تو میری شلوار پنڈلیوں سے اوپر تھی اور اُس کا آسن تنگ ہونے کی وجہ سے پھٹ جاتا تھا، اور قمیص میری کمر تک بھی نہیں پہنچتی تھی۔

اُس زمانے میں جب کوئی آدمی قید ہو جاتا تھا تو پہلے پہل اُسے قیدِ تنہائی کی کوٹھڑی میں بند کرتے تھے۔ اس کو بیس سیر اناج پیسنے کو دیا جاتا تھا۔ اُس کے پاؤں میں بیڑیاں پہنائی جاتی تھیں اور اس کے گلے میں لوہے کی گول کڑی (ہنسلی) ہوتی تھی۔ جس میں ایک چھوٹی سی چوبی تختی لٹک رہی ہوتی تھی۔ اس تختی پر قیدی کے جرم کی دفعہ اور قید کی میعاد لکھی رہتی تھی۔

اس جیل خانے کا دارو غہ ایک ہندو تھا جو ایک قسم کا تمدار تھا دوسرے

وہ قوم پرستوں سے ہمدردی بھی رکھتا تھا۔ اُس نے مجھے تنہائی والی کوٹھری میں تو بند کر دیا تھا لیکن چکّی پیسنے کو نہیں دی تھی۔ اور نہ ہی اُس نے میرے پاؤں میں بیڑی ڈالی تھی جیل خانے کی روٹی تو دیتا تھا لیکن وہ قدرے بہتر ہوتی تھی اور دال ساگ بھی کھانے کے قابل تھا ہماری چکّی (قیدِ تنہائی والی کوٹھری) کا رخ شمال کی طرف تھا۔ سو یہاں دھوپ بالکل نہیں آتی تھی اور اس میں بڑی سخت سردی تھی۔

مجھے تین کمبل اور ایک بوری کی قسم کا ٹاٹ دیئے گئے تھے لیکن اس میں گزارہ کرنا بڑا محال تھا۔ اس کے علاوہ ہم دن رات کوٹھری میں بند رہتے تھے۔ جب کبھی کسی اچھے جمعدار کی ڈیوٹی لگ جاتی تو ہمیں ایک آدھ گھنٹے کے لئے کوٹھری سے باہر نکال لیتا اور ہم لوگ دھوپ میں بیٹھ جاتے تھے۔ ایک تکلیف یہ تھی کہ ہم رات کو بھی آرام سے نیند نہیں لے سکتے تھے کیونکہ تین تین گھنٹے کے بعد پہرے داروں کی تبدیلی ہوا کرتی تھی۔ لہذا ایک کے بعد جب دوسرا پہرہ دار آتا تو پہلے وہ تالے کو کھٹکھٹاتا پھر آواز دیتا کہ "بول جاتی!" جب تک اندر سے جواباً آواز نہیں دی جاتی تو وہ بار بار سُننے کا وہ نام نہ لیتا۔ اگر قیدی کی طرف سے آواز دینے میں تھوڑی سی سستی ہو جاتی تو دوسرے دن اس کو سزا ملا کرتی۔

مجھے جس وقت گرفتار کر کے پشاور جیل میں پہنچایا گیا تھا تو مجھے پہلے دن میں بند کرنے کے جیل خانے کی "قصوری چکّی" کے اندر بند کر دیا گیا تھا جب میں چکّی کے اندر داخل ہو رہا تھا (یہاں چکّی سے مراد وہ کوٹھری ہے جس میں قیدی سے مشقت لینے کے لئے چکّی رکھی رہتی ہے) تو چکّی میں بڑی سخت بدبو تھی کیونکہ اس میں پاخانے سے لبالب بھرا ہوا مٹی کا برتن پڑا ہوا تھا میں نے جیل خانے کے افسر سے کہا۔ یہ چکّی بہت گندی ہے تو اُس نے مجھے جواب دیا کہ "یہ جیل خانہ ہے" اور مجھے چکّی کے اندر دھکیل دیا گیا اور دروازہ بند کر دیا گیا۔

مجھے گرفتار کئے جانے کے بعد میرے خلافت کے اور ساتھی بھی گرفتار کر لئے گئے تھے اور ایسی ہی چکیوں میں انہیں بھی بند کیا گیا تھا۔ ہم چوبیس گھنٹے ان چکیوں میں بند رہتے تھے۔ روٹی بھی ہمیں چکیوں میں جنگلے کی سلاخوں میں سے دی جاتی تھی۔ صرف اس وقت ہماری چکیوں کے دروازے کھولے جاتے تھے جب جیل خانے کا بھنگی صفائی کے لئے آتا تھا۔ چکیوں کے باہر ہم پر ہر وقت ڈبل پہرہ لگا رہتا تھا تاکہ کوئی شخص ہمارے نزدیک نہ پھٹک سکے۔ نہ ہمارے ساتھ باتیں کر سکے۔ اس ظالمانہ سلوک کا نتیجہ یہ نکلا کہ ہمارے اور ساتھیوں نے ضمانتیں داخل کر دیں اور صرف میں نے اور عبدالقیوم خان سواتی نے ضمانت دینے سے انکار کر دیا۔ اور ہم دونوں کو تین تین سال قید سخت کی سزا دی گئی۔ مجھے تین سال قید کی سزا کا حکم کیسے سنایا گیا۔ یہ قصہ بھی سننے کے قابل ہے۔ جب جیل خانے میں آئے ہوئے مجھے دس دن ہو گئے تھے تو مجھے چکی سے نکالا گیا تھا اور ڈپٹی کمشنر کے سامنے پیش کیا گیا تھا۔

ڈپٹی کمشنر ایک عجیب قسم کا انگریز تھا اور میرا مقدمہ بھی عجیب ہی تھا جب مجھے پولیس نے اس کے سامنے پیش کیا تو اس نے میرے جرم کی بابت پوچھا۔ پولیس نے اسے بتلایا کہ ایک تو اس نے ہجرت کی ہے اور دوسرے اس نے آزاد اسکول قائم کیا ہے۔

ڈپٹی کمشنر نے انہیں کہا " جب اس نے اس ملک سے ایک دفعہ ہجرت کی تھی تو پھر اسے واپس کیوں اس ملک میں آنے دیا گیا ؟ اور اسے ادھر داخل ہونے کی اجازت کیوں دی گئی ہے "

میں نے اسے کہا کہ " افسوس تو اس بات کا ہے کہ ایک تو تم لوگوں نے ہم سے ملک لے لیا ہے اور اب ادھر ہمیں رہنے بھی نہیں دیتے ہو "

میرا یہ کہنا تھا کہ صاحب بہادر اور بھی جل بھن گیا اور پولیس کو حکم دیا کہ جاؤ

اسے یہاں سے دور کرو، میں نے اسے تین سال قید کی سزا دے دی ہے۔"

پولیس مجھے لے آئی اور جیل والوں کے حوالے کر دیا۔

اس وقت جیل خانے میں قیدیوں کے لئے اپنے پاس کھانے کی چیز رکھنا بھی جرم تھا۔ میں اپنی چکی (تنہائی کی کوٹھری) میں بیٹھا ہوا تھا کہ اس دوران میں ہمارے گاؤں کا ایک قیدی نمبردار آیا۔ اس نے میری چکی پر دو ٹکڑے گڑ کے رکھ دیئے اور چلا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد اس پہرے دار نے جس کا ہم پر پہرہ تھا مجھے کہا کہ جیلر صاحب آ رہے ہیں۔ یہ سن کر مجھے اس گڑ کی فکر ہو گئی کہ اب اس کا کیا کروں گا۔ کبھی سوچتا کہ کمبل کے نیچے چھپا لوں۔ کبھی خیال کرتا کہ ٹاٹ کے نیچے دبا دوں۔ پھر مجھے خیال آیا کہ اگر یہ کمبل جیلر نے اوپر اٹھا لیا تو میں کیا جواب دوں گا۔ بہرحال وہ گڑ میں نے پڑا رہنے دیا۔ داروغہ صاحب آئے۔ تلاشی نہیں لی۔ اور واپس چلے گئے۔ اس وقت قیدیوں کی روزانہ تلاشیاں ہوا کرتی تھیں۔ جب داروغہ صاحب چلے گئے تو میں نے وہ گڑ اٹھایا اور باہر پھینک دیا۔ پھر میں نے دل میں یہ فیصلہ کر لیا کہ جیل خانے میں کبھی کوئی ایسا کام نہیں کروں گا جو جیل خانے میں ممنوع اور جیل کے قانون کے خلاف ہو گا۔ کیونکہ ایسا کرنے سے انسان کے دل میں خوف پیدا ہوتا ہے۔ میں نے اپنے بہت سے ایسے سیاسی ساتھیوں کو دیکھا تھا جو اس قسم کے کام کرتے تھے تو وہ جیل والوں کی بڑی خوشامدیں کرنے کے علاوہ انھیں سلام بھی کیا کرتے تھے۔

کچھ دنوں کے بعد مجھے ملنے کے لئے ڈاکٹر خان صاحب اور کچھ دوسرے لوگ آئے تھے۔ وہ میرے لئے حکومت کا پیغام بھی لائے تھے۔ حکومت کے پیغام میں یہ پیشکش کی گئی تھی کہ میں مدرسے بیشک کھولوں مگر یہ دورے بند کر دوں۔ اگر دورے کرنے بند کر دوں گا تو سرکار مجھے جیل خانے سے رہا کر دے گی۔ میں نے حکومت کی یہ پیشکش ٹھکرا دی۔

ان چکیوں میں میرے ساتھ اور بھی بہت سے قیدی بند تھے۔ ان میں چمرکنڈ کے مجاہدین بھی شامل تھے۔ میں جب کابل سے باجوڑ آیا تھا تو چمرکنڈ میں ان مجاہدین سے ملنے گیا تھا اور انھیں میں نے بہت سمجھایا تھا کہ خیال رکھنا۔ سرحد اور پنجاب کی طرف مت آنا کیونکہ اُن کے کچھ آدمی گرفتار ہو چکے تھے۔ دوسری نصیحت میں نے انہیں یہ کی تھی کہ چندوں کے پیچھے تم لوگ کتنے دنوں تک پھرتے رہوگے، کیوں نہ تم اپنے یہاں کھڈیوں کا کوئی کام دھندا شروع کردو۔ اس کے علاوہ تمہارے پاس خچریں موجود ہیں اور تمہارے قریب کنڑ کا افغان علاقہ ہے۔ وہاں قسم قسم کے میوے ہوتے ہیں۔ اگر تم لوگ وہ میوے خریدو اور انہیں مہمندوں کے اس علاقے میں بیچو تو اس سے تمہارا اچھا گزارہ ہوتا رہے گا اور دوسروں کے آگے دستِ سوال دراز کرنے سے تمہیں نجات بھی مل جائیگی۔ یہ نصیحت میں نے اُنھیں اس لئے کی تھی کہ اُن کے علاقے میں ایک دو دن رہ کر اُن کے حالات و عادات کا مطالعہ کیا تھا۔ میں نے دیکھا تھا کہ وہ لوگ بیکار پڑے رہتے تھے۔

یہ مجاہدین بونیر سے یہاں آئے تھے۔ وہاں ان کی آپس میں لڑائی ہو گئی تھی اور انہوں نے اپنے امیر کو قتل کر دیا تھا۔ یہ پنجابی تھے۔ حقیقت یہ ہے کہ ہمارے ان پنجابی بھائیوں کی فطرت میں پارٹی بازی اور جھگڑے فسادات بھرے ہوئے ہیں۔ اور بونیر میں جو مجاہدین ہیں ان میں اکثریت بنگالیوں کی تھی اور وہ آپس میں پیار و محبت سے رہ رہے تھے، لیکن ان میں جونہی یہ پنجابی شریک ہو گئے تھے تو انھوں نے گروہ بندیاں اور جھگڑے فساد شروع کر دیئے تھے اور انجام کار انہوں نے امیر کو موت کے گھاٹ اتار دیا تھا چنانچہ انہیں بونیر سے نکال دیا گیا تھا تب یہ لوگ چمرکنڈ آگئے تھے۔ یہاں بھی ان میں پارٹی بازی جاری تھی۔ ان کا لیڈر مولوی فضلِ الہٰی ایک بہت بڑا پارٹی باز اور خطرناک آدمی تھا۔ کابل سے واپس آتے وقت میں نے اسے کابل میں دیکھا تھا اور میں نے اسے بڑی نصیحت کی تھی۔ اسی فضلِ الہٰی نے ایک نہایت

اچھے کارکن مولوی بشیر کو اسی سازباز اور یارٹی بازی کی وجہ سے قتل کر دیا تھا۔ مولوی بشیر ایک نہایت نیک۔ اور مخلص کارکن تھے۔

جیل خانے میں ان مجاہدین کا بہت برا حال تھا۔ یہ آپس میں ایک دوسرے کو بڑی سختی سے زدوکوب کیا کرتے تھے لیکن میرے آتے ہی ان کی حالت بہتر ہو گئی تھی۔ ان کا ایک آدمی جو قرآن شریف کا حافظ بھی تھا اُسے پولیس نے اپنے ہاتھ میں لے رکھا تھا۔ ان میں جو بھی آدمی کام کا ہوتا تھا اُسے وہ حافظِ قرآن پولیس کو دکھلا دیا کرتا تھا اور خود کھسک جاتا تھا اور چمرکند سے اسی بہانہ سے اُس آدمی کو روانہ کر دیتا تھا کہ چلو فلاں جگہ ملیں، چندہ خوب ملیگا۔ اسی طرح جب اُسے اپنے ساتھ لے کر مقررہ جگہ پہنچ جاتا تھا تو اس بے چارے کو پولیس کی تحویل میں دے دیا کرتا تھا۔ یہ قصہ ان مجاہدین نے مجھے سُنایا اور یہ بھی بتایا کہ وہ حافظ قرآن پھر کسی کو پھانسنے کے لئے گیا ہوا ہے۔ اب کے اس کی نظر ہمارے بہت اچھے اور ممتاز کارکن پر ہے۔ آپ ایسا کیجیے کہ یہ حافظِ قرآن اپنے جال میں پھنسا کر یہاں لے آئے گا اس لئے کوئی ایسا انتظام ہو جائے جس سے چمرکند میں یہ اطلاع پہنچ جائے کہ اس حافظِ قرآن کے ساتھ کوئی بھی شخص آنے کا نام نہ لے۔

ان مجاہدوں نے مجھ سے یہ بھی کہا کہ یہاں ایک ہمندی ہے وہ کچھ ہی دنوں کے بعد رہا ہونے والا ہے۔ اس کا گھر چمرکند کے نزدیک ہے اور اگر میں ایک چھوٹا سا رقعہ لکھ دوں، تو یہ رقعہ اس ہمندی کے ہاتھ چمرکند بھجوا دیں گے۔ اس طرح ان کے وہاں کے مجاہدین کو اطلاع مل جائے گی اور وہ اس حافظ قرآن کے دام میں نہیں آئیں گے۔ پہلے میرا ارادہ کسی قسم کا رقعہ لکھ دینے کا نہیں تھا لیکن جب میں نے سوچا کہ یہ تو ان لوگوں کے لئے ایک بہت بڑی مصیبت اور عظیم نقصان ہے تو پھر میں نے ایک مختصر سا خط لکھا اور جس دن وہ ہمندی رہا ہونے والا تھا اس سے

ایک دن پہلے ہم نے اُسے وہ خط دے دیا۔

اِس جیل میں عام قیدی تو ان چکیوں میں ایک ہفتے تک بند کئے جاتے تھے لیکن مجھے بند ہوئے دو مہینے ہو گئے تھے۔ دو ماہ کے بعد مجھے اس جیل خانے سے ڈیرہ اسمٰعیل خاں کے اخلاقی مجرموں کے لئے مخصوص جیل میں منتقل کرنے کے لئے روانہ کر دیا گیا۔

(۱۰)

مجھے ڈیرہ اسمٰعیل خاں پہنچا دیا گیا۔ لیکن پشاور سے لے جاتے وقت مجھے پھر جو دوسرے دن بیڑیاں پہنائی گئی تھیں وہ میرے پاؤں سے نہ نکالی گئیں۔ اور مجھے چکی میں بند کر دیا گیا۔ پھر دوسرے دن مجھے بیس سیر گندم پیسنے کے لئے دیئے گئے لیکن یہ اچھا ہوا کہ اُس گیہوں میں ایک دانہ بھی ثابت نہیں تھا۔ سب کیڑوں نے کھا رکھے تھے۔ لہٰذا گندم پیسنے میں مجھے چنداں تکلیف نہ ہوئی۔ اس جگہ کا داروغہ ایک بوڑھا مسلمان تھا۔ وہ سپاہی کے عہدے سے داروغہ بنا تھا۔

وہ انگریزی نہیں جانتا تھا۔ پنشن پر ریٹائر ہونے والا تھا۔ جیل خانہ کا سپرنٹنڈنٹ ایک انگریز تھا جو انگریزی کے علاوہ دوسری کوئی زبان نہیں جانتا تھا۔ اس وجہ سے جیل خانے کا سارا کام گنگارام ہی کیا کرتا تھا۔ وہ ڈپٹی جیلر تھا۔ داروغہ بہت نیک انسان تھا، لیکن گنگارام سخت رشوت خور اور غلیظ آدمی تھا۔ وہ رشوت حاصل کرنے کے لئے قیدیوں کو آپس میں لڑاتا بھڑاتا تھا۔ ایک دن میں چکی پیس رہا تھا تو اس اثنا میں داروغہ صاحب آ گئے۔ اور اُنہوں نے مجھ سے کہا "چکی آہستہ پیسو!"

میں نے پوچھا "کیوں؟"

اُنہوں نے جواب دیا "میں خدا کو کیا جواب دوں گا جب وہ مجھے کہے گا کہ اس جیل خانے میں چودہ سو قیدی موجود تھے ان میں ایک خدا کے واسطے آیا تھا تم نے

مجھ سے بھی چکی پسوائی تھی؟"

میں نے اُن کی دلجوئی کے لیے چکی پیسنا بند کر دیا اور جب وہ باہر چلے گئے تو میں نے پھر چکی پیسنا شروع کر دیا۔ وہ باہر کھڑے ہو کر دروازے کے ایک چھوٹے سوراخ کے ذریعے مجھے دیکھ رہے تھے۔ وہ پھر میری اسی کوٹھری کے اندر آ گئے اور بولے "تم یہ چکی کیوں پیستے ہو؟"

میرے عین سامنے چکیوں کی اُس دوسری قطار میں ایک آدمی چکی پیس رہا تھا میں نے داروغہ صاحب سے کہا "آپ اس آدمی کو دیکھیں، یہ ایک قتل اور راہزنی کا مجرم ہے اور اسی گندے مقصد کی بدولت یہ چکی پیس رہا ہے مگر میرا مقصد تو بڑا نیک و پاک ہے تو میں اپنے اس پاک مقصد کی بدولت چکی کیوں نہ پیسوں؟"

دوسرے دن داروغہ صاحب نے چکیوں کے جمعدار کو میرے متعلق یہ حکم دیا کہ مجھے آئندہ گیہوں کی بجائے آٹا دیا جائے۔ دوسرے دن جب جمعدار میرے پاس آٹا لے کر آئے تو اُس کے ساتھ تھوڑے سے دانے بھی تھے۔ یہ دونوں چیزیں میرے حوالے کرتے ہوئے جمعدار نے مجھ سے کہا: "جب صاحب آئے تو یہ گیہوں پیسنا۔"

میں نے اُن سے کہا "اگر صاحب نے مجھ سے پوچھ لیا کہ تمہیں آٹا دیا جاتا ہے یا گیہوں؟ تو میں جھوٹ نہیں بولوں گا اور اُن سے کہہ دوں گا کہ مجھے آٹا دیا جاتا ہے۔"

جمعدار بولے "پھر تو میں نوکری سے بھی جاؤں گا۔"

میں نے اُن سے کہا "لیکن میں تو آپ کو موقوف نہیں کرانا چاہتا۔ میں تو آپ سے کہتا ہوں کہ مجھے دانے (گیہوں) دیا کیجیے۔"

اس جیل خانے کی خوراک بہت خراب تھی۔ روٹی میں اتنی مٹی ہوتی تھی کہ اسے چبا نہیں سکتا تھا اور جو ساگ ہمیں دیا جاتا تھا اُسے تو میں نے بلی کے آگے رکھا تھا لیکن اس نے نہیں کھایا۔ داروغہ صاحب نے مجھے بہتیرا کہا کہ وہ مجھے کھانا اپنے گھر سے بھجوا دیا کریں گے، لیکن میں نے منظور نہ کیا۔ جو آدمی دودھ بانٹا کرتا تھا وہ مجھے دودھ دینا چاہتا تھا لیکن میں نہیں لیا کرتا تھا کیونکہ دودھ میرے ٹکٹ پر نہیں لکھا گیا تھا۔ ڈاکٹر صاحب اس آدمی کو کہا کرتے تھے کہ وہ مجھے دودھ دیا کرے لیکن میں دوسرے کا حصّہ نہیں لیتا تھا۔ اُدھر گنگا رام تھا کہ اُس نے میرے پاس اپنے ایجنٹ بھیجنے شروع کر دیئے۔ وہ مجھے کہا کرتے تھے "دیکھو، گنگا رام کو کچھ دے دو۔ ایسا کرنے سے تمہیں چکی (قید تنہائی کی کوٹھری) سے نکال دے گا۔ اور دوسری بات یہ ہے کہ ہم پشاوریوں کے لئے یہ شرم کی بات ہے کہ تم چکی میں بند رہو اور گیہوں پیستے رہو۔ اور اگر تم کچھ بھی نہیں دینا چاہتے تو ہم اپنی جیب سے دے دیں گے۔"

میں اُن کی باتیں سُن کر حیران ہوتا اور کہتا: "بھئی، رشوت دینا اچھا کام نہیں ہوتا اس لئے نہ رشوت آپ دیں اور میں تو خیر کبھی دینے کا نہیں ہوں۔ آپ نہیں جانتے کہ میں محض اس لئے سزائے قید بھگت رہا ہوں کہ میں ضمانت دینے سے انکاری ہوں۔ اگر مجھے رشوت ہی دینی ہوتی تو ضمانت کیوں نہ دے دیتا۔ تاکہ قید کی اذیت نہ اٹھانی پڑتی۔"

اس جیل خانے میں لڑکے قیدیوں کا بہت بُرا حال تھا جس کسی نے بھی گنگا رام کو پانچ روپے دے دیئے، وہ اپنی لیبڈر کے لڑکے کو یا تو اپنے ساتھ چکی والی کوٹھری میں بند کر لیتا تھا یا اُسے اپنے ساتھ بارک میں لے جاتا تھا۔ ایک دن میں نے داروغہ صاحب سے کہا: "آپ ایک اچھے نماز گزار آدمی ہیں لیکن خدا

کو اس بات کا کیا جواب دیں گے کہ آپ کے جیل خانے میں مسلمان بچّوں کی عزت محفوظ نہیں ہے۔ پشاور کے جیل خانے میں جو ہندو داروغہ ہے وہاں مسلمان بچّوں کی عزت پر کوئی ہاتھ نہیں ڈال سکتا۔"

خیر بات تو جیل کی خوراک کی چل رہی تھی۔ ایک دن میں چکّی پیس رہا تھا۔ اور باڈی میں وہ ساگ پڑا ہوا تھا کہ جیل کے سپرنٹنڈنٹ صاحب آ گئے۔ میں نے وہ ساگ دکھلا کر ان سے کہا "دیکھئے، یہاں بلّی آئی تھی میں نے اس کے آگے یہ ساگ رکھا تھا اور اس نے نہیں کھایا۔ یہ ساگ حیوان بھی نہیں کھاتے اسے آپ انسان کو دیتے ہیں۔"

یہ سپرنٹنڈنٹ ڈاکٹر بھی تھے۔ انہوں نے مجھے کہا "یہ ساگ تو بہت اچھا ہے۔" اب میں اس بارے میں ان سے کیا کہتا۔ میں نے اسی طرح کی دوسری بات چھیڑ دی۔ میں نے کہا "اچھا وہ سامنے کی چکّی والا جو آدمی ہے ذرا اس کی بیڑیوں کو دیکھئے اور میری بیڑیاں بھی دیکھئے۔ وہ بھی بیس سیر گیہوں پیستا ہے اور میں بھی بیس سیر پیستا ہوں۔ وہ بھی چکّی میں بند ہے اور میں بھی چکّی میں بند ہوں۔ اس کا کیا جرم ہے اور میرا کیا جرم ہے؟ اور آپ کے اپنے دیش میں جو میری طرح کا قیدی ہوتا ہے اس کے ساتھ کس قسم کا سلوک ہوتا ہے؟"

سپرنٹنڈنٹ نے مجھے کوئی جواب نہ دیا اور چلا گیا۔ دوسرے دن میری مشقت بدل دی۔ مجھے کارخانے بھیج دیا تاکہ لفافے بناؤں ـــــ ایک دن وہ سپرنٹنڈنٹ پھر اُدھر آئے۔ مجھ سے بولے، وہ کچھ دن کے بعد مجھے اس چکّی (کوٹھری) سے بھی نکال دیں گے۔ اس کارخانے میں صوبۂ سرحد کے تمام ضلعوں کے قیدی تھے۔ اکثر وہ آپس میں دست بگریباں ہوتے اور ان کے تمام جھگڑے لڑکوں کے سلسلے میں ہوتے۔ وہ سب میرے پاس آیا کرتے اور میں انھیں آپس

میں لڑائی جھگڑے اور بڑے کاموں سے منع کیا کرتا تھا۔ ان کے درمیان مفاہمت اور صلح صفائی کرا دیتا تھا۔

بعض ایسے قیدی بھی تھے کہ وہ مشقت سے ڈرتے تھے اور مشقت انھیں ایک بہت بڑی مصیبت نظر آتی تھی۔ اسی وجہ سے وہ گنگا رام کو رشوت دیتے تھے۔ میں نے انھیں اس کام سے منع کر دیا۔ اس سے گنگا رام کی دکان جب ٹھنڈی پڑ گئی تو وہ اس فکر میں مبتلا ہو گیا کہ مجھے کسی طرح اس جیل خانے سے منتقل کر دے۔ میرے خلاف اس نے سپرنٹنڈنٹ سے رپورٹ کر دی کہ میں جیل خانے میں اپنا پروپیگنڈا کرتا ہوں اور ان کے لئے مشکلات پیدا کرتا ہوں اور اگر مجھے یہاں رکھا جائے گا تو وہ جیل خانے کا ڈسپلن قائم رکھنے سے معذور ہو جائے گا۔ اس طرح اس نے میرے خلاف ایک مقدمہ سا بنا لیا۔

گنگا رام کی رپورٹ کے سلسلے میں سپرنٹنڈنٹ صاحب اُدھر آئے۔ انھوں نے مجھ سے چند استفسار کئے اور انھیں معلوم ہو گیا کہ گنگا رام جھوٹ بولتا ہے، لیکن بیچ میں ڈسپلن کا سوال پیدا ہو گیا تھا۔ انگریز کے آگے اگر ڈسپلن کا نام لے لو تو پھر اس سے جو بھی کرانا چاہو، کرا سکتے ہو۔ لہٰذا اسی ڈسپلن کی آڑ لے کر مجھے ڈیرہ غازی خان کے جیل خانے میں منتقل کر دینے کے احکام جاری ہو گئے۔ میں نے دو مہینے پشاور کے جیل خانے میں گزارے تھے اور تقریباً دو ماہ ہی مجھے یہاں آتے ہوئے گزرے تھے۔ اس عرصے میں میرا وزن بیتالیس پونڈ کم ہو گیا تھا اور خراب خوراک کی وجہ سے میرے دانتوں کے مسوڑھے خراب ہو گئے تھے اور ان میں پائیوریا کا عارضہ لاحق ہو گیا تھا۔

ایک دن جیل خانے میں پولیس کی ایک موٹر آئی جس کے ارد گرد چاروں

طرف پردے لگے ہوئے تھے۔ میرے پاؤں میں بیڑیاں، ہاتھوں میں ہتھکڑیاں اور گلے میں طوق پڑا تھا۔ جیل کے تنگ اور چھوٹے لباس میں مجھے خود اپنی شکل عجیب نظر آتی تھی۔ خدا جانے لوگوں کو میں کیسا نظر آتا ہوں گا۔ خیر ایک پردہ نشین خاتون کی طرح مجھے پردے کے اندر موٹر میں بٹھا دیا گیا اور دریا خان پہنچا دیا گیا۔ ریل گاڑی ہمارے پہنچنے سے پہلے نکل گئی تھی۔ ہمیں رات اسٹیشن پر آگئی۔ وہاں مجھے کسی کے نزدیک تک نہیں جانے دیا جاتا تھا اور نہ ہی کسی اور کو میرے پاس پھٹکنے دیا جاتا تھا۔ اور تو کیا میرے ہاتھوں کی ہتھکڑیاں تک نہ کھولی گئیں۔ میرے ساتھ پولیس والے سب پختون تھے اور اس پر طرفہ یہ کہ تھانیدار انچارج تو ہمارے ہی علاقے کا آدمی تھا۔ اس کا نام نادر خان تھا اور وہ ڈیکائٹ کے نام سے مشہور تھا۔

دوسرے دن جب گاڑی آئی تو مجھے نوکروں کے ڈبے میں بٹھا دیا گیا۔ راستے میں گاڑی جس اسٹیشن پر بھی پہنچتی مجھ پر اس قدر سخت پہرہ ہوتا کہ مجھے دیکھنے کے لئے کسی کو میرے قریب نہیں آنے دیا جاتا۔ بالآخر ہم غازی گھاٹ پہنچ گئے وہاں مجھے لینے جو پولیس آئی ہوئی تھی اس کا افسر ہندو تھا۔ وہ میرے پاس آیا اور پٹھان گارڈ سے میرا چارج لے لیا۔ اس نے میری ہتھکڑیاں کھول دیں اور مجھے کہا کہ "تھوڑا اسٹیشن پر گھوم پھر لیجئے۔ میں جب اس کے ساتھ ٹہل رہا تھا تو اس اثنا میں ہمارا وہ انچارج پختون پولیس افسر آیا اور اس ہندو پولیس افسر سے کہا "ہائے ہائے، یہ تم نے کیا کر دیا ہے مجھے تو تم نے غرق کر کے رکھ دیا ہے۔"

ہندو پولیس افسر نے جواب دیا "اب یہ میرے چارج میں ہیں اور ان کی ساری ذمہ داری میرے سر ہے۔ جاؤ تم فکر کس لئے کرتے ہو۔"

تھوڑی دیر کے بعد پولیس مجھے لے کر ڈیرہ غازی خان کے لئے روانہ ہو پڑی۔ دریا کے کنارے پہنچے کشتی کے ذریعے جب ہم نے دریائے سندھ کو پار کر لیا تو یہاں

تانگہ موجود تھا۔ اس میں ہم بیٹھ گئے اور ڈیرہ غازی خاں کے جیل خانے میں پہنچ گئے۔ میں جس وقت جیل خانے کے دروازے پر پہنچا اس وقت وہاں عبدالرشید خان، جو کرنل عبدالمجید خاں کا لڑکا تھا، لالہ دنی چند انبالوی سے ملاقات کر رہا تھا اور ان کے ساتھ ان کے عزیز و اقارب آئے ہوئے تھے۔ پھر جب میں جیل خانے کے اندر چلا گیا تو انہوں نے مجھے کہا "ہم نے جب تمہیں پہلے پہل دیکھا تو ہمارا خیال تھا کہ یہ کوئی بہت بڑا ابزن، ڈاکو اور قاتل ہوگا جسے یہاں لے آئے ہیں۔" خیر جیل خانے کے اندر پہنچتے ہی میری بیڑیاں کاٹ دی گئیں۔ یہ ایک چھوٹا سا جیل خانہ تھا اس میں پنجاب کے سیاسی قیدی تھے۔ ایک بارک میں سی کلاس کے قیدی تھے اور دوسری میں اسپیشل کلاس کے۔ ہمارے صوبہ میں کوئی کلاس نہیں تھی۔ اس لئے مجھے سی کلاس کے قیدیوں میں رکھا گیا تھا۔

لیکن اس سی کلاس کی روٹی بہت اچھی تھی۔ جیل خانے کا سپرنٹنڈنٹ بہت اچھا آدمی تھا۔ وہ سیاسی قیدیوں کو گیہوں دیا کرتا تھا۔ وہ اسے خود صاف کیا کرتے تھے۔ اور خود ہی اس کا آٹا پیستے تھے، پھر اپنے ہی ہاتھوں سے روٹی پکایا کرتے تھے۔ اور ہانڈی (سالن) بھی خود اپنے ہی ہاتھوں پکایا کرتے تھے۔

میرے لئے تو سب سے بڑی مصیبت وہ بیڑیاں تھیں جن سے کہ مجھے نجات مل گئی تھی۔ پھر سی کلاس کے سب قیدی سکھ اور ہندو تھے۔ یہ بہت پیارے اور خوش خلق لوگ تھے۔ میری تو بڑی آؤ بھگت کرتے تھے۔ ان کی شفقت بیان سازی تھی۔ اور میں یہ کام نہیں کر سکتا تھا۔ میں نے سپرنٹنڈنٹ سے کہہ دیا کہ مجھے اس کی بجائے کوئی اور کام دے دیا جائے۔ اسپیشل کلاس کے قیدیوں کو میرے بارے میں پتہ لگا تو انہوں نے بھی سپرنٹنڈنٹ کو میرے لئے زور دیا کہ مجھے ان کی بارک میں منتقل کر دیا جائے۔ سپرنٹنڈنٹ ایک بہت اچھا مسلمان تھا اس نے انہی کی بارک میں بدل دیا اور مجھے

چرخے کی مشقت لکھ دی۔ یہ مجھ پر خدا کا بے حد فضل و کرم تھا کہ مجھے ڈیرہ اسمٰعیل خان سے ڈیرہ غازی خان کے جیل خانے میں منتقل کر دیا گیا۔ اگر مجھے وہیں رکھا جاتا تو مجھے یقین نہیں ہے کہ میں صحیح سلامت رہ جاتا۔ وہاں مجھے ایسے شستہ و شائستہ عالموں کی سوسائٹی کہاں ملتی تھی، جس سے میں نے بہا بھاری فائدہ اٹھایا اور سب سے بڑا فائدہ یہ تھا کہ پنجاب کے لوگوں سے میری جان پہچان ہو گئی اور اچھے تعلقات پیدا ہو گئے۔ اس کے علاوہ ہم ایک دوسرے کے خیالات اور عقائد سے بھی واقف ہو گئے۔ اور جب یہ لوگ حالات سمجھ گئے تو انہوں نے اخبارات کے ذریعے میرے حق میں سرکار کے خلاف اس قدر زوردار احتجاج کیا کہ حکومت کچھ عرصے ہی کے بعد مجھے بھی اسپیشل کلاس میں رکھنے پر مجبور ہو گئی۔

ڈیرہ اسمٰعیل خان میں خراب خوراک کی وجہ سے میرے دانت خراب ہو گئے تھے۔ جب میں یہاں آ گیا تو سپرنٹنڈنٹ نے مجھے علاج معالجے کے واسطے لاہور سنٹرل جیل میں بھیج دیا۔ اس جیل کا داروغہ خیر الدین خان تھا جس کی قوم پرستوں سے کوئی ہمدردی نہیں تھی بلکہ وہ انگریزوں کو خوش کرنے کی خاطر بڑی سختی سے کام لیتا تھا۔ اس کے بدلے میں انگریز نے اُسے چھٹی دے رکھی تھی کہ قیدیوں کے ساتھ جس طرح اس کا دل چاہے ویسا سلوک کرے اور اس کا سلوک سیاسی قیدیوں سے بہت خراب تھا۔ جیل خانے میں خلافت اور کانگریس دونوں کے قیدی تھے۔ میں بھی تو خلافت والوں میں سے ایک تھا اس لئے مجھے ان کے پاس نہ پہنچایا گیا اور مجھے اکیلے ہی ایک چکی یعنی قید تنہائی کی کوٹھڑی میں بند کر دیا گیا۔ ان چکیوں میں بہت سے سکھ قیدی بند تھے۔ اور وہ اس وجہ سے بند کئے گئے تھے کہ وہ ست سری اکال کے نعرے لگاتے تھے۔ سکھوں میں ایک بہت زبردست جذبہ پیدا ہو گیا تھا۔ اُن پر جتنی زیادہ سختی جیل والوں کی طرف سے کی جاتی تھی، ان کا جذبہ بھی اتنا ہی زیادہ بڑھتا جاتا تھا۔ جب خلافت

والوں کو میرے حالات معلوم ہوئے تو انہوں نے شور مچا دیا اور دوسرے دن ہی مجھے چکی سے نکال لیا گیا اور سیاسی قیدیوں کے ساتھ یکجا کر دیا۔ اس جگہ آغا صفدر، ملک لال خاں، لالہ لاجپت رائے اور اسی طرح بہت سے کانگریسی رہنما موجود تھے۔ مجھے ان سب کے ساتھ تبادلہ خیالات کا موقع ملا۔ آغا صفدر، ملک لال خاں اور میں نے قرآن کا درس شروع کر دیا لیکن ملک لال خاں نے بہت جلد ہمارے ساتھ اس درس میں شرکت ترک کر دی، کیونکہ وہ کہتا تھا کہ لوگ قرآن کے مختلف معنی نکالتے ہیں۔ وہ بے چارے لکیر کے فقیر تھے۔ ان میں اتنی سوجھ بوجھ اور علم نہ تھا کہ ہمارے سمجھانے کا اُن پر کچھ گہرا اثر ہو پاتا۔

کچھ دنوں کے بعد ڈینٹل سرجن آیا۔ مجھے اس کے پاس دفتر میں لے جایا گیا۔ اس کا نام پریم ناتھ تھا۔ واللہ واقعی وہ پریم کا مجسمہ تھا۔ اس نے میرے دانت دیکھے۔ اور اُن میں سے ایک دو نکال دیئے۔ باقی دانتوں کو صاف کر دیا۔ اس نے مجھے بتایا کہ یہ پایوریا ہے اور خراب خوراک کی وجہ سے تمہارے دانتوں کو لگا ہے۔ دوائی اور خوراک بھی اس نے مجھے لکھ دی۔ میں نے اسے کہا کہ میں امیر آدمی ہوں اور میرے روپے جمع ہیں۔ مہربانی کرو۔ تم اپنی فیس لے لو۔ لیکن وہ فیس لینے سے برابر انکار ہی کرتا رہا۔ جب میں نے اس سے بہت اصرار کیا تو اس نے مجھے کہا کہ "آپ نے کونسا گناہ کیا ہے؟ آپ تو ملک و ملت سے محبت اور خدمت کرتے ہوئے یہاں آئے ہیں۔ اس لئے اگر میں آپ سے فیس لوں گا تو مجھے شرم نہیں آئے گی کیا؟" اگر میں آپ کی طرح اس قدر قربانی نہیں کر سکتا تو یہ تھوڑی سی خدمت تو کر ہی سکتا ہوں" غرض کہ اس نے مجھ سے فیس وغیرہ کچھ نہ لیا اور اپنا بیگ اٹھا کر چلا گیا۔

میں کچھ دن کے بعد پھر واپس ڈیرہ غازی خان کے جیل خانے میں بھیج دیا گیا ریل گاڑی میں پولیس کی حفاظت میں سفر شروع ہوا۔ گرمی کا موسم تھا اور دوپہر کا

وقت۔ گرمی کے مارے بُرا حال ہو رہا تھا۔ گاڑی شیر شاہ اسٹیشن پر رُکی تو مجھے وہاں اُتار دیا گیا۔ یہاں ہم کو گاڑی بدلنی تھی۔ پولیس کا وہ افسر جو میری گارڈ کا انچارج تھا بہت اچھا آدمی تھا۔ وہ مجھے ویٹنگ روم کی طرف لے گیا۔ روم کے دروازے بند تھے۔ پولیس افسر نے دروازہ کھٹکھٹایا۔ ایک آدمی نے دروازہ کھول دیا۔ کمرہ میں ایک پیر صاحب اپنے مریدوں کے ساتھ سو رہے تھے۔ پولیس افسر نے ایک کرسی اُٹھائی اور میرے آگے رکھ دی۔ میں اس پر بیٹھ گیا۔ پولیس افسر نے مجھے سلام کیا اور باہر چلا گیا۔

پیر صاحب کا ایک مرید اُن کے لئے ہاتھ سے پنکھا جھل رہا تھا اور ہمارے آجانے سے پیر صاحب کی نیند بھی کُھل گئی تھی۔ پیر صاحب نے یہ سارا تماشہ دیکھ لیا تھا۔ پیر صاحب کو یہ مغالطہ ہو گیا تھا کہ میں شاید پولیس کا کوئی بہت بڑا افسر ہوں۔ پیر صاحب کے ساتھ ان کا ایک معصوم بچہ بھی تھا۔ یہ پیر صاحب ہندوستان میں خیرات و صدقے جمع کرنے کے لئے گئے تھے اور بہت سے صندوق مال و اسباب کے بھر کر لائے تھے۔ وہ تونسہ شریف کے بڑے پیر تھے۔ مجھے ننھے بچوں سے بیحد پیار و محبت ہے اور اس معصوم بچے کا بھی مجھ سے بہت پیار ہو گیا۔ وہ میرے پاس بیٹھ گیا تو ہلنے کا نام ہی نہ لیا۔ پیر صاحب پہلے تو بڑے خوش تھے کہ میں شاید پولیس کا ایک بہت بڑا افسر ہوں۔ لیکن بعد میں جب میں باہر نکلا اور وہ بچہ بھی میرے ساتھ آگیا تو لوگوں نے مجھے دیکھا اور پہچان لیا۔ پھر کیا تھا بھاری تعداد میں لوگ میرے اردگرد جمع ہو گئے، تب پیر صاحب کو معلوم ہوا کہ میں تو خلافت کا آدمی ہوں پھر کیا تھا پیر صاحب نے فوراً اپنا ایک مرید اپنے ننھے بچے کو لے جانے کے لئے ہمارے پیچھے بھیج دیا لیکن وہ بچہ کہاں مجھ سے جُدا ہونے لگا تھا۔ آخر اسے رُلا کر ہی مجھ سے جدا کیا گیا۔ بچے کو لے کر پیر صاحب ویٹنگ روم چھوڑ کر چل دیئے۔

(۱۱)

ڈیرہ غازی خان' لاکر۔ مجھے جیل کی ایک بارک میں بند کر دیا گیا۔اس بارک میں مسلمان بہت تھوڑے تھے۔ ہندو اور سکھ بہت زیادہ تھے۔ ہمارا ایک ماسٹر تھا۔ اس کا نام گوردت مل تھا۔ بہت اچھا آدمی تھا اور میرے ساتھ تو اُس کی گہری محبت تھی۔ جب وہ پرارتھنا کیا کرتا تھا تو شانتی شانتی کا پاٹھ خوب کرتا تھا لیکن وہ خود شانت نہیں تھا۔ معمولی سی بات پر بہت بگڑ جاتا تھا۔ سکھ جب سب اکٹھے ہو جاتے تو یہ شبد بڑے شوق سے گاتے کہ "سر جاوے تاں جاوے میرا سکھی دھرم نہ جاوے" یہ سن کر مجھے بہت لطف آتا تھا۔ میں کہتا تھا کہ ہندوؤں اور مسلمانوں کی نسبت سکھوں میں یہ جذبہ اس وجہ سے فراواں ہے کہ ان کی مذہبی کتاب اپنی مادری زبان میں ہے اور وہ الفاظ و معانی کا کما حقہ اثر حاصل کر سکتے ہیں۔ نیز اسی وجہ سے وہ اپنے مذہب کی فضیلت اور عبادت سے بھی خوب واقف ہیں اور ہم ہندو اور مسلمان جس زبان میں عبادت کرتے ہیں اسے ہم نہیں سمجھتے۔ ہندوؤں کی عبادتی زبان سنسکرت اور ہماری عربی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ نہ تو ہم اپنے عبادتی کلام کے معنی و مفہوم کو سمجھ پاتے ہیں اور نہ ہندو لوگ۔ اب غور کیجئے کہ ایک آدمی جو اپنے مذہب سے واقف نہیں اور نہ ہی مذہبی کلام کو سمجھتا ہے، وہ کیا ترقی کرے گا؟

اس جیل خانے میں ہمارے دن بڑے اچھے گزر رہے تھے اور کچھ توؤں کے بارے میں انگریزوں نے جو بہت سی غلط فہمیاں ہندوؤں کے دلوں میں پیدا کر رکھی تھیں ان کی کسی قدر اصلاح ہوگئی۔ ایک دن میرا ایک ہندو دوست مجھے کہنے لگا: "میں ایک بات آپ سے پوچھتا ہوں لیکن شرط یہ ہے کہ آپ خفا نہیں ہوں گے۔"

میں نے جواب دیا "ہرگز نہیں"
ہندو دوست نے کہا "میں نے سُنا ہے کہ پٹھان انسان کا خون پیتے ہیں؟"
میں نے جواب دیا "ہاں، ہاں خوب پیتے ہیں"
وہ چلّا سا اُٹھا "باپ رے باپ" اس نے پھر پوچھا "یہ کیوں پیتے ہیں؟"
میں نے جواب دیا "اس لئے کہ یہ بہت ہی لذیذ ہوتا ہے"
وہ پھر چلّا اُٹھا "باپ رے باپ"
میں نے اب ذرا سنجیدہ لہجے میں ہندو دوست سے پوچھا "دوست! یہ بات تمہارے دماغ میں پیدا کیسے ہوئی ہے؟ کیا تم کبھی پٹھانوں کے دیش میں گئے ہو، تم نے پٹھان دیکھے بھی ہیں، تمہارا ان سے کبھی واسطہ بھی پڑا ہے؟"
اُس نے جواب دیا "نہیں"
میں نے اُس سے پھر پوچھا "تم پھر کیسے اس نتیجے پر پہنچ گئے ہو؟"
اس کا جواب اس کے پاس یہ تھا کہ "اس نے کسی کتاب میں پڑھا ہے"
کچھ دنوں کے بعد ہمیں خبر ملی کہ محکمۂ جیل کا جرنیل دَورے پر آرہا ہے۔ اس کا نام کرنل واڈ تھا۔ یہ بڑا سخت طبیعت آدمی تھا اور اس کا قوم پرستوں سے تو خدا واسطے کا بیر تھا۔ غرضیکہ ہر لحاظ سے بڑا خراب آدمی تھا جس وقت وہ اس جیل کا معائنہ کرتا ہوا ہماری بارک میں داخل ہوا اور اُس نے ہندوؤں کے سروں پر ٹوپیاں اور سکھوں کے سروں پر کالی پگڑیاں دیکھیں تو آگ بگولہ ہوگیا۔
وہ داروغہ پر برس پڑا کہ "اس چیز کی اجازت تم نے انہیں کیوں دی ہے؟"
ہمارا سپرنٹنڈنٹ بڑا اچھا آدمی تھا۔ وہ بھی انگریز ہی تھا۔ اس نے جرنیل

سے کہا "یہ ان کا نہیں میرا قصور ہے"
جرنیل چلا گیا اور جیل کے افسروں کو حکم دے گیا کہ وہ ان قیدیوں سے گاندھی ٹوپی اور "کالی دستاریں" لے لیں۔

دوسرے دن جب سپرنٹنڈنٹ اور داروغہ آئے تو ہمیں جرنیل کا یہ حکم سنایا گیا۔ سردار کھڑک سنگھ نے ان سے کہا "ہم اسپیشل کلاس کے قیدی ہیں اور حکومت نے ہمیں اپنے کپڑے پہننے کی اجازت دے رکھی ہے۔ اس لئے یہ ہماری مرضی پر منحصر ہے کہ جس طرح کے کپڑے ہمیں پسند ہوں ویسے کپڑے ہم پہنیں۔ لہٰذا جرنیل صاحب کا یہ حکم ناجائز ہے اور یہ ہمارے ان حقوق میں جو حکومت نے ہمیں دے رکھے ہیں بے جا مداخلت ہے"

لیکن اس بات پر انہوں نے کان نہ دھرے۔ انہوں نے کہا "ہم تو مجبور ہیں۔ ہم لوگ جرنیل صاحب کے حکم کی تعمیل کریں گے۔ لہٰذا ہم تم کو حکم دیتے ہیں کہ یہ ٹوپیاں اور پگڑیاں اُتار لو"

ہم نے ان سے مزید دلیل بازی نہ کی۔ کیونکہ دلیل کو وہ نہیں مانتے تھے۔
جب یہ لوگ چلے گئے تو ہم سب ایک جگہ بیٹھ گئے اور آپس میں مشورہ کر کے فیصلہ کیا کہ حکومت نے چونکہ ہمیں اپنے کپڑے پہننے کا حق دیا ہے تو یہ ہماری مرضی ہے کہ جس طرح کے کپڑے پہننے کو ہمارا دل چاہے اسی قسم کے کپڑے پہنیں۔ اور یہ کہ جیل والوں کا یہ حکم جائز نہیں ہے اس لئے ہم اسے نہیں مانیں گے اور ٹوپیاں اور پگڑیاں نہیں اُتاریں گے"

دوسرے دن جیل کے افسران آئے۔ ایک ایک آدمی کو دفتر لے جانے لگے۔ اور وہاں ان کی ٹوپیاں اور پگڑیاں سر سے ہٹانے لگے۔ اس طرح ہم سب کی جب ٹوپیاں اور پگڑیاں سروں سے اُتروا لی گئیں تو ہم نے فیصلہ کیا کہ یہ باقی

کے کپڑے بھی ہم نہیں پہنتے۔ ہم چاہے ہندو تھے یا مسلمان، یا کہ سکھ تھے سب نے اپنے اپنے کپڑے اتار دیئے اور ننگے ہو گئے اور لنگوٹیاں کس لیں۔ اس موقع پر میں نے ان کے خدمت میں یہ عرض کی کہ یہ ٹوپی اور پگڑی کا قضیہ ہمارے صوبے میں نہیں ہے اور اس کا کوئی خاص اثر ہمارے لوگوں پر نہیں پڑتا ہے۔ اس لئے آپ لوگ اگر کہیں تو آپ لوگوں کی خاطر میں بھی اس تحریک میں شامل ہوتا ہوں۔ لیکن انہوں نے مجھے اس کی اجازت نہیں دی اور کہہ دیا کہ "یہ ہمارا پنجاب کا معاملہ ہے۔ اور یہ تحریک ہم پنجابی ہی چلائیں گے۔"

کچھ دنوں کے بعد ڈیرہ غازی خان کا ڈپٹی کمشنر جیل خانے میں آیا اُس کا نام ولسن تھا۔ ہم سب کی طرف سے اس کے ساتھ سردار کھڑک سنگھ نے گفت وشنید کی۔ سردار صاحب نے اسے کہا کہ "یہ ہمارا حق ہے۔ جب انگریز حکومت نے ہمیں اپنی مرضی کے مطابق کپڑے پہننے کا حق دیا ہے تو پھر یہ ہماری مرضی پر منحصر ہے کہ جس قسم کے کپڑے چاہیں پہن لیں۔"

ڈپٹی کمشنر نے کہا: "تمہیں پگڑی اور ٹوپی کا حق نہیں ہے۔"

سردار صاحب نے پوچھا: "کیوں؟ کیا یہ پگڑیاں کپڑوں کی تعریف میں نہیں آتیں؟"

ڈپٹی کمشنر نے جواب دیا: "نہیں۔"

اس گفت وشنید میں آہستہ آہستہ تلخی سی پیدا ہو گئی تو اچانک سکھوں نے نعرہ لگا دیا: "جو بولے سو نہال، ست سری اکال۔"

اس نعرے سے فضا کانپ اٹھی۔ ڈپٹی کمشنر پر ایسی دہشت طاری ہوئی کہ وہ سر پر پاؤں رکھ کر دفتر کی طرف بھاگا اور دفتر میں جا کر یہ حکم تحریر کر دیا کہ اس بات کے لئے انہیں سزا دی جائے۔

دوسرے دن سپرنٹنڈنٹ آیا اور اُس نے ہمیں یہ حکم سُنایا "تم لوگ کپڑے پہن لو۔ اگر کپڑے نہیں پہنو گے تو کل تمہیں جیل خانے کے آئین کے مطابق مقدمے میں ماخوذ کیا جائے گا"

سب مسلمانوں نے ماسوائے مولوی محمد اسمٰعیل غزنوی اپنے اپنے کپڑے پہن لئے۔ ہندوؤں اور سکھوں نے نہ پہنے۔ تب جیل خانے میں ایک مجسٹریٹ آگیا۔ اور اس نے ان سب کو نو نو مہینے مزید قید کی سزا دے دی۔

میں سی کلاس میں تھا اور سی کلاس قیدیوں کو تین ماہ بعد ایک ہی خط لکھنے کی اجازت ہوا کرتی تھی۔ اسی طرح تین مہینے بعد اس کے نام جیل خانے میں جو خط آتا تھا وہ اسے دیا جاتا تھا۔ ایسی حالت میں میں اپنے علاقے کے حالات سے بہت کم باخبر ہوتا تھا۔ اسی طرح تین ماہ کے بعد ایک قیدی کی اپنے لواحقین سے ملاقات ہوا کرتی تھی۔ ان حالات میں جو بھی میری ملاقات کو آتا تو وہ مجھے اپنے صوبے کے حالات سُنا جاتا۔ ہماری جماعت نے اپنے علاقے میں زور شور سے کام شروع کر رکھا تھا۔ ان دنوں جلسوں کا زیادہ رواج نہیں تھا اور حکومت بھی کسی کو جلسوں میں نہیں جانے دیتی تھی۔ لوگ بھی ڈرتے تھے۔ ان حالات میں ہمارے ساتھی مسجدوں میں مجالس ہائے مولود شریف منعقد کرتے تھے اور انہی مجالس میں ہمارے کارکن تقریریں کیا کرتے تھے۔ اور اس میں زیادہ تر حصہ لینے والے ہمارے اسکول کے طلباء ہوا کرتے تھے۔ اُس وقت غنی کی عمر نو سال تھی۔ ولی بہت اچھی قرارت کرتا تھا اور وہ ایک بڑا اچھا قاری تھا۔ غنی ایک بہت اچھا مقرر تھا اور بڑی شاندار تقریر کیا کرتا تھا۔ وہ اپنی تقریر کے آخر میں لوگوں سے یہ کہا کرتا تھا کہ "اے لوگو! آپ لوگ ذرا اس حکومت سے یہ تو پوچھیں کہ میرے باپ کو اس نے کس لئے قید کر رکھا ہے، آخر اُن کا گناہ کیا ہے اور انہوں نے کیا جرم کیا ہے؟"

ہمارے لوگوں پر ان باتوں کا بڑا اثر پڑتا تھا، لہٰذا وہ بڑے متاثر ہوئے اور ملک میں ایک نئی زندگی پیدا ہو گئی۔ مختصر یہ کہ میری قید سے میری قوم کو بڑا فائدہ پہنچا۔ ایک تو ان میں تعلیم کا شوق پیدا ہو گیا اور دوسرا ان کے اندر سیاسی شعور آ گیا۔ میری قید کی وجہ سے ہمارے اسکول سے لوگوں کی بڑی ہمدردی اور محبت پیدا ہو گئی اور وہ اسکول کے لئے امداد بھی مہیا کرتے۔

میری والدہ صاحبہ میرے لئے بہت غمگین اور اُداس رہتی تھیں اور جیل کے قواعد کے مطابق مجھے جب خط لکھنے کا موقع میسر آتا تو میں اپنی والدہ صاحبہ ہی کو خط لکھا کرتا تھا۔ میری والدہ صاحبہ کی ہمیشہ یہ خواہش رہی کہ وہ میری ملاقات کے لئے آتیں، لیکن وہ ضعیف العمر تھیں اور ڈیرہ غازی خان ایک بہت دور افتادہ جگہ تھی اس کے علاوہ بیچ میں دریائے سندھ پڑتا تھا۔ وہ اس قدر تکلیف دہ سفر تھا جو اُن کے لئے قابلِ برداشت نہیں تھا، اس لئے میں ہمیشہ اپنی ملاقات کے لئے آنے سے منع کر دیا کرتا تھا۔ لیکن مجھے کیا خبر تھی کہ انہیں خداوندِ پاک مجھ سے ہمیشہ کے لئے جُدا کر دے گا۔ ۱۹۲۴ء کے آخر میں وہ بیمار ہوئیں اور کچھ ہی دن کے بعد رحلت فرما گئیں۔ مجھے کسی نے بھی ان کی بیماری کی یا وفات کی اطلاع تک نہ دی۔ اور مجھ سے یہ خبر چھپائی گئی لیکن مجھے اخبارات کے ذریعے علم ہو گیا اور میں بہت دُکھی ہوا۔ جب میں رہا ہو کر اپنے گاؤں میں آیا تو میری بہن نے مجھے بتایا کہ آخری سانس لیتے وقت ماں نے مجھے بہت یاد کیا۔ بہت یاد کیا۔ وہ حالتِ نزع میں کہہ رہی تھیں "غفارا کدھر گیا ہے۔ وہ آیا ہے یا کہ نہیں آیا ہے؟" بس میرا ہی نام ان کی زبان پر تھا کہ انہوں نے دم توڑ دیا۔

ڈیرہ غازی خان کے قیدیوں میں سب سے لمبی قید میری تھی۔ میری قید تین سال تھی۔ اور دوسرے قیدیوں میں کوئی چھ مہینے، کوئی نو مہینے اور زیادہ سے زیادہ

سال بھر کے لئے قید تھا۔ چھ مہینے تک اکثر سزا یافتہ قیدی ہمارے دیکھتے دیکھتے رہا ہو چکے تھے اور یہ لوگ اس سے بھی پہلے رہا ہو جاتے اگر جیل خانے میں کپڑوں کی اچکن نہ کی ہوتی اور ان کی قید کا عرصہ بڑھایا نہ ہوتا۔ جب ان کی نو مہینے کی قید پوری ہوگئی تو سپرنٹنڈنٹ پھر آیا اور اُن سے کہنے لگا کہ اب بھی کپڑے پہن لو ورنہ پھر ایک اور مقدمہ تمہارے خلاف چلایا جائے گا۔ اس پر ہندوؤں اور مسلمانوں نے تو کپڑے پہن لئے لیکن سکھوں نے پھر نہیں پہنے۔ لہٰذا انہیں نو نو مہینے کی مزید قید کی سزائیں دی گئیں۔ جن اصحاب نے کپڑے پہن لئے تھے انہوں نے سپرنٹنڈنٹ سے کہا کہ انہیں اس جیل خانے سے منتقل کر دیا جائے۔ انہیں اس جیل خانے سے کہیں اور بھیج دیا گیا۔ جب نو مہینے پورے ہوگئے اور سکھ سمجھ گئے کہ جیل خانے والے پھر ہمارے خلاف مقدمہ چلانا چاہتے ہیں تو ان میں بھی کمزوری پیدا ہوگئی اور انہوں نے بھی کوشش کی کہ وہ اس جیل خانے سے اپنے آپ کو منتقل کروا لیں۔ انہیں بھی دوسرے جیل میں منتقل کر دیا گیا۔

اب اس سارے جیل خانے میں بس صرف میں اور سردار کھڑک سنگھ دو ہی قیدی رہ گئے۔ کھڑک سنگھ بڑا زبردست انسان تھا اور پہاڑ کی طرح اپنے عزم پر ڈٹا ہوا تھا۔ کوئی اُسے ہلا نہیں سکتا تھا۔ اس دوران میں جرنیل پھر دورے پر آیا اور جونہی وہ ہمارے بارک میں پہنچا تو وہ بڑے تکبر اور غرور سے بھرپور تھا۔ اس نے سردار صاحب سے کہا "ویل کھڑک سنگھ"

سردار کھڑک سنگھ نے جواب دیا "یس واڈ"

یہ سُن کر انگریز جل بھن گیا۔ جب وہ چلا گیا تو حکم دے گیا "کھڑک سنگھ کو چکی میں بند کر دو اور کمزوری کے پیش نظر ڈاکٹر نے جو دودھ اس کے لئے مقرر کر رکھا ہے وہ بھی اُسے دینا بند کر دیا جائے"

جیل کے حکام سردار صاحب کو وہاں سے لے گئے۔ ہسپتال میں ایک چکی تھی،

اس میں انہیں بند کر دیا گیا۔ میں اکیلا ہی بارک میں رہ گیا۔ ہسپتال میری بارک سے ملحق تھا۔ اور وہاں دروازے میں ایک سوراخ تھا۔ میری اور سردار صاحب کی ملاقات کبھی نہ کبھی اسی سوراخ میں سے ہو جایا کرتی تھی۔ سردار صاحب بہت کمزور ہو گئے تھے میں انہیں اسی سوراخ میں سے کبھی کبھی کھانے کی چیزیں دے دیتا لیکن وہ ایک عظیم انسان تھا۔ باوجود اس قدر مصائب اور تکالیف کے اس کے عزم اور غیرت میں کسی قسم کی کمزوری نہیں آئی تھی۔

جیل کے افسران نے حکام بالا کو رپورٹ کر دی کہ میں نے جیل کی ایک بڑی بارک گھیر رکھی ہے اور چونکہ اس جیل خانے میں قیدیوں کی تعداد بڑھ گئی ہے اس لئے انہیں بارک کی ضرورت ہے لہٰذا مجھے اس جگہ سے کسی دوسری جیل میں منتقل کر دیا جائے۔

اس جیل خانے میں صرف دو بارکیں تھیں۔ ایک میں میں قید تھا اور چھوٹی بارک اُن کے پاس تھی۔ مطلب یہ کہ قیدیوں کی تعداد کے مقابلے میں جگہ کم تھی، اس لئے مجھے میانوالی کے جیل خانے میں منتقل کر دیا گیا۔ میانوالی کا جیل بھی چھوٹا سا ہے۔ اس میں بارکیں نہیں ہیں۔ سب چکیاں (قیدِ تنہائی کی کوٹھریاں) ہیں۔ یہاں بھی کافی سیاسی قیدی تھے۔ کانگریس والے بھی تھے اور خلافت والے بھی اور گورو کے باغ کے قیدی بھی تھے لیکن یہ قیدی ڈیرہ غازی خان کے قیدیوں میں سے یہاں منتقل کئے گئے تھے اور ان کے جیل والوں سے اچھے تعلقات تھے۔ اس جگہ ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں کے علیحدہ علیحدہ لنگر تھے۔ ہمارے لنگر کے انچارج مولانا اقبال تھے۔ یہ حضرت پانی پت کے رہنے والے تھے اور خلافت تحریک میں پانچ سال سے قید تھے۔ کھانا پکانے میں بڑے ماہر تھے لیکن ہانڈی میں مرچ بہت زیادہ ڈالتے تھے اور اس سے میرے لئے ایک بہت بڑی مصیبت پیدا کر دیتے تھے۔ مولانا ظفر علی خان کا لڑکا اختر علی خان بھی ہمارے ساتھ تھا۔ اس جگہ کا داروغہ بھی ایک عجیب انسان تھا۔ میانوالی میں سخت گرمی پڑتی ہے اور وہاں ریت

بھی اُڑتی رہتی ہے۔ جیل خانے میں ایک کنواں تھا۔ اس کا پانی بہت ٹھنڈا تھا۔ داروغہ صاحب سیاسی قیدیوں کو نہلانے کے لئے وہاں لے جایا کرتا تھا۔ مجھے بھی وہ بہت کہا کرتا تھا لیکن میں نہیں جاتا تھا اور شام کو جب گنتی بند کی جاتی تھی تو جیل خانے کے درمیان ایک بُرج تھا جس کے چاروں طرف بیٹھنے کی اچھی جگہ تھی۔ داروغہ صاحب وہاں بیٹھا کرتا تھا اور ہمارے سیاسی قیدی بھی وہاں جاکر بیٹھتے تھے۔ اس جگہ کے لئے مجھے بھی کہا جاتا تھا لیکن میں وہاں نہیں جاتا تھا کیونکہ ان جیل کے افسروں کی ساری زندگی اگرچہ قیدیوں کے ساتھ گزری ہوتی ہے لیکن افسر آخر افسر اور قیدی آخر قیدی ہی ہوتا ہے۔ علاوہ ازیں ان افسروں کے مزاج بڑے عجیب قسم کے ہوتے ہیں۔

ایک دن اختر علی خاں اور کچھ دیگر سیاسی قیدی داروغہ صاحب کے ساتھ اس جگہ پر بیٹھے ہوئے تھے۔ اس اثنا میں جیل خانے کا ڈاکٹر آ پہنچا۔ وہاں جتنی کرسیاں تھیں وہ سب سیاسی قیدیوں نے گھیری ہوئی تھیں۔ ڈاکٹر کو دیکھ کر وہ سیاسی قیدی نہ تو اس کی تعظیم کے لئے کھڑے ہوئے اور نہ ہی اس کے لئے کوئی کرسی خالی کی۔ اس پر داروغہ نے اُن کی بہت بے عزتی کی اور اُن سے کرسیاں خالی کرائیں اور انہیں وہاں سے چلتا کیا۔ سیاسی قیدیوں کی اس بے عزتی سے میرے دل کو بہت رنج پہنچا تھا لیکن مجھے ایسا لگا کہ ان سیاسی قیدیوں نے خود کوئی پرواہ نہیں کی تھی کیونکہ دوسرے ہی دن میں نے دیکھا کہ وہ پھر دروازے کے ساتھ کھڑے ہیں اور سپاہی سے کہہ رہے ہیں کہ وہ داروغہ صاحب سے اُن کے لئے وہاں جانے کی اجازت مانگے۔

۱۹۲۳ء میں میری قید کی میعاد ختم ہونے میں چند ایک دن رہ گئے تھے کہ داروغہ صاحب نے آکر مجھے اطلاع دی کہ مجھے پشاور منتقل کر دینے کے احکام جاری ہوگئے ہیں اور مجھے لینے کے لئے پولیس آگئی ہے۔ اور دروازے میں بیٹھی ہوئی ہے۔ داروغہ کے کہنے پر میں نے اپنا سامان اُٹھایا اور دروازے کی طرف چلا گیا۔ وہاں

سے جیل کے ملازمین مجھے اسٹیشن پر لے گئے اور سفر شروع ہوا۔ جب گاڑی خیرآباد پہنچی تو مجھے گاڑی سے اتار دیا گیا اور پشاور کی پولیس کے حوالے کر دیا گیا۔ پشاور کی پولیس نے مجھے موٹر میں بٹھایا۔ موٹر جو روانہ ہوئی تو مردان کے اس طرف پنچر ہو گئی۔ پولیس پر بڑی ہیبت چھا گئی۔ اس نے موٹر چھوڑ دی۔ ایک تانگہ پکڑ لیا اور مجھے چارسدہ لے آئے اور وہاں کے اسسٹنٹ کمشنر کے سامنے مجھے پیش کر دیا۔ اس وقت چارسدہ کا اسسٹنٹ کمشنر دلاور خان تھا۔ اس نے پولیس کو حکم دیا کہ وہ مجھے جائے اور میرے گاؤں میں پہنچا کر رہا کر دے۔

اس حکم کے مطابق پولیس مجھے میرے گاؤں میں لے آئی اور ہمارے مدرسے کے قریب چھوڑ کر چلی گئی۔ لڑکوں کی چھٹی کا وقت تھا۔ انہوں نے جونہی مجھے دیکھا تو دوڑ کر سب میرے پاس آ گئے اور میرے اردگرد جمع ہو گئے۔ لیکن میرے گاؤں میں آج کے دن میری رہائی متوقع نہیں تھی کیونکہ اصل میں سرکار نے چند دن پہلے ہی اس ڈرامائی انداز میں مجھے رہا کر دیا تھا۔ اس کی ایک خاص وجہ یہ تھی کہ ہمارے گاؤں کے لوگوں نے فیصلہ کر رکھا تھا کہ میں جب مقررہ دن پر رہا کیا جاؤں گا تو وہ میرے استقبال کے لئے اٹک جائیں گے اور اس جگہ سے مجھے جلوس کی شکل میں اپنے گاؤں میں لے آئیں گے۔ اس کے لئے انہوں نے گھوڑوں کا بڑا بھاری انتظام کیا تھا، لیکن حکومت اس بات کو پسند نہیں کرتی تھی، کیونکہ اس سے ہمارا بہت بڑا پروپیگنڈا ہو جاتا لہٰذا حکومت نے مجھے چند روز قبل ہی رہا کر دیا اور چپکے سے میرے گاؤں میں لا کر مجھے چھوڑ دیا گیا۔

تین سال کے بعد میں جیل خانے سے رہا ہوا تھا۔ ان تین سالوں میں ہماری قوم بہت آگے بڑھ چکی تھی۔ ہمارے مدرسے نے اچھی ترقی کر لی تھی۔ اس کامیابی کا تمام سہرا ہمارے اسکول کے لڑکوں اور استادوں کے سر پر تھا۔ انہوں نے میرے قید ہو جانے کے بعد ملک میں بڑا کام کیا تھا۔ گویا میری قید کا صحیح فائدہ اٹھایا تھا۔ یہ سب ان لوگوں کی

محنت کی برکت تھی۔

ہمارے اسکول کا سالانہ جلسہ قریب تھا اور میرے آجانے کے باعث انہوں نے تاریخیں قدرے آگے ڈال دیں۔ خیر جلسہ بڑے اہتمام سے ہوا۔ اس میں ہزاروں لوگ شامل ہوئے اور لوگوں میں بہت پریم پیار اور جوش و خروش تھا۔ جلسے میں کافی تقریریں ہوئیں اور نظمیں بھی پڑھی گئیں۔ اس موقع پر قوم کی طرف سے مجھے ایک تمغہ عطا کیا گیا اور "فخرِ افغان" کے لقب سے میری عزت افزائی کی گئی۔ میں نے اس جلسے میں ایک مختصر سی تقریر کی اور اپنی قوم کو میں نے شیر کے ایک بچے کا یہ قصہ سنایا۔

"ایک شیرنی تھی۔ اُس نے بھیڑوں کے ریوڑ پر حملہ کر دیا۔ وہ حاملہ تھی۔ حملے کے دوران اس کے بچہ پیدا ہوا۔ وہ خود مر گئی اور اس کا یہ بچہ ایک بھیڑ نے اپنے پیچھے لگا لیا۔ شیر کا یہ بچہ اُنہی بھیڑوں کے ریوڑ میں پلا اور بڑا ہوا۔ اُس نے بھیڑوں کی عادتیں اور خصلتیں سیکھ لیں۔ وہ بھیڑوں کے ساتھ ہی گھومتا پھرتا اور چرتا رہتا۔ ایک دن ایک شیر اُدھر آنکلا اور اس نے ان بھیڑوں پر حملہ کر دیا۔ حملے کے وقت شیر نے دیکھا کہ ان بھیڑوں میں شیر کا ایک بچہ بھی ہے اور وہ بھی اُس سے ڈر کر بھیڑوں کے ساتھ بھاگا جا رہا ہے اور بھیڑوں کی مانند بائیں بائیں کر رہا ہے۔ حملہ آور شیر کو یہ بات بہت عجیب نظر آئی کہ کہاں شیر کا بچہ اور کہاں یہ بائیں بائیں اور بھیڑ کا سا ڈرپوک پن۔ وہ شیر کے بچے کے قریب آیا اور اس نے شیر کے بچے کو بھیڑوں سے علیحدہ کر لیا۔ پھر اُسے ایک تالاب پر لے گیا تاکہ وہ پانی کے اندر اپنا منہ دیکھے اور اُسے معلوم ہو جائے کہ وہ بھیڑ نہیں بلکہ شیر ہے۔ شیر کے بچے نے جب پانی میں اپنا عکس دیکھا تو اس سے حملہ آور شیر نے کہا "ارے کیا دیکھتا ہے، تو بھیڑ نہیں شیر ہے شیر، بیں بیں مت کر، شیر کی طرح دھاڑ" پھر کیا تھا اُس شیر کے بچے کی غلط فہمی دور ہو گئی اور وہ زور زور سے دھاڑنے لگا۔ جنگل کانپ اُٹھا۔ اور بھیڑوں کے ریوڑ تو کیا دیگر بڑے بڑے جانوروں میں بھی بھگدڑ مچ گئی۔

یہ قصہ سنا کر میں نے گرج کر کہا "اے پختونو! میں بھی تمہیں یہی کہتا ہوں کہ تم بھیڑیں نہیں ہو، تم شیر ہو شیر۔ غلامی میں پھنسنے کی وجہ سے تم اپنی حقیقی طاقت کو بھول گئے ہو۔ اپنے آپ کو پہچانو، بیں بیں مت کرو اور شیروں کی طرح گرجو" میری اس تقریر سے حکومت بہت سٹپٹائی، مگر میری قوم بہت مسرور ہوئی اور سامعین پر اس کا جادو کی طرح اثر ہوا۔ جلسہ برخاست ہو گیا لیکن میری تقریر ہمیشہ لوگوں کے کانوں میں گونجتی رہی۔

(۱۲)

مئی ۱۹۲۶ء میں میری بڑی بہن حج کو جا رہی تھی۔ اس نے مجھے بھی مجبور کیا کہ میں بھی اس کے ہمراہ حج کو جاؤں۔ چنانچہ میں اور میری بیوی دونوں اس کے ساتھ حج کے لئے روانہ ہوئے۔ کراچی سے آگے ہم نے سمندری جہاز سے سفر شروع کیا۔ ہم نے بڑی کوشش کی لیکن ہمیں فرسٹ یا سیکنڈ کلاس کے ٹکٹ نہ مل سکے، کیونکہ وہ سب لوگوں نے پہلے سے ہی لے لئے تھے گرمی کا موسم تھا اور تھرڈ کلاس میں بھی بے شمار حاجی سوار تھے۔ جب جہاز کراچی سے دور نکل گیا تو ہمیں قے آنی شروع ہو گئی اور کامران تک ہم لوگ کوئی چیز بھی زبان پر نہ رکھ سکے۔ کامران میں جب جہاز ٹھہرا اور ہم جہاز سے نیچے اترے تو قدرے کھانے پینے کو جی چاہا اور ہم نے کھایا پیا۔ رات ہم نے وہاں گزاری اور دوسرے دن جہاز آگے روانہ ہوا۔ اب مجھے انفلوئنزہ ہو گیا۔ خدا ایک عرب باشندے کا بھلا کرے کہ وہ مجھے اپنی سیکنڈ کلاس میں لے گیا اور مجھے اپنی ہی جگہ پر سلا دیا۔ اس نے میری بڑی حفاظت کی۔ جب ہم جدہ پہنچ کر جہاز سے نیچے اترے تو اس وقت تک میں ویسا ہی بیمار تھا۔ معلم ہمیں اپنی جگہ پر لے آیا۔ ہمارے ساتھ سامان بہت زیادہ تھا۔ معلم کی بے پروائی سے جہاز میں رہ گیا اور گم ہو گیا۔ یا اس نے ہی چرا لیا۔

جدے سے دوسرے دن ہم مکے چلے گئے۔ گرمی کا موسم تھا۔ اور مکے میں بہت سخت گرمی پڑ رہی تھی اور ہمارے لئے یہ بات سخت مصیبت کا باعث تھی کہ دن بڑا

سخت گرم ہوتا اور رات کے وقت کافی ٹھنڈک ہو جاتی تھی۔ اس سے بے چارے حاجی بہت بری طرح بیمار پڑ جاتے تھے اور اکثر مرتے رہتے تھے۔ اس سال سعودیوں نے مکہ پر قبضہ کر لیا تھا اور شریفِ مکہ کو بھگا دیا تھا۔ سعودیوں نے عنانِ حکومت کو خوب اچھی طرح سنبھالا اور ہر طرح امن و امان قائم کر دیا۔ حاجی بتاتے تھے کہ جس وقت شریفِ مکہ کی حکومت تھی اس وقت ملک میں بڑی بدامنی تھی۔ حاجیوں کے قافلے لوٹ لئے جاتے تھے اور اس لوٹ میں شریفِ مکہ خود لیٹروں کے ساتھ حصہ دار ہوا کرتا تھا۔ اس سال سعودیوں نے محمد علی، شوکت علی اور ظفر علی خاں وغیرہ اور ہندوستان کے دوسرے بہت سے لیڈروں کو دعوت دی تھی اور ہندوستان سے بہت سے لیڈر وہاں پہنچے تھے۔ اس سال دنیا بھر کے مسلمانوں کا ایک موتمر بھی ہوا تھا اور میں اس میں بھی شامل ہوا تھا، لیکن اس سے کوئی خاص فائدہ مرتب نہیں ہوا تھا۔ تمام بحث و مباحثہ تقریروں اور جھگڑوں تک ہی محدود تھا۔ بلکہ اس موتمر نے لوگوں میں اور زیادہ اختلافات پیدا کر دیئے تھے۔

ہم حج سے فارغ ہو گئے۔ میری بہن مدینے چلی گئی اور وہاں سے اپنے وطن کو لوٹ گئی، لیکن میری طبیعت اسی طرح علیل تھی۔ چنانچہ میں اور میری بیوی طائف چلے گئے۔ طائف حجاز میں ایک خوشگوار اور سرد مقام ہے۔ طائف کے تمام بنگلے جو ترکوں نے بنائے تھے وہ ویران پڑے تھے۔ ہمارا نصیب اچھا تھا۔ کیونکہ جب ہم طائف جا رہے تھے تو راستے میں ایک پٹھان ہمارا ہم سفر ہو گیا۔ اس کا گھر طائف میں ہی تھا۔ ہم اس کے ساتھ چلے گئے۔ اسے اور اس کی اہلیہ کو تو پشتو آتی تھی لیکن اس کے بچوں کو پشتو نہیں آتی تھی۔ اس کا گھر بہت خوبصورت تھا۔ ہم نے اس کے ساتھ کچھ دن بڑے آرام اور خوشی سے گزارے اور بعد میں واپس مکہ آ گئے۔

طائف میں ایک واقعہ جو مجھے درپیش آیا قابلِ ذکر ہے۔ ایک دن میں شہر

سے باہر نکلا ہی تھا کہ کیا دیکھتا ہوں کہ ایک آدمی جو دراز ریش ہے اور ایک لمبا جُبّہ پہنے ہوئے ہے، مجھے آوازیں دے رہا ہے "اے شیخ! تعال تعال یعنی اِدھر آؤ۔"

میں اس کے قریب چلا گیا تو اُس نے مجھ سے کہا "یہاں رسول اللہ کی داڑھی کا ایک بال پڑا ہوا ہے اور اس کے ساتھ ایک پتھر بھی پڑا ہے جس پر کہ رسول اللہ کے پاؤں کا نشان ہے۔"

میں نے اُسے جواب دیا "میں یہاں اس کے لئے نہیں آیا ہوں بلکہ میں یہاں اس لئے آیا ہوں کہ میں اس رسول پاک کا وہ صبر اور ہمت دیکھوں کہ وہ مکّے سے ان دشت بیابانوں میں لوگوں کے بھلے کے لئے یہاں طائف میں آتے ہیں اور طائف کے لوگ انھیں پتھر ڈھیلے مارتے ہیں، ان کے پیچھے کتے لگاتے ہیں، انہیں زدوکوب کرتے ہیں، اور وہ ان سب زیادتیوں کے باوجود اپنی قوم سے مایوس نہیں ہوتے، بلکہ اس کے لئے دست بدعا ہوتے ہیں کہ "خدایا! تو میری اس قوم کو ہدایت کر کہ وہ نیکی کے راستے پر چلے۔"

میرا یہ جواب سُن کر وہ دراز ریش آدمی کچھ نہ کہہ سکا، خاموش ہوکر رہ گیا۔

مکہ پہنچ کر ہم نے کچھ دن وہاں گزارے، پھر جدّے چلے آئے۔ جدّے میں کچھ دن گزارنے کے بعد ہم لوگ مدینے چلے آئے، ہمارا سارا قافلہ چار عورتوں اور چھ مردوں پر مشتمل تھا۔ اس زمانے میں موٹریں نہیں ہوا کرتی تھیں اور سفر اونٹوں کے ذریعے ہوا کرتا تھا۔ منزل رات کو طے کی جاتی تھی۔ چاروں طرف دشت و بیابان تھے، لیکن نجدیوں کی وجہ سے وہاں ایسا امن تھا کہ میں بیان کرنے میں قاصر ہوں۔

مدینے پہنچ کر ہم نے وہاں بھی کچھ دن گزارے اور وہاں سے ہم نے

بیت المقدس جانے کا عزم کیا۔ اور ہم مدینے سے رابغ چلے گئے۔ یہ ایک چھوٹا سا بندرگاہ ہے۔ تیسرے دن جہاز آیا۔ ہم لوگ اس میں بیٹھ گئے اور سوئز کے مقام پیاس سے اُتر پڑے۔ سوئز سے ہم بذریعہ ریل گاڑی بیت المقدس پہنچ گئے۔ بیت المقدس میں میری اہلیہ سیٹر جیولؔ سے گر پڑی اور بیان بحق ہو گئی۔ وہ اپنے پیچھے دو بچے ایک لڑکا اور ایک لڑکی چھوڑ گئی۔ مجھے اُس کی جدائی کا بڑا سخت صدمہ تھا کیونکہ وہ میری رفیقۂ حیات تھی۔ اور اس کے بعد میں نے پھر شادی نہیں کی۔ حالانکہ میں جوان تھا۔ اور اس کی بڑی وجہ یہ تھی کہ میرے دل میں ملک و ملت کی خدمت کا جذبہ پیدا ہو چکا تھا اور میں شادی کے لئے تیار نہیں تھا۔ کچھ دن میں نے فلسطین میں گزار دیئے اور اُس جگہ کے مشہور مقامات دیکھے۔ پھر اس جگہ سے میں نے لبنان، شام اور عراق کی سیاحت کی۔ نجف اور کربلا کی زیارت بھی کی اور بغداد میں چند دن گزارنے کے بعد میں بصرے چلا گیا اور بصرے سے جو جہاز میں سوار ہوا تو کراچی آ گیا تھا، لیکن اس جہاز اور حاجیوں کے اُس جہاز میں بڑا فرق تھا جس پر ہم کراچی سے جدے جاتے ہوئے سوار ہوئے تھے۔ اُس میں بہت تکلیف اور اس میں بڑا آرام تھا۔ کراچی میں میں نے چند دن گزارے اور پھر وہاں سے واپس اپنے گاؤں آ گیا۔

(۱۳)

ہمارے صوبہ میں ایک بھی قومی اخبار نہیں تھا۔ میں نے ارادہ کر لیا کہ پختونوں کے لئے ان کی اپنی زبان میں ایک پشتو اخبار جاری کیا جائے جو صحیح

؎ بادشاہ خان کی پہلی بیوی جب ۱۹۱۸ء میں رحلت فرما گئیں تو اس کے بعد آپ نے پھر ۱۹۲۰ء میں شادی کی۔ اُن کی یہ وہی اہلیہ محترمہ تھیں۔

سعنوں میں قومی اخبار ہو اور قوم کی ملکیت ہو۔ اس مقصد کے لئے بڑی جدوجہد کے بعد ہی ۱۹۲۶ء میں مَیں اپنے اس عزم میں کامیاب ہوا۔ "پشتون" کے نام سے میں نے اخبار شائع کیا۔ یہ وہ زمانہ تھا کہ جب پختونوں کو اپنی زبان سے کسی قسم کا انس و محبت نہیں تھی۔ اور نہ ہی وہ یہ بات جانتے تھے کہ یہ ہماری اپنی زبان ہے۔ حالانکہ ہر ایک قوم اپنی زبان سے پہچانی جاتی ہے اور اپنی زبان سے ہی کوئی قوم، قوم ہوتی ہے۔ اپنی زبان کے بغیر کوئی بھی قوم دنیا میں ترقی نہیں کر سکتی اور جو بھی قوم اپنی زبان کو بھلا دیتی ہے وہ قوم صفحۂ ہستی سے مٹ جاتی ہے۔ افسوس کی بات ہے کہ پختون ایک ایسا بے پروا اور غافل انسان ہے کہ وہ جہاں بھی چلا جائے اس کی اپنی زبان تو رہ جاتی ہے اور دوسروں کی زبان سیکھ لیتا ہے۔ اس نے کہیں بھی ایسا نہیں کیا کہ دوسروں کو اپنی زبان سکھائی ہو۔ پختونوں کو اپنی زبان کے لکھنے پڑھنے میں دلچسپی نہیں ہے۔ ناخواندہ لوگوں کو تو رہنے دیجیے علم دانوں کو جب میں نے کہا کہ "پشتون" اخبار کے خریدار بن جاؤ اور اسے پڑھا کرو کیونکہ یہ پشتونوں کا اپنا پشتو زبان کا اخبار ہے تو آگے جواب انکی طرف سے یہ ہوتا تھا کہ پشتو میں کیا دھرا ہے اور وہ اسمیں کیا پڑھے گا اور اس سے کیا سیکھے گا۔

لہ "پشتون" اخبار کو صوبہ سرحد میں وہی اہمیت حاصل تھی جو گاندھی جی کے اخبار "ہریجن" کو سارے بھارت میں تھی۔ باچا خان اپنے خیالات اور ضروری .... اطلاعات اسی اخبار کی وساطت سے لوگوں تک پہنچاتے تھے۔ یہ اخبار قریب قریب ہر ملک کے پختونوں تک پہنچتا تھا۔ تحریک آزادی کے دنوں میں انگریزی حکومت نے اسے بند کر دیا تھا لیکن پاکستان کی اسلامی سرکار نے بھی اس کی اشاعت پر پابندی لگا دی۔ "پختون اخبار" کی مختصر سی زندگی بھی بڑی اہمیت رکھتی ہے۔

میں انہیں کہتا تھا کہ یہ تو پشتو کا قصور نہیں ہے۔ آج تم دنیا بھر کی جو زبانیں دیکھ رہے ہو یہ زبانیں بھی پہلے ہماری پشتو زبان کی طرح پچھڑی ہوئی زبانیں تھیں۔ یہ کسی آسمان سے نہیں اُتری تھیں لیکن ان میں ایسے لوگ پیدا ہوئے جنہوں نے اپنی ان زبانوں کی خدمت کی اور انہیں آسمان پر پہنچا دیا۔ اور ہم میں سے کس نے اس زبان کی خدمت اور ترقی کے لئے کوشش کی ہے؟ زبانیں تو جادو کی چھڑی یا چھو منتر سے ترقی نہیں کرتیں۔ یہ تو ہمارے انگریزی کے بڑے بڑے تعلیم یافتہ لوگوں کے خیالات تھے اور دوسری طرف ہمارے مُلّا ملانٹے تھے وہ یہ پروپیگنڈا کرتے تھے کہ پشتو دوزخیوں کی زبان ہے اور یہ دوزخ میں بولی جائے گی۔ اور قوم بے چاری اتنی ناسمجھ اور بے علم تھی کہ اس نے مُلّا صاحب سے اتنا تو پوچھا ہوتا کہ دوزخ سے کب آئے ہو اور یہ معلومات تمہیں کس طرح سے حاصل ہوئی ہیں کہ پشتو دوزخی زبان ہے؟

ایسے ہی حالات میں "پشتون" اخبار جاری ہوا اور بہت جلد پشتونوں میں ہر دلعزیز ہو گیا اور دنیا کے ہر حصے میں جہاں بھی پشتون رہتے ہیں وہ اسے منگواتے تھے۔ امریکہ میں رہنے والے پشتونوں نے تو اس اخبار کی اشاعت کو فروغ دینے میں نمایاں امداد کی اور صرف انہوں نے اس کی اشاعت بڑھانے ہی میں نہیں بلکہ اس کی مالی معاونت بہم پہنچانے میں بھی حصہ لیا۔ میں نے تو یہ بھی سُنا ہے کہ امان اللہ خان کے وقت میں افغانستان میں یہ اخبار بہت ہر دلعزیز تھا اور اس نے لوگوں میں پشتو زبان کے ساتھ اتنی محبت و پیار پیدا کیا تھا... کہ امان اللہ خان اور ان کے ساتھیوں نے بھی پشتو کا ایک اخبار افغانستان سے بھی جاری کیا تھا جس کا نام "د پشتون غږ" (صدائے پشتون) تھا۔ امان اللہ خان کا خود پشتو زبان سے اتنا شوق پیدا ہو گیا تھا کہ بقول کسے اس نے فرمان جاری

کر دیا تھا کہ تین سال کے اندر اندر ہر ایک سرکاری ملازم پشتو سیکھ لے کیونکہ تین سال کے بعد پشتو سرکاری اور قومی زبان بن جائے گی۔ انگریزوں نے اُسے ان کاموں کے کرنے کی مہلت ہی نہ دی۔ کہا جاتا ہے کہ "د پشتون ترغ" کے ابھی صرف نو پرچے ہی نکلے تھے کہ فرنگیوں نے ملّا ملانٹوں، حضرتوں اور بزرگوں وغیرہ نام نہاد مذہبی رہنماؤں اور دینی عالموں کے ذریعے افغانستان میں آگ لگا دی اور امان اللہ خان کو کافر قرار دے دیا۔ انہوں نے امان اللہ خان کو افغانستان سے باہر نکلوا کر ہی دم لیا یعنی اُسے اٹلی چلے جانا پڑا۔

اب سوچیئے پشتونوں کے اس عمل سے کیسے نقصان پہنچا؟ — خود انہی کو۔ امان اللہ خان تو اُن کی بہبودی، فائدے، اُن کی آبادی، شادابی اور ترقی کا خواہاں تھا، مگر یہ لوگ آنکھ کھڑے ہوئے اور دوست و دشمن میں تمیز نہ کر سکے اور جوش میں اپنے ہی بہی خواہ کو ملک سے نکال دیا۔ یہ ان کی بے حد ناشکر گزاری تھی اور احسان فراموشی خدا کے ہاں بڑا بھاری جرم ہے۔ اسی لئے تو ان کے سروں پر خدا نے "بچہ سقہ" مسلط کر دیا تھا۔ ان کی اور ان کے ملک کی تعمیر و ترقی کو تنزل میں بدل دیا تھا۔

افغانستان کی بربادی کو ہم لوگ اپنی تباہی تصور کرتے تھے اور انگریزوں نے افغانستان کو ہماری وجہ سے تباہ کیا کیونکہ افغانستان کی ترقی کا اثر سیدھا ہم پر پڑتا تھا اور فرنگی یہ نہیں چاہتے تھے۔ ہم سے جتنا بھی ہو سکتا تھا۔ چاہے مالی طور پر یا جانی طور پر، ہم نے اس مصیبت میں افغانستان کی امداد کی ہے اور اُس وقت تک اپنی امداد جاری رکھی جب تک کہ نادر خان کامیاب نہ ہو گیا۔

میں افغانستان کے انقلاب کے زمانے میں اس کے حق میں پروپیگنڈا کرنے اور امداد فراہم کرنے کے لئے ہندوستان گیا تھا۔ پنجاب میں مَیں نے ڈاکٹر اقبال، ظفر علی خان، ملک لال خان اور ایسے ہی دوسرے بہت سے مسلمان لیڈروں سے ملاقات کی تھی۔

لاہور میں ڈاکٹر اقبال سے ملنے پر میرے خلافت کے ساتھیوں نے میری بڑی مذمت کی تھی اور وہ مجھے کہتے تھے کہ میں نے ڈاکٹر اقبال سے کیوں ملاقات کی۔ وہ تو کسی کام کا آدمی نہیں ہے۔ وہ تو ایک شاعر ہے، رُباعیاں، غزلیں کہتا ہے۔ اس میں عمل کا مادہ نہیں ہے۔ لیکن آج میں پنجاب کے اخباروں اور لیڈروں کو دیکھتا ہوں تو حیران ہوتا ہوں کہ وہ اُسی اقبال کی تعریفیں کرتے ہوئے نہیں تھکتے اور یہ بھی کہتے ہیں کہ پاکستان کا خیال سب سے پہلے اُس کے ہی دل و دماغ میں آیا تھا۔ یہ تخیل اُسی نے پیدا کیا تھا۔ پنجاب کے مسلمانوں کا کوئی گناہ نہیں ہے۔ دنیا بھر میں یہ قاعدہ جاری ہے کہ زندہ قومیں زندوں کی قدر کرتی ہیں۔ اور مُردہ قومیں مُردوں کی قدر کرتی ہیں۔ ہم مسلمان لوگ ہمیشہ مُردوں کی قدر کرتے ہیں۔ ہمارے ہاں زندہ انسانوں کی کوئی قدر نہیں ہے۔

لاہور سے پھر میں لکھنؤ چلا گیا۔ لکھنؤ میں کانگریس کا جلسہ تھا اور اُس میں گاندھی جی اور جواہر لال بھی شریک ہوئے تھے۔ یہ ۱۹۲۸ء کا ذکر ہے میرا یہ پہلا موقع تھا کہ مجھے گاندھی جی اور جواہر لال سے ملاقات کا شرف حاصل ہوا۔ ان دونوں سے پہلے میری کوئی جان پہچان نہیں تھی۔ لیکن جواہر لال کے میرے بھائی ڈاکٹر خان صاحب سے بڑے مراسم تھے۔ کیونکہ یہ دونوں ایک ہی جگہ انگلینڈ میں رہ چکے تھے اور لندن کی یونیورسٹی میں اکٹھے پڑھے تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے مجھے ایک تعارفی خط اُن کے نام لکھ دیا تھا۔ جب جلسہ ختم ہوا تو جواہر لال جو چودھری خلیق الزمان کے مہمان تھے مجھے بھی اپنے ہمراہ اپنے میزبان کے گھر لے گئے۔ کھانا کھانے کے بعد میرے اور نہرو کے درمیان افغانستان کے بارے میں بہت باتیں ہوئیں۔

لکھنؤ سے میں پھر دہلی چلا آیا۔ جمعہ کے روز مسجد میں مولانا محمد علی سے میری ملاقات ہو گئی۔ محمد علی بہت اچھے انسان تھے اور میرے بڑے مہربان تھے لیکن اُن کے بڑے بھائی شوکت علی کوئی اچھے آدمی نہیں تھے مگر اُن کا محمد علی پر بڑا اثر تھا اہلا

وہ کبھی کبھار محمد علی کو غلط راستے پر چلا دیا کرتے تھے۔ یہی وجہ تھی کہ میں محمد علی سے ناراض تھا اور اُن سے میں نے قدرے پہلو بچایا مگر انہوں نے مجھے دیکھ ہی لیا۔ وہ خود میرے پاس چلے آئے اور مسکرا دیئے اور ہنسی خوشی میں مجھ سے کہہ دیا "ہم پٹھانوں کی کچھ پرواہ نہیں کرتے۔"

پھر کیا تھا تھوڑی نوک جھونک ہوگئی۔ میں نے ترکی بترکی جواب دیا "ہم بھی ایسے لیڈروں کی پرواہ نہیں کرتے جو لوگوں کے ورغلانے سے غلط راستے پر چلتے ہیں۔" لگے ہاتھوں میں نے یہ بھی کہہ دیا "مولانا صاحب! آپ ذرا فکر کریں، آپ جو باتیں امان اللہ خان کے بارے میں کہتے ہیں وہی تو انگریز بھی کہتے ہیں۔"

اس بات کا اُن پر گویا بہت اثر ہوا۔ انہوں نے فوراً مجھے گلے سے لگا لیا اور کہا "بھائی ہمیں حقیقت سے آگاہ کرو۔"

اس کے بعد محمد علی صاحب مجھے اپنے گھر لے گئے۔ حقیقت یہ تھی کہ امان اللہ خان جس وقت یورپ جا رہے تھے اس وقت شوکت علی صاحب نے بڑی دھوم دھام سے اُن کا استقبال کیا تھا اور انہیں ایک سپاسنامہ بھی پیش کیا تھا۔ اس سپاسنامے میں شوکت علی صاحب نے امان اللہ خان کی تعریفوں کے پُل باندھ دیئے تھے۔ میں بھی اس تقریب میں موجود تھا لیکن وداع کے بعد میں نے لوگوں کو یہ کہتے سُنا کہ شوکت علی کو جس قدر توقع تھی امان اللہ خان نے اتنے پیسے انہیں نہیں دیئے اس لئے وہ امان اللہ خان سے ناراض تھے۔

کچھ دنوں کے بعد نادر خان کی طرف سے کابل کی فتح کا تار موصول ہوا تو ہم نے بڑی خوشی منائی۔ اس خوشی میں لوگوں نے ایک جلوس ہشت نگر کے شمالی سرے اور دوسرا جلوس ہشت نگر کے نچلے سرے سے نکالا۔ یہ دونوں جلوس اتمان زئی میں ایک جگہ اکٹھے ہوگئے اور اس جگہ ایک بڑا عظیم الشان جلسہ ہوا۔ جلسے میں بے شمار قومی نظمیں پڑھی

گئیں اور تقریریں بھی ہوئیں اور میں نے بھی اس موقع پر ایک تقریر کی۔

میں نے اپنی تقریر میں پٹھانوں سے کہا کہ "دنیا میں دو ہی راستے ہیں جن پر چل کر قومیں ترقی کر سکتی ہیں۔ ایک مذہب اور دوسرا قومیت۔ آج اگر تمہیں علم حاصل نہ ہو تو آنکھیں تو موجود ہیں۔ یورپ اور امریکہ کو دیکھو، جن میں مذہب تو نہیں ہے، لیکن ان کے اندر قومیت موجود ہے یہی وجہ ہے کہ وہ آسمان تک جا پہنچے ہیں اور ہم ہیں کہ زمین پر بھی نہیں چل سکتے۔ وہ آباد ہو گئے ہیں اور ہم برباد ہیں۔ ان کی زندگی کو دیکھو اور اپنی زندگی کو بھی دیکھو۔ ہماری اس تباہی و بربادی کی بڑی وجہ یہ ہے کہ ہم میں نہ مذہب ہے اور نہ قومیت۔ دنیا میں ایک عظیم انقلاب آرہا ہے اور تم لوگوں کو اس کی خبر تک نہیں۔ میں حال میں ہندوستان گیا تھا۔ وہاں میں نے دیکھا کہ ہندوستان کی عورتوں اور مردوں دونوں نے اپنی قوم کی خدمت کے لئے کمر کس رکھی ہے اور تمہاری عورتوں کی بات تو الگ رہی یہاں مرد بھی خدمت کے لئے تیار نہیں ہیں اور تیاری کی بات تو کیا، وہ قوم اور ملک سے نا آشنا ہیں۔ انقلاب ایک سیلاب ہوتا ہے۔ اس میں فائدہ بھی ہوتا ہے اور نقصان بھی۔ اس سے قومیں آباد بھی ہوتی ہیں اور برباد بھی۔ اس سے کونسی قومیں فائدہ اُٹھا سکتی ہیں، جو جاگ رہی ہوتی ہیں، جن قوموں میں کہ بھائی چارہ، باہمی پیار اور قوم پرستی ہوتی ہے اور جن قوموں میں پریم محبت اور اتفاق ہوتا ہے۔ انقلاب ایک سیلاب ہے اور جو قومیں بیدار ہوتی ہیں وہ سیلاب کے انتظار میں تیار کھڑی رہتی ہیں اور جونہی سیلاب آتا ہے وہ سیلاب کے ساتھ ہو جاتی ہیں اور اُسے اپنی زمینوں کی طرف موڑ دیتی ہیں۔ اس سے استفادہ حاصل کر لیتی ہیں اور جو قومیں خوابیدہ ہوتی ہیں، جن میں بھائی چارہ، باہمی میل ملاپ اور قوم پروری کا فقدان ہوتا ہے، اور جو خود غرض ہوتی ہیں ان پر جب یہ سیلاب آتا ہے تو وہ قومیں بہہ جاتی ہیں۔ سیلاب ایسی قوموں کو بھی بہا لے جایا کرتا ہے اور اُن کی

زمینوں کو بھی"

اس کے بعد میں نے حاضرین سے پھر کہا: "اے پٹھانو! تم اُن ترقی یافتہ قوموں کو دیکھو، تمہارا یہ خیال ہوگا کہ یہ قومیں شاید اسی حالت میں آسمان سے اُتری تھیں، لیکن ایسی بات نہیں ہے۔ یہ بھی ہماری طرح کی قومیں ہیں۔ تو پھر انہوں نے کیونکر ایسی ترقی کرلی اور ہم کیوں پچھڑ گئے؟ یہ بات قابلِ غور ہے۔ ان کی ترقی کا راز یہ ہے کہ ان میں ایسے لوگ پیدا ہوئے جنھوں نے اپنا ذاتی عیش، اپنا آرام، اپنی ترقی اور اپنی آبادی قوم کی آبادی پر قربان کردی اس سے ان کی پوری قوم خوشحال اور بلند مرتبت ہوگئی۔ لیکن ہم میں ایسے لوگ پیدا نہیں ہوئے، اس لئے ہم پیچھے رہ گئے۔ دوسرے لوگ اس بات کو سمجھتے ہیں کہ اگر اُن کی قوم ترقی کرے گی تو وہ بھی ترقی کرینگے۔ لیکن ہم لوگوں کو اپنی اپنی ہی فکر لگی ہوئی ہے۔ ہم میں ہر شخص یہی سوچتا ہے کہ قوم کو چاہے دریا برد کردے مگر کسی طرح سے وہ خود آباد ہوجائے۔ وہ اس بات کو نہیں سمجھتا کہ اگر وہ آباد ہوگیا تو صرف ایک وہی آباد ہوا اس سے قوم تو آباد نہیں ہوتی اور اگر قوم آباد ہو جاتی ہے تو ہم سب آباد ہو جاتے ہیں۔ دوسری قوموں کی زندگی اجتماعی زندگی ہے اور ہماری زندگی انفرادی زندگی ہے اور انفرادی زندگی تو حیوانوں کی زندگی ہے۔ جانور بھی اپنے لئے گھونسلہ بناتا ہے اور مادہ بھی رکھتا ہے۔ بچے بھی پیدا کرتا ہے۔ بچوں کو پالتا اور بڑا کرتا ہے اور ہم بھی یہی کام کرتے ہیں۔ اس اعتبار سے ہم میں اور حیوان میں کیا فرق ہے؟ ہم اشرف المخلوقات کیسے بن بیٹھے ہیں؟ — اسی لئے میں اس بات پر زور دیتا ہوں کہ اگر تم پہلے ملک اور قوم کی ترقی اور خوشحالی چاہتے ہو تو اس انفرادی زندگی کی بجائے قوم کے اندر اجتماعی زندگی پیدا کرو — اس کے بغیر قومیں ترقی نہیں کرسکتیں۔

تقریر کو جاری رکھتے ہوئے میں نے کہا: "میں نے سنا ہے کہ امان اللہ خان

کہا کرتا تھا کہ "میں پشتونوں کا انقلابی بادشاہ ہوں" یہ حقیقت ہے کہ ہم پشتونوں میں تو انقلاب اُسی نے پیدا کیا ہے اور افغانستان کے انقلاب سے جتنا فائدہ پشتونوں نے اُٹھایا ہے اتنا استفادہ خود افغانستان کے لوگوں نے نہیں کیا، کیونکہ وہ سو رہے تھے اور ہم تھوڑے تھوڑے جاگ چکے تھے۔"

اس جلسہ کا لوگوں پر بہت اچھا اثر پڑا اور دوسرے دن چند نوجوان میرے پاس آئے اور انھوں نے مجھے کہا کہ وہ قوم کی خدمت اور اصلاح کے لئے ایک جماعت بنانا چاہتے ہیں اور اسی طرح ہمارے درمیان صلاح ومشورے شروع ہو گئے۔ ہماری ایک جماعت پہلے ہی موجود تھی "اصلاح الافاغنہ" ——— یہ جماعت ہمارے صوبے میں تعلیم پھیلانے کا کام کر رہی تھی۔ ہمارا خیال تھا کہ یہ جماعت تو یہی کام کرتی رہے، کیونکہ یہ کام بڑا ضروری تھا۔ لیکن ہماری قوم میں اور بہت سی سوشل کمزوریاں اور عیب ہیں۔ اور سماجی طور پر ہم بہت پس ماندہ ہیں۔ ان کمیوں کو دُور کرنے کے لئے ہمیں ایک الگ سوشل تحریک جاری کرنی چاہیئے۔ چنانچہ ہم نے "خدائی خدمتگاری" کی تحریک کی، جو ایک سوشل تحریک ہے، بنیاد رکھ دی۔ اس تحریک کا سیاست سے کچھ بھی تعلق نہیں تھا، لیکن فرنگیوں کے ظلم وتشدد نے اس کا تعلق سیاست سے بھی پیدا کر دیا۔ اور حقیقت یہ ہے کہ ہمیں کانگریس سے خود انگریزوں نے یکجا کیا ہے۔

ہم پٹھانوں میں پارٹی بازیاں، باہمی دشمنیاں، بغض وعناد، بُری رسمیں اور بُرے رواجات موجود تھے۔ ہمارے درمیان جھگڑے اور فسادات بھی چلتے تھے۔ اور جو کچھ ہم پیدا کرتے تھے تو وہ سب کچھ ہم رسم ورواج، جھگڑے فسادات اور مقدمہ بازی کی نذر کر دیتے تھے اور خود اسی طرح بھوکے پیاسے، ننگے اور بدحال رہ جاتے تھے۔ ہم نہ تو تجارت کا کام کرتے تھے اور نہ ہی زراعت کا اور نہ ان

کاموں کے لئے نہیں فرصت تھی۔ بالآخر بڑے سوچ بچار اور صلاح و مشورے کے بعد ۱۹۲۹ء میں ہم نے یہ جماعت بنائی اور اسے ہم نے "خدائی خدمتگاری" کا نام دے دیا۔ یہ نام بھی اس جماعت کا ہم نے ایک خاص غرض سے رکھا تھا کیونکہ پٹھانوں میں ہم لوگ خدا کے واسطے اپنی قوم و ملک کی خدمت کا خیال اور جذبہ پیدا کرنا چاہتے تھے۔ اور یہ اس لئے کہ پٹھانوں میں خدا کے لئے اپنی قوم و ملک کی خدمت کا جذبہ مفقود تھا۔ دوسری بات یہ تھی کہ پٹھانوں کے اندر تشدد بھرا ہوا تھا اور ان کا یہ تشدد غیروں کے لئے نہیں تھا بلکہ ان کا سارا تشدد اپنی قوم اور اپنے بھائی بندوں ہی کے خلاف تھا۔ جو بھی آدمی ان کا بہت قریبی رشتہ دار ہوتا تھا وہ ان کے تشدد کے ہاتھوں ہمیشہ آگ میں کھڑا رہتا تھا اور ان کے تشدد کی ساری آگ اپنے بھائی اور عزیزوں ہی کے اوپر برستی تھی۔ اس کے علاوہ پٹھانوں میں ایسی پارٹی بازی اور پھوٹ تھی کہ اس سے ان کا گھر برباد تھا۔ علاوہ ازیں ان کے رجعت پسندانہ رسم و رواج ان کو تباہ و برباد کر رہے تھے۔ ان میں انتقام کا جذبہ بھی غیر معمولی تھا اور ان میں اچھے اخلاق اور اچھی عادات کا بھی نقدان تھا۔

ان حالات کے پیش نظر جماعت "خدائی خدمتگاری" کا ممبر بننے کے لئے ممبر کو یہ قسم لینا اور یہ وعدہ کرنا پڑتا تھا: "میں خدائی خدمتگار ہوں اور چونکہ خدا کو خدمت کی ضرورت نہیں ہے لہٰذا خدا کی مخلوق کی خدمت ہی خدا کی خدمت ہے۔ لہٰذا میں خلقِ خدا کی خدمت بغیر کسی غرض و مطلب صرف خدا کے واسطے کروں گا۔"

خدائی خدمتگار کو دوسرا وعدہ یہ کرنا پڑتا تھا: "میں تشدد نہیں کروں گا اور نہ ہی کسی سے انتقام یا بدلہ لوں گا۔ مجھ پر کوئی چاہے کتنا ہی ظلم اور زیادتی کرے گا میں اسے معاف کر دوں گا۔" خدائی خدمتگار یہ بھی حلف اٹھاتا تھا: "میں یا بھی

پھوٹ، گروہ بندی اور دشمنی وخانہ جنگی سے دور رہوں گا اور ہر ایک پختون کو اپنا بھائی اور دوست سمجھوں گا — میں رسم و رواج چھوڑ دوں گا۔ سادہ زندگی بسر کروں گا اور نیک کام کروں گا اور برائیوں سے جان بچاؤں گا۔ اور یہ کہ میں اپنے اندر اچھے اخلاق اور اچھی عادات پیدا کروں گا۔ میں بیکاری کی زندگی نہیں بسر کروں گا۔"

علاوہ ازیں ہر ایک خدائی خدمتگار پر یہ پابندی تھی کہ چاہے وہ امیر ہے یا غریب، دن میں دو گھنٹے جسمانی مشقت سب کو کرنا پڑے گی۔

دسمبر ۱۹۲۸ء میں کلکتہ میں خلافت کانفرنس ہوئی۔ صوبہ سرحد سے ہم لوگ بھی اس میں شمولیت کے لئے گئے۔ کلکتہ میں پشاور کے اور بھی بہت سے لوگ رہتے تھے، جو میوہ جات کی تجارت کرتے تھے۔ جب خلافت کانفرنس شروع ہوئی تو ہمارے نوٹس میں یہ بات آئی کہ پنجابیوں کے محمد علی و شوکت علی سے بڑے سخت اختلافات ہیں۔

پنجابی ایک عجیب وغریب مخلوق ہیں۔ ایک مثال ملاحظہ فرمائیے۔ ایک دن "زمیندار" کے دفتر میں میں اختر علی خاں سے یہ شکایت کر رہا تھا کہ "دیکھو! میرے اور تمہارے والد کے مابین کتنے اچھے تعلقات ہیں۔ اگر پنجاب کے دوسرے اخبارات میرے خلاف غلط پروپیگنڈا کرتے ہیں تو کم از کم تمہیں تو نہیں چاہئیے کہ میرے متعلق پنجاب میں غلط فہمیاں پھیلاؤ۔"

میری یہ شکایت سن کر اختر علی خاں ہنس پڑے اور بولے "ہماری یہ فطرت ہے کہ نہ تو ہم اپنے پنجاب کے کسی لیڈر کو بخشتے ہیں، نہ ہی ہندوستان کے کسی رہنما کو نظر انداز کرتے ہیں بلکہ عادتاً سب کی پگڑی اچھالتے رہتے ہیں۔"

یہی تماشہ کلکتہ میں بھی پنجابیوں نے سبجکٹ کمیٹی کے اجلاس میں کیا۔ ایک مرتبہ

خلافت کی سبجیکٹس کمیٹی کی میٹنگ تھی اور ہم سب اسٹیج پر بیٹھے ہوئے تھے۔ ایک پنجابی لیڈر تقریر کر رہے تھے اور اپنی تقریر میں وہ محمد علی صاحب پر کچھ نکتہ چینی اور حملے کر رہے تھے۔

محمد علی صاحب میرے ساتھ ہی بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ صبر نہیں کر سکے اور غصے میں آ گئے اور اُن کے منھ سے اس پنجابی لیڈر کے خلاف ناشائستہ کلمات نکل پڑے ہمارے پاس ہی ایک طرف ایک اور پنجابی بھی بیٹھا ہوا تھا۔ اُس نے محمد علی کے مُنھ سے جونہی یہ گالی گلوچ سُنی تو وہ ایک دم اُٹھ کھڑا ہوا، چاقو نکال لیا اور جواب میں محمد علی کو گالی گلوچ دینا شروع کر دیا۔ اسٹیج پر ایک زبردست ہنگامہ بپا ہو گیا۔ یہ اچھا ہوا کہ ہم پٹھان لوگ اس رات سبجکٹس کمیٹی کے جلسے میں بہت زیادہ تعداد میں شریک تھے۔ ہم اُٹھ کھڑے ہوئے۔ جھگڑا ختم کرا دیا اور محمد علی صاحب کو اُن سے مخلصی دلادی۔ اگر ہم نہ ہوتے تو انہوں نے محمد علی کو سخت بے عزت کیا ہوتا۔

ان دنوں کلکتہ میں کانگریس کا جلسہ بھی جاری تھا اور حالات سے ایسا معلوم ہوتا تھا کہ محمد علی ہندوؤں سے ناراض ہیں، کیونکہ انہوں نے اپنے خلافت کے صدارتی خطبے میں ہندوؤں پر بڑے سخت حملے کئے تھے اور ان کے تمدن، معاشرت اور رسم و رواج پر بڑے اوچھے طریقے سے نکتہ چینی کی تھی۔ یہ چیزیں ایک لیڈر کے شایانِ شان نہیں تھیں اور ہماری کانفرنس میں کوئی خاص لُطف نہیں تھا۔ میں نے سوچا کہ چلو جا کر کانگریس کا وہ جلسہ دیکھ آئیں۔ اس وقت کانگریس کی سبجکٹس کمیٹی کا اجلاس تھا۔ میں اسے دیکھنے کے لئے چلا گیا۔

میں کانگریس کے جلسوں میں پہلے کبھی نہیں شامل ہوا تھا۔ اس وقت گاندھی جی تقریر کر رہے تھے۔ وہاں ایک نوجوان لڑکا تھا جسے لوگ راجہ کہہ کر پکارتے

تھے وہ اُن کی تقریر کے بیچ میں بار بار کھڑا ہو جاتا اور گاندھی جی پر حملے کرتا۔ گاندھی جی بالکل غصے میں نہیں آتے تھے بلکہ وہ قہقہہ لگا کر ہنس پڑتے اور پھر اپنی تقریر شروع کر دیتے۔ وہ نوجوان پھر مداخلت کرتا۔ گاندھی جی پھر ہنس دیتے۔ اس کا مجھ پر بے حد اثر ہوا۔ اور میں جب واپس اپنے کیمپ میں آیا تو میں نے یہ سرگزشت اپنے ان ساتھیوں کو سنائی اور میں نے انھیں کہا کہ دیکھ لو، یہ ہندوؤں کا لیڈر ہے۔ اُس کے اخلاق کو دیکھو اور اپنی کانفرنس کے ان لیڈروں کے اخلاق کو بھی دیکھو۔

ہمارے دل میں ایک نیا جذبہ پیدا ہوا۔ اس جذبے کے زیرِ اثر ہم کچھ پٹھان اصحاب محمد علی صاحب کے پاس گئے۔ ہم اس بارے میں اُن سے چند باتیں کرنا چاہتے تھے، کیونکہ وہ ہمارے لیڈر تھے۔ ہم نے محمد علی صاحب کے ساتھ اپنی بات چیت اس طرح شروع کی "محمد علی صاحب! آپ ہم مسلمانوں کے لیڈر ہیں۔ ہم آپ کی توقیر اور عزت چاہتے ہیں۔ ہم کل کانگریس کی سبجکٹس کمیٹی کے اجلاس میں گئے تھے۔ اس وقت گاندھی جی تقریر کر رہے تھے۔ ان کی تقریر کے درمیان ہی ایک نوجوان ان کی مخالفت اور ان پر نکتہ چینی کرتے تھے۔ یہاں تک کہ انہیں ناشائستہ الفاظ سے مخاطب کرتے تھے۔ لیکن گاندھی جی ان کے سامنے ہنس دیتے تھے اور ہم نے یہ بھی دیکھا کہ اس مداخلت اور نکتہ چینی کی وجہ سے شاید ہی اُن کی تقریر میں کسی قسم کی تیزی یا تندی پیدا ہوئی ہو۔ یہ بات ہم آپ کو اس لئے بتا رہے ہیں کہ آپ ہمارے رہنما ہیں۔ ہم آپ کی برتری کے خواہاں ہیں، اس لئے اگر آپ اپنے اندر صبر کا مادّہ پیدا کر لیں گے تو یہ بہت اچھا ہوگا۔"

محمد علی صاحب ہماری یہ باتیں سنتے ہی بہت ناراض اور غضب آلود

ہو گئے اور یوں اُٹھے :" دیکھو جنگلی پٹھان محمد علی کو سمجھانے آئے ہیں "
یہ کہتے ہی وہ اُٹھ کھڑے ہوئے اور ہمیں وہیں چھوڑ کر خود کہیں اور چلے گئے۔ ہم اُن کے اس رویّے سے بڑے مایوس اور دل میں ناراض ہوئے اس دن سے میں پھر کبھی خلافت کے ان جلسوں میں شریک نہیں ہوا اور واپس چلا آیا۔

اس کے بعد دسمبر ۱۹۲۹ء میں لاہور میں کانگریس کا اجلاس ہوا۔ اس اجلاس میں ہمارے صوبے کے بھی بہت سے لوگ شریک ہوئے۔ میں بھی شریک ہوا۔ اجلاس میں یہ بات دیکھ کر ہم پٹھان لوگوں پر زبردست اثر ہوا کہ وہاں مردوں کی بات تو رہنے دیجئے لڑکیوں نے بھی ملک و ملّت کی خدمت کے لئے کمر کس رکھی تھی۔ پشتون عورتوں سے بہت زیادہ متاثر ہوتا ہے۔ یہاں جب عورتوں کو اس قدر مستعد اور سرگرم دیکھا تو ہم پر اس بات کا اثر ہونا قدرتی امر تھا۔ ہم صوبہ سرحد سے جتنے لوگ بھی وہاں گئے تھے ایک جگہ اکٹھے ہوئے اور اپنے لوگوں کے مابین ہم نے بھی جلسہ کیا اور ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ ہمیں بھی اپنی قوم اور ملک کی خدمت کرنا چاہیئے۔ یہ جذبہ کانگریس کی یہ کانفرنس دیکھ کر ہی ہمارے اندر پیدا ہوا۔ علاوہ ازیں ہمارے نزدیک یہ امر بھی کافی اہمیت رکھتا تھا کہ کانگریس کے اجلاس میں ہندوستان کی مکمل آزادی کی قرارداد بھی منظور ہوئی تھی۔

ہم لوگ جب لاہور سے واپس اپنے گاؤں پہنچے تو ہم نے کام شروع کر دیا۔ ہم لوگ گاؤں گاؤں پھرتے تھے۔ تقریریں کرتے تھے، جرگے بناتے تھے۔ خدمتِ خلق کے لئے "خدائی خدمتگار" بھرتی کرتے تھے۔ ہماری یہ تحریک بہت جلد سارے صوبے میں پھیل گئی بلکہ ہمارے قبائل میں بھی جا پہنچی اور وہاں بڑی ہر دلعزیز ہو گئی

کہ جس گاؤں میں بھی ہم جاتے تھے وہاں جرگہ اور خدائی خدمتگار جماعتیں قائم ہو جاتی تھیں۔ اس کے علاوہ ہماری اس تحریک نے سب سے بڑی بات یہ پیدا کر دی کہ لوگوں کے دلوں سے انگریز حکومت کا خوف اور دہشت کا نقش مٹ گیا اور ان کے اندر حریت کا ایک زبردست جذبہ موجزن ہو گیا۔ جب ہم دورے پر نکلتے تھے تو پولیس اور سی۔آئی۔ڈی کے علاوہ کبھی کبھی خود فرنگی بھی ہمارے ان جلسوں کو دیکھنے آیا کرتے تھے اور وہ بھی حیران ہوتے تھے کہ یہ اتنا عظیم انقلاب کس چیز نے پیدا کر دیا ہے۔ وہ لوگ مجھ سے بھی کبھی کبھار پوچھا کرتے تھے کہ یہ تم نے پٹھانوں پر کیا جادو کر دیا ہے؟ دراصل انہیں ایک خطرہ لاحق ہو گیا تھا۔ چند مہینوں تک تو انگریزوں نے بڑے صبر و تحمل سے ہمارے کام کو دیکھا بھالا۔ اور ہمیں لمبی مہلت دے دی۔ ادھر ان چار مہینوں میں ہم نے بھی دن رات اتنا زیادہ کام کیا کہ ہماری یہ تحریک سارے صوبے میں پھیل گئی۔ ابھی قریباً تین ماہ کام کرتے ہوئے ہم نے گزارے تھے کہ چیف کمشنر نے میرے نام حکم بھیج دیا کہ "یہ تم نے کیا سلسلہ ملک میں جاری کر رکھا ہے؟ اسے فوراً بند کر دو۔"

میں نے اس حکم کے جواب میں چیف کمشنر صاحب کو یہ لکھا کہ "یہ تو ایک سوشل تحریک ہے، سیاسی نہیں ہے اور حقیقت تو یہ ہے کہ یہ کام جو ہم کر رہے ہیں ملک کی سرکار کو کرنا چاہیئے۔ یہ کام تو حکومت کے کرنے کا ہے، آپ کے کرنے کا ہے۔ اب اگر آپ کا یا حکومت کا یہ کام ہم کر رہے ہیں تو آپ کو اس کام میں میری مدد اور تعاون کرنا چاہیئے۔"

چیف کمشنر نے مجھے کہا: "میں مانتا ہوں کہ آج یہ کام سوشل ہے اور اگر تم ان پٹھانوں کو بھی منظم کر دو تو پھر اس کی کیا دلیل اور ضمانت ہے کہ تم انہیں ہمارے خلاف استعمال نہیں کرو گے۔"

میں نے اُن سے کہا کہ قوموں کی ضمانت اعتماد پر ہوتی ہے۔ آپ ہم پر اعتماد کیجئے تو ہم آپ پر اعتماد کریں گے۔ ہم آپ کے خلاف کچھ بھی نہیں کرتے۔ ہم دیکھ رہے ہیں کہ اس ملک میں ایک انقلاب آ رہا ہے اور انقلاب تو ایک سیلاب ہوتا ہے۔ ہم صرف اتنا کرتے ہیں کہ پٹھانوں کو منظم کرتے ہیں۔ مبادا وہ اُس انقلاب میں ہم سے بہہ جائیں۔"

ہماری اِس بات کا ان پر کچھ اثر نہ ہوا لیکن انگریزوں نے ہم پر اعتماد نہ کیا۔ اور جب اپریل ۱۹۳۰ء میں اتمان زئی میں ہم خدائی خدمتگاروں کا ایک بہت بڑا جلسہ ہو چکا اور میں اس جلسے کے بعد لوٹا اور جا رہا تھا تو راستے میں نا کی تھانے کے پاس مجھے گرفتار کر لیا گیا اور واپس چارسدہ لایا گیا۔ میرے ساتھ میاں احمد شاہ جو ہمارے صدر تھے اور عبدالاکبر خان جو سکریٹری تھے اور سالار سرفراز خان وحاجی شاہنواز خان جو ہمارے جلسے کے منتظم تھے وہ سب بھی گرفتار کر لئے گئے۔

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ جب مجھے نا کی تھانے کی حدود میں گرفتار کیا گیا تو اس وقت میرے ساتھ کوئی خدائی خدمتگار رضاکار نہیں تھا۔ نا کی تھانے کے لوگوں نے جب میری گرفتاری دیکھی تو انہیں بڑا غصہ آیا اور وہ کہنے لگے کہ انگریزوں نے ہماری بے عزتی کی ہے کہ بادشاہ خان کو ہماری حدود کے اندر گرفتار کیا ہے۔ لہٰذا اپنے اس قہر اور غصے کا جواب نا کی تھانے کے لوگوں نے ایک ایسے شائستہ طریقے سے دیا کہ اس سے میں بہت خوش ہوا اور وہ یہ کہ انہوں نے خدائی خدمتگاری کا اعلان کر دیا۔ خود بھی سُرخ پوش بن گئے اور مجھے بھی انگریزوں کے سامنے، جن سے میری جنگ تھی، سُرخرو کر دیا۔

میری گرفتاری کی خبر تیزی سے عوام میں پھیل گئی۔ چارسدہ میں ہزاروں کی تعداد میں لوگ اپنے قہر اور غصے کا اظہار کرنے کے لئے جمع ہوئے۔ اسی طرح اُس دن پشاور میں بھی ہمارے ساتھی گرفتار کئے گئے تھے۔ اور ہماری ان گرفتاریوں کی وجہ سے قصہ خوانی

بازار پشاور میں ایک بہت بڑا ہنگامہ ہوا اور گولیاں برسائی گئیں جس میں بڑی بھاری تعداد میں لوگ شہید ہو گئے اور ۲۳ [۱] اپریل کا دن جس دن یہ واقعہ ہوا تھا، ایک عظیم تاریخی اہمیت سے تابندہ ہو گیا۔

چارسدہ میں بھی لوگوں نے حوالات کو چاروں طرف سے گھیر لیا تھا لیکن چونکہ ہم نے لوگوں کو عدم تشدد کا درس دیا تھا اور ڈاکٹر خان صاحب بھی موقع پر پہنچ گئے تھے۔ انہوں نے لوگوں کو سمجھا دیا اس لئے وہاں کسی قسم کا تشدد نہ ہوا۔ شام کے وقت ہمیں موٹر میں بٹھایا گیا۔ مردان سے ایک فوجی رسالا آیا تھا۔ رسالے کا کچھ حصہ ہماری موٹر کے آگے اور کچھ پیچھے تھا۔ اس طرح ہمیں مردان پہنچایا گیا۔ اسی شام کو ہمیں مردان کے جیل خانے میں بند کر دیا گیا۔ رات ہم نے جیل خانے میں گزاری اور دوسرے دن ہمیں رسالپور لے جایا گیا۔ یہاں ہمارے علاقے کا مجسٹریٹ خان بہادر قلی خان آیا ہوا تھا۔

---

[۱] قصہ خوانی بازار کا یہ خونچکاں واقعہ تاریخ جنگ آزادی میں جلی حروف میں درج ہے۔ عوام کے پُرجوش جذبات کو دبانے کیلئے جب برطانوی حکومت کی آرمڈ کاریں پشاور چھاؤنی سے شہر میں داخل ہوئیں تو ہندو سکھ اور پٹھانوں نے ایک دوسرے کے کندھے سے کندھا ملا کر ایک دیوار کھڑی کر دی۔ آرمڈ کاریں اس دیوار کو کچلتی ہوئی آگے بڑھ گئیں۔ دیوار ٹوٹ گئی کئی سرفروشانِ حریت شہید ہوئے۔ اسی اثناء میں ایک نوجوان نے آرمڈ کار کو آگ لگا دی جس سے چار گورے جل کر راکھ ہو گئے۔ پھر کیا تھا اندھا دھند گولیوں کی بوچھار ہونے لگی۔ لوگوں نے اپنے سینوں پہ گولی کھا کر جام شہادت پیا اور پھر بھی دن چوک یادگار پر گڑھوالی فوج نے گولی چلانے سے انکار کر کے اپنی حب الوطنی کا زندہ ثبوت پیش کیا۔ قصہ خوانی بازار کی شہادت اور گڑھوالی سپاہیوں کی وطن دوستی ایک نمایاں یادگار کہی جاسکتی ہے ۲۳ اپریل کے بعد ۳۱ مئی کو بھی گولی کانڈ ہوا۔ اس کی ابتدا سرگنگا سنگھ جی کے دو معصوم بچوں کی شہادت سے ہوئی پھر بچوں کی ماں زخمی ہوئی اور سردار صاحب ملازمت سے سبکدوش!

ہمیں اس کے سامنے پیش کر دیا گیا۔ اس نے ہمیں دفعہ چالیس کے تحت تین تین سال قید کی سزا دے دی اور اس جگہ سے ہم پنجاب کے گجرات جیل میں بھیج دیئے گئے۔ جب ہم جیل خانے میں پہنچے تو وہاں پشاور کے ہمارے دوسرے ساتھیوں علی گل خان تیلالا باخان وغیرہ دوسرے اصحاب کو بھی لایا جا چکا تھا۔ اس جیل خانے میں پنجاب دہلی اور صوبہ سرحد کے لیڈر سیاسی قیدی تھے۔ ان میں چاہے سکھ اور ہندو تھے یا مسلمان تھے سبھی اصحاب نہایت معقول اور سنجیدہ مزاج تھے۔ اس جیل خانے میں میں نے جس قدر مذہبی علمی اور سیاسی فائدے حاصل کئے اور جو اعلیٰ، پُر مسرت اور شاندار زندگی گزاری ویسی زندگی مجھے دوسرے کسی جیل خانے میں پھر کبھی نصیب نہیں ہوئی۔ یہاں عالموں کی جو شائستہ سوسائٹی مجھے ملی تھی ویسی سوسائٹی بھی پھر مجھے کہیں نہیں ملی۔ وہاں کی بہت سی باتیں میرے ذہن پر اتنے گہرے نقوش چھوڑ گئیں کہ تا زیست نہیں مٹیں گے۔

ڈاکٹر انصاری صاحب نے ہمارے قید خانے میں پارلیمنٹ قائم کی تھی۔ وہ کہتے تھے کہ خدا ہمیں بہت جلد حکومت دینے والا ہے اس لئے مناسب ہے کہ ہم اس کے لئے اپنے آپ کو تیار کریں۔ وہ ہمیں پارلیمنٹ سے متعلقہ کاموں کی تربیت دیا کرتے تھے۔ ڈاکٹر گوپی چند ہمیں مختلف قسم کی کتابیں منگوا دیا کرتے تھے اور روہتک کے لالہ شام لال وہ کتابیں ہمیں پڑھ کر سنایا کرتے تھے۔ ایک مائے زادہ بنسراج تھے۔ جب کبھی بھی اُن سے ملاقات ہوا کرتی تھی تو اُن کی اہلیہ صاحبہ ہمارے لئے قسم قسم کی کھانے کی چیزیں لایا کرتی تھیں۔ میں نے اور پنڈت جگت رام ہریانوی نے قرآن اور گیتا کے درس جاری کر رکھے تھے اور ہماری یہ کوشش ہوا کرتی تھی کہ ہندو قرآن سے آگاہ ہو جائیں اور مسلمان گیتا سے۔ ظفر علی خان اور ڈاکٹر کچلو کے درمیان ہمیشہ صدارت کے لئے جنگ ہوتی تھی اور دونوں ہمیشہ ہم سرحدیوں کی خوشامدیں کیا کرتے تھے کیونکہ ہم جس کسی فریق کا ساتھ دے دیتے اُسی فریق کا آدمی صدر منتخب ہو جاتا تھا۔ ایک اور

صاحب سیٹھی ہی تھے جو اکثر پکوڑے تل کر گرم گرم ہم میں تقسیم کرتے تھے۔ دیوداس گاندھی بھی چند ایک مہینوں کے لئے اسی جیل خانے میں آیا تھا۔ مفتی کفایت اللہ صاحب ماش کی دال پکایا کرتے تھے۔ وہ بڑی لذیذ ہوا کرتی تھی مگر اس میں مرچیں بہت زیادہ ہوا کرتی تھیں۔

ایک دن ہمارے ساتھ جیل خانے میں جو سکھ بھائی تھے، انھوں نے سپرنٹنڈنٹ جیل سے کہا: "گجرات شہر میں جھٹکا نہیں ہوتا ہے مگر ہم جھٹکا کھاتے ہیں، اس لئے اگر آپ ہمیں اجازت دیں تو ہم یہاں اپنے کھانے کے لئے مرغی کا جھٹکا کریں گے۔ آپ کی مہربانی ہوگی۔"

سپرنٹنڈنٹ نے انہیں جواب دیا: "دیکھو، سرحد کے مسلمان یہ بات پسند نہیں کرتے۔"

سپرنٹنڈنٹ سے یہ جواب پاکر سکھوں کے ایک رہنما میرے پاس آئے اور کہنے لگے: "سپرنٹنڈنٹ کہتا ہے کہ جھٹکے پر آپ لوگوں کو اعتراض ہے اور آپ اس بات کے مخالف ہیں۔"

میں نے سردار صاحب سے پوچھا: "سردار صاحب! یہ جھٹکا آپ لوگ کریں گے اور آپ ہی کھائیں گے؟"

سردار صاحب نے جواب دیا: "ہاں ہم ہی کریں گے اور ہم ہی کھائیں گے۔"

تب میں نے اُن سے کہا کہ: "اس پر ہمیں کوئی اعتراض نہیں ہے۔ ہماری طرف سے آپ کو اجازت ہے۔" اس کے بعد میں نے اپنے وہ ساتھی اکٹھے کئے۔ ان میں سے بیلال بادشاہ جھٹکے کے مخالف تھے۔ میں نے انہیں کہا کہ "سید صاحب! اگر کوئی شخص حلال کی مخالفت کرے تو آپ یہ باتیں کیسی محسوس کریں گے؟"

سید صاحب نے جواب دیا: "یہ تو ہمارا مذہب ہے۔ مذہب کی کوئی کیوں

مخالفت کرے گا؟

میں نے انہیں کہا "جھٹکا ان کے مذہب میں ہے۔ ہمارے لئے بھی یہ مناسب نہیں ہے کہ ہم اس کی مخالفت کریں"

میری اس دلیل سے سید صاحب قائل ہو گئے اور انہوں نے اپنی مخالفت واپس لے لی۔

ادھر ہمیں گجرات کی جیل میں بند کر دیا گیا، اُدھر ہمارے ملک میں لوگوں پر حکومت نے بڑا سخت قسم کا ظلم اور تشدد شروع کر دیا۔ ہمارے صوبے کا ایسے محاصرہ کر دیا گیا کہ صوبے کے لوگ باہر نہ جا سکیں اور وہاں کے عوام میں اپنی گریہ و زاری فریاد یا پروپیگنڈہ نہ کر سکیں اور دنیا کے لوگوں کو انگریزوں کے اُن مظالم سے آگاہ نہ کر پائیں جو پٹھانوں پر بے تحاشہ توڑے جا رہے تھے۔ علاوہ ازیں باہر کے لوگوں کو بھی ہمارے صوبے میں آنے نہیں دیا جاتا تھا تاکہ وہ ہمارا حال نہ دیکھ لیں۔ ملک کے اندر لوگوں پر آگ کے شعلے بھڑکا رکھے تھے

ان حالات میں بھی ہمارے ایک دو ساتھی میاں جعفر شاہ اور میاں عبداللہ شاہ بڑے سخت عذاب سے گزر کر اور دریائے سندھ کو عبور کر کے ہمارے پاس پہنچ گئے میری ملاقات تو بند تھی۔ یعنی مجھے کسی کے ساتھ ملنے جلنے کی اجازت نہ تھی لیکن انہوں نے ہمارے دوسرے ساتھیوں سے ملاقات کی اجازت حاصل کر لی اور انہیں صوبہ سرحد کے حالات سے آگاہ کر دیا۔ ہمارے ان ملاقاتیوں نے بتایا کہ تحریک کو چھوڑیئے، انگریز تو پٹھانوں کے بچے بچے کو کچل دینا چاہتے ہیں اور اُن کے وجود کو مٹا دینے پر اُدھار کھائے بیٹھے ہیں۔ جس وقت ہم لوگوں کو گرفتار کر لیا گیا تھا اور اپنے صوبے سے باہر پنجاب میں لا کر گجرات کے جیل میں بند کر دیا گیا تھا، اس وقت وہاں فوج پہنچ گئی تھی اور اس نے انسان زنی کو دیتے گھیرے میں لے لیا تھا۔ سب سے پہلے فوجی جوان خدائی

خدمتگاروں کے دفتر پر چڑھ گئے اور دوسری منزل سے جہاں ہمارا دفتر ہے تمام خدائی خدمتگاروں کو نیچے پکی سڑک پر پھینک دیا۔ میرا لڑکا ولی اُس وقت چودہ پندرہ سال کا تھا۔ اسکول سے چھٹی ملنے پر دفتر میں آگیا تھا اور دفتر میں وہ خدائی خدمتگاروں کے پاس بیٹھا ہوا تھا کہ ایک گورے نے اسے سنگین مارنی چاہی لیکن ایک صوبیدار نے سنگین کے آگے اپنا ہاتھ بڑھا دیا اور اُسے بچا لیا۔ اسی صوبیدار نے ولی کو ہاتھ سے پکڑ کر اور آہستہ سے نیچے اُتار دیا۔ فوجیوں نے خدائی خدمتگاروں کے دفتر میں آگ لگا دی اور اُسے جلا کر خاکستر کر دیا۔ پھر گاؤں کا رُخ کیا اور سُرخ کپڑے پہننے والے جتنے لوگ تھے وہ سب گرفتار کر لئے گئے اور اُنہیں بڑی بیدردی سے زدوکوب کیا گیا۔

اسکے بعد ڈپٹی کمشنر لوگوں سے مخاطب ہوا اور بڑے قہر اور غرور میں اس نے کہا "کیا اب بھی کوئی سُرخ پوش باقی ہے؟" ڈر کے مارے کسی شخص کو زبان کھولنے کی ہمت نہ پڑتی تھی۔ اتنے میں ہمارے گاؤں کے ایک خان محمد عباس خان جو وہاں کھڑے تھے، ڈپٹی کمشنر کی یہ بات سُن کر دوڑ کر گھر گئے۔ لال رنگ دیگ میں ڈالا اور فوراً اُس سے اپنے کپڑے رنگ لئے اور اپنے نوکروں کے کپڑے بھی رنگ دیئے اور یہ سرخ کپڑے اُنہوں نے پہن لئے۔ کپڑوں سے ابھی پانی بہہ رہا تھا کہ دوڑ کر پھر اُسی جگہ آ گئے اور فوجیوں کے سامنے کھڑے ہو گئے اور انگریز ڈپٹی کمشنر سے کہا "یہ ہیں سُرخ کپڑے، دیکھو میں نے پہن رکھے ہیں۔"

محمد عباس خان باقاعدہ خدائی خدمتگار بھی نہیں تھے اور ہم سے تھوڑا بہت ناراض بھی تھے۔ پھر بھی اُنہوں نے بڑی خودداری اور وطن پرستی کا ثبوت پیش کیا۔ فوج نے اُنہیں بھی گرفتار کر لیا۔ لیکن اُن کی اِس جراُت اور قربانی نے پٹھانوں کے اندر وہ دلیری پیدا کر دی کہ انگریزوں کے بے انتہا ظلم اور تشدد کے باوجود

سُرخ کپڑے ختم نہ ہوئے بلکہ دن بدن ان میں اضافہ ہونے لگا۔

اتمان زئی کے تاریخی جلسے کے دن صوبہ میں سُرخ پوشوں یعنی خدائی خدمتگاروں کی تعداد پانچسو تک محدود تھی۔ پھر جب ہم جیلخانوں سے رہا ہو کر اپنے علاقوں میں گئے تھے تو خدائی خدمتگاروں کی تعداد پچاس ہزار تک جا پہنچی تھی۔ ہماری اس تحریک کا حقیقت میں پروپیگنڈا انگریزوں نے خود کیا تھا۔ انگریز اپنی فوجیں لے کر دیہات میں چلے جاتے تھے، گاؤں کو اپنے گھیرے میں لے لیتے تھے لوگوں کو ان کے گھروں سے نکال لیتے تھے۔ انہیں دھوپ میں بٹھا دیتے تھے۔ اور انہیں کہتے تھے "شاباش! انگوٹھے کے نشان لگا دو کہ تم خدائی خدمتگار نہیں ہو"

لوگ کہتے رہ جاتے کہ ہم تو واقعی خدائی خدمتگار نہیں ہیں اور درحقیقت وہ خدائی خدمتگار ہوتے بھی نہیں تھے، لیکن یہ فرنگی انہیں کہتے کہ بس انگوٹھا لگا دو، لیکن وہ انگوٹھا نہیں لگاتے تھے۔ انگریزوں کے اس سلوک کا ملک بھر میں عورتوں، مردوں پر ایسا اثر ہوا کہ اگر کسی نے انگوٹھا لگایا ہوتا تھا تو عورت، مرد اسے ہتک آمیز نگاہ سے دیکھتے تھے۔ ہمارے گاؤں میں ایک آدمی نے انگوٹھا لگا دیا۔ جب وہ گھر گیا تو اس کی بیوی کپڑے دھو رہی تھی۔ کپڑے دھونے والا ڈنڈا اس کے ہاتھ میں تھا۔ اس نے اپنے خاوند سے پوچھا "تم کس طرح گھر آگئے ہو؟"

اس نے بیوی کو جواب دیا "مجھے انہوں نے چھوڑ دیا ہے"

عورت نے پھر پوچھا "اور لوگوں کو تو چھوڑا نہیں تمہیں کیسے چھوڑ دیا ہے؟ تم ذرا مجھے اپنا یہ انگوٹھا تو دکھاؤ۔ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ تم نے انگوٹھا لگا دیا ہے"

یہ کہہ کر اس عورت نے وہی کپڑے دھونے والا ڈنڈا اٹھایا اور اپنے مرد کو آگے لگا لیا اور اسے کہا "اچھا بے غیرت انسان! تم نے تو انگوٹھا لگا دیا ہے اب میں جاتی ہوں"

بیوی کی اس پھٹکار نے اس مرد کے ہوش ٹھکانے لگا دیئے۔ وہ آدمی سو قدم پر چلا گیا اور پھر دوسرے لوگوں کے ساتھ قطار میں بیٹھ گیا۔

انگریز نے اُسے پہچان کر پوچھا "ارے تم پھر کیوں آگئے ؟"

اُس نے جواب میں کہا "صاحب ! میری عورت مجھے گھر میں نہیں گھسنے دیتی"

ایک اور اسی قسم کا واقعہ ہوا۔ ہمارے گاؤں کے حاجی فضا ہنواز خاں نے جو ہمارے ساتھ جیل خانے میں قید تھے، ضمانت داخل کردی تھی اور رہا ہو گئے تھے لیکن جونہی گاؤں میں گھر پہنچے تو لوگوں کے طعن و تشنیع سے اتنے شرمندہ اور نادم ہوئے کہ اُن کے لئے زندگی بوجھ بن گئی اور انہوں نے خودکشی کر کے امان پائی۔

ہمارے جو ساتھی ہماری ملاقات کو آئے تھے، اُن کے ذریعے ہمیں اپنے صوبے کے حالات سے آگاہی ہو گئی۔ اب ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ ہمارے یہ ساتھی واپس اپنے گاؤں میں نہ جائیں، بلکہ یہ لاہور، دہلی اور شملے چلے جائیں اور ہمارے ان مسلمان بھائیوں کو جو مسلم لیگ میں ہیں، اپنے حال سے آگاہ کردیں اور انہیں کہیں کہ وہ ہماری امداد کریں اور نہیں تو کم از کم دنیا کو ہمارے حالات سے تو باخبر کردیں ہمارے ساتھی چلے گئے اور دو مہینے کے بعد واپس پھر گجرات آئے اور جیل میں ہم سے ملاقات کی۔ ملاقات کے دوران انہوں نے ہمیں بتایا کہ وہ ہندوستان بھر میں مسلم لیگ کے لیڈروں کے پیچھے بہت گھومتے پھرتے رہے لیکن مسلم لیگی لیڈر ہماری امداد کے لئے تیار نہ ہوتے۔ کیونکہ ہماری لڑائی انگریزوں سے تھی اور وہ انگریزوں کے ساتھ لوہا لینے کے ناقابل تھے۔ انہیں تو انگریزوں نے ہندوؤں سے لڑانے بھڑانے کے لئے محفوظ رکھا ہوا تھا۔

اس وقت تک ہم کانگریس میں نہیں تھے اور نہ ہی ہماری کانگریس سے کسی قسم کی جان پہچان تھی۔ ایک آدمی جو دریا میں ڈوب رہا ہو، بہا جا رہا ہو، وہ تو ہر ایک بوٹے پر ہاتھ ڈالتا ہے۔ ہم جب مسلم لیگ سے مایوس ہو گئے تو ہم نے اپنے ان ساتھیوں سے کہا کہ اب تم لوگ جاؤ اور کانگریس کے رہنماؤں سے ملو۔ اگر وہ ہماری مدد کریں تو یہ ہم پر اُن کا بڑا احسان ہوگا۔ وہ چلے گئے، کانگریسی رہنماؤں سے ملے۔ کانگریسی رہنماؤں نے ہمارے ساتھیوں سے کہا کہ اگر ہم لوگ ان کے ساتھ ہندوستان کی آزادی کی جنگ میں شریک ہونا منظور کر لیں تو وہ ہماری ہر طرح سے امداد کرنے کے لئے تیار ہیں۔

کانگریسی رہنماؤں کا یہ پیغام لے کر ہمارے ساتھی پھر آ کر ہمیں ملے اور ہمیں کانگریس کا یہ پیغام پہنچا دیا۔ اب ہم نے اپنے ساتھیوں کو ہدایت کی کہ وہ اپنے صوبے میں جائیں۔ یہ معاملہ صوبے کے خدائی خدمتگاروں کے جرگے میں پیش کریں۔ وہ چلے گئے۔ انہوں نے جرگہ بلا لیا۔ اور جرگے کے سامنے یہ سب باتیں رکھ دیں۔ اہلِ جرگہ نے کانگریس کی بات قبول کر لی اور فیصلہ کیا کہ اگر کانگریس کے رہنما ہماری مدد کرتے ہیں تو ہم بھی اُن کے ہمنوا ہیں۔ چنانچہ انہوں نے کانگریس میں شرکت کا اعلان کر دیا۔

انگریزوں کو یہ خبر ملی کہ ہم پٹھان لوگ بحیثیت مجموعی کانگریس میں شامل ہو گئے ہیں تو انہوں نے اپنی بے وقوفی محسوس کی اور ایسا ہوش ٹھکانے آیا کہ انہوں نے میرے پاس پیغام بھیجا "آؤ ہمارے ساتھ صلح کر لو، جو اصلاحات ہم نے ہندوستان کو دی ہیں فی الحال وہ تم لوگوں کو بھی دے دیتے ہیں اور آئندہ جو کچھ ہندوستان کو دیں گے نہیں اُس سے بھی زیادہ دیں گے، لیکن اس شرط پر کہ تم لوگ کانگریس کو چھوڑ دو"

انگریز کا یہ پیغام پا کر ہم نے ان سب سیاسی ساتھیوں کو، جن میں مسلمانوں کے

علاوہ ہندو اور سکھ بھی شامل تھے، جمع کیا اور میں نے اُن کے سامنے انگریز کی پیشکش کا سارا معاملہ بیان کر دیا اور ان سے پوچھا کہ اس معاملے میں ان کی کیا رائے ہے؟۔ ان میں سے اکثر لوگوں کی رائے تھی کہ اس موقع سے استفادہ کر لینا چاہیئے۔ اور ڈپلومیسی سے کام لینا چاہیئے۔ انہوں نے کہا۔ ہم یہ شرط منظور کر لیں گے۔ لیکن میں نے اُن سے کہا کہ مجھے یہ پیشکش منظور نہیں کیونکہ فرنگی بہت قابلِ اعتبار قوم نہیں ہے۔ ہم نے کانگریس سے وعدہ کر رکھا ہے۔ ہم اپنا وعدہ نہیں توڑیں گے۔ چنانچہ حکومت کو میں نے جواب دے دیا کہ چونکہ تم نے ہم پر اعتبار نہیں کیا ہے، اس لئے ہم بھی تم پر اعتماد نہیں کر سکتے ہیں۔

(۱۴)

کانگریس کے ساتھ ہمارا الحاق ہو جانے سے مرکزی اسمبلی کے اسپیکر جناب وٹھل بھائی پٹیل کی رہنمائی میں کانگریس نے صوبہ سرحد کے واقعات کی تحقیقات کے لئے ایک کمیٹی بھیجی۔ وہ کمیٹی جب اٹک کے پُل پر پہنچی تو اُسے حکومت نے وہیں روک لیا اور کمیٹی کو سرحد میں داخل ہونے کی اجازت نہ دی۔ کمیٹی کے لوگ واپس چلے گئے۔ وہ راولپنڈی جا کر بیٹھ گئے۔ اب انہوں نے وہاں سے تحقیقات شروع کر دی۔ اس نے صوبہ سرحد پر توڑے گئے مظالم کی ایک بہت طویل داستان قلم بند کر لی۔ ہندوستان بھر میں کانگریس کے اثر و رسوخ کے ماتحت جو اخبارات تھے اُن سب نے صوبہ سرحد میں توڑے گئے مظالم کی داستانیں لکھنی شروع کر دیں اور ہمارا خوب پروپیگنڈا کیا۔ اس رپورٹ کو تو انگریز حکومت نے ضبط کر لیا لیکن کانگریس نے اس رپورٹ کے نسخے بڑی بھاری تعداد میں امریکہ اور انگلستان بھیج دیئے تھے اور وہاں لوگوں میں تقسیم کرا دیئے تھے۔ قصہ خوانی بازار تنیا در کی فائرنگ کے بعد مئی کے مہینے میں مردان ضلع کے ٹکر نامی گاؤں میں خدائی خدمتگاروں پر

دوبارہ ایک اور فائرنگ ہوئی نتیجے کے طور پر بہت لوگ اس فائرنگ میں شہید ہوئے۔ حکومت نے خدائی خدمتگار رہنماؤں کے حجرے جلا دیئے۔ ان میں خان غلام محمد خان آف لوندخوڑ کا حجرہ (ویلیج کلب) بھی شامل تھا۔ اور بہت سے گھروں کو بھی جلا کر خاکستر کیا گیا ــــ اور بے شمار لوگوں کو گرفتار بھی کر لیا۔ اس کے بعد ضلع بنوں کے ہاتھی خیل وزیروں کے ایک پُرامن جلسے پر فوج نے جا کر گولیاں چلائی تھیں۔ کئی لوگوں کو شہید کر دیا تھا اور جنہیں گرفتار کیا گیا تھا انہیں چودہ چودہ سال قید کی سزا دی گئی تھی۔ اس کے بعد بنوں شہر کا محاصرہ کر دیا گیا تھا اور شہر کے دروازے بند کر دیئے گئے تھے تاکہ شہر سے کوئی شخص اپنی ضروریات حاصل کرنے کے لئے باہر نہ جانے پائے۔ بنوں شہر کے رہنے والوں کی زندگی کا انحصار بھی دیگر شہروں کے مانند دیہاتوں سے سپلائی پر تھا۔ اسی لئے ڈپٹی کمشنر نے شہریوں پر اس کے دروازے بند کر دیئے تھے تاکہ یہ لوگ بھوک پیاس سے اپنے مال مویشی سمیت مر جائیں۔ اس کا خیال تھا کہ ان حالات میں لوگ خود بخود کانگریس کی تحریک اور خدائی خدمتگاری سے باز آجائیں گے۔ ادھر دیہاتوں میں بھی لوگ ڈٹ کر بیٹھے۔

یہاں پر یہ بات خاص طور پر قابلِ ذکر ہے کہ بنوں شہر اور دیہات میں خدائی خدمتگار تحریک بڑے جوش و خروش سے چل رہی تھی۔ ملک اکبر علی خان کو خدا بخشے

لے انہی دنوں ڈیرہ اسمٰعیل خان میں بھی قومی تحریک کا زور شور تھا۔ اس ضلع کے گرد و نواح اور دیہات میں بھی تحریک سے بڑی دلچسپی ہونے سے خوب زور تھا اور بعض جگہ مثلاً ٹانک، کلاچی، گل امام، گگل بازار اور پنیالہ میں لوگ تحریک میں سرگرم حصہ لے رہے تھے۔ شہر ڈیرہ اسمٰعیل خان میں مردوں کے علاوہ عورتوں اور بچوں کے جلوس نکلتے تھے۔ ایک دن ۱۹۳۰ء میں عورتوں کا ایک عظیم الشان جلوس شہر کے بازاروں اور گلی کوچوں سے گزر رہا تھا

(باقی آگے صفحہ پر)

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ)

جب یہ جلوس ڈاکٹر جھنڈا رام کے چوک میں پہنچا تو صوبہ سرحد کے انسپکٹر جنرل پولیس آئسن مونگر نے جلوس کو منتشر ہونے کا حکم دیا لیکن عورتوں نے منتشر ہونے سے انکار کر دیا۔ جرنیل صاحب کو عورتوں کے اس انکار پر بڑا غصہ آیا۔ اُس نے جلوس پر پستول چلانا چاہا۔ اچانک ایک نوجوان سردار بھگوان سنگھ نے آئسن مونگر کا پستول والا ہاتھ پکڑ لیا اور اس سے کہا "تمہیں عورتوں پر پستول چلاتے ہوئے شرم نہیں آتی"

جرنیل صاحب کا ہاتھ کانپنے لگا اور پستول زمین پر گر پڑا۔ جرنیل صاحب حواس باختہ ہو کر ڈاک بنگلے کی طرف دوڑ گئے۔ اُن کا ریوالور ایک سپاہی نے اٹھا کر اُن کے پاس پہنچا دیا۔ بھگوان سنگھ سے اُس کی اس جرأت آمیز کارروائی کا بدلہ حکومت نے دوسرے سال اگست ۱۹۳۱ء کے فرقہ وارانہ فسادات کے بعد لیا۔ اُسے قتل کے جھوٹے مقدمے میں ماخوذ کر لیا گیا اور بیچارے کو بڑی مدت تک مختلف جیلوں میں ناقابلِ بیان اذیتیں پہنچانے کے بعد عدم ثبوت کی وجہ سے رہا کر دیا گیا۔

۱۹۳۱ء میں ڈیرہ اسمٰعیل خان کا ڈپٹی کمشنر کرنل نول مشہور کرنل لارنس کی طرح ایک مکار انگریز تھا۔ خان عبدالغفار خان اضلاع کوہاٹ اور بنوں کا دورہ ختم کر کے ڈیرہ اسمٰعیل خان آنے والے تھے۔ جونہی ڈپٹی کمشنر کو باچا خان صاحب کے دورے کی اطلاع ملی تو اُس نے اپنے ازلی خوشامدیوں، مقامی نوابوں اور رائے بہادروں کے ذریعے بڑی کوشش کی کہ ڈیرہ اسمٰعیل خان میں خان باچا کا دورہ کامیاب نہ ہو، یہاں تک کہ اُن کا استقبال بھی نہ ہونے پائے، لیکن جب وقت خان بابا ڈیرہ اسمٰعیل خان آئے تو شہر کے ہندوؤں، مسلمانوں اور سکھوں نے ان کا اتنا شاندار استقبال کیا۔ اور ایک ایسا عظیم الشان جلوس نکالا کہ ڈیرہ اسمٰعیل خان کی تاریخ میں ایسا بے مثال جلوس کبھی کسی کا نہیں نکلا تھا۔ باچا خان ڈیرہ اسمٰعیل خان شہر کا دورہ ختم کر کے ضلع بھر کے دیہات میں گاؤں بہ گاؤں تشریف لے گئے اور ہر جگہ لوگوں نے انہیں سر آنکھوں پر بٹھایا اور بڑے جوش و خروش

سے خدائی خدمتگار بھرتی ہوئے۔

گاندھی اروِن معاہدے کی رُو سے ولایتی کپڑے کی دکانوں پر پکیٹنگ کی اجازت تھی۔ کلاچی اور ڈیرہ اسمٰعیل خان میں بدیشی کپڑوں کے بیوپاریوں نے لاکھوں روپے کا کپڑا کانگریس کمیٹیوں اور خدائی خدمتگاروں سے سیل مہر کرواکر بیچنا بند کر دیا۔ کانگریس اور خدائی خدمتگاروں کی اِس قدر ہر دلعزیزی و کامیابی دیکھ کر ڈپٹی کمشنر نول اور اسسٹنٹ کمشنر شیخ محبوب علی حواس کھو بیٹھے۔ اور انہوں نے ہندو مسلم فسادات کروانے کی ناپاک سکیم بنائی۔ اِس مکروہ طریقے سے باچا خان کے دَورے کا اثر زائل کرنے اور قومی تحریک کو بدنام و ناکام بنانے کے لئے ایک اور غلیظ چال چلی۔ یہ دونوں رسوائے جہاں افسر مقامی نوابوں، خان بہادروں اور رائے بہادروں سے مایوس ہو چکے تھے، کیونکہ وہ چند ماہ قبل باچا خان کا وہ تاریخی استقبال اور جلوس نہیں بند کر سکے تھے۔ لہٰذا اب کے انہوں نے پنیالہ کے خان بہادر مہربان خان کو بلوا بھیجا۔ اور اس سے کہا گیا کہ "وہ ایسے آدمی تیار کرے جنہوں نے سُرخ کپڑے پہن رکھے ہوں اور جونہی ڈپٹی کمشنر اُسے اطلاع دیں وہ لوٹ مار کے لئے اپنے سُرخ پوشوں کو ڈیرہ اسمٰعیل خان بھیج دے تاکہ وہ شہر میں تباہی مچا دیں۔

ڈپٹی کمشنر نول صاحب اور شیخ محبوب علی کی منشا یہ تھی کہ یہ مکروہ کام تو خان بہادر مہربان خان کے کرائے کے ٹٹو کریں گے۔ مگر اس سے نفرت کا جذبہ پیدا ہوگا خدائی خدمتگاروں کے خلاف۔ یہ تحریک بھی ختم ہو جائے گی اور ہندوستان بھر میں کانگریسی لیڈر اور عوام خدائی خدمتگاروں سے متنفر اور بدظن بھی ہو جائیں گے

مہربان خان کے کرائے کے آدمیوں کے علاوہ مقامی نوابوں، خان بہادروں اور رائے بہادروں نے بھی اس مکروہ سازش میں حصّہ لیا۔ اس سازش کے تحت ڈیرہ اسمٰعیل خان کے بازاروں اور کوچوں میں آگ لگوا دی گئی۔ کئی دکانات اور مکانات جل گئے۔ کچھ ہندو

اور مسلمان مارے بھی گئے۔ اس فساد کا، جو حکومت کے ایما سے ہوا تھا، اثر دوسرے شہروں اور دیہات پر بھی پڑا۔ ڈیرہ اسمٰعیل خان میں ہڑتال ہوگئی تھی اور چاروں طرف مایوسی چھا رہی تھی کہ باچا خان صاحب وہاں پھر تشریف لے آئے اور اپنی نیک کوششوں سے ہندو مسلمانوں کو شیر و شکر کر دیا۔ ایک بار پھر صلح ہونے والی تھی کہ رائے بہادروں نے نول صاحب کے ورغلانے پر کام بگاڑ دیا۔ لیکن تھوڑے دنوں کے بعد چیف کمشنر کے آنے پر اور اُس کے ڈرانے دھمکانے پر لوگوں نے خود بخود ہڑتال کھول دی اور ایک دوسرے کی مخالفت ترک کر دی۔ ایک کام ہندو مسلمانوں نے بُرا کیا کہ اس انگریز کی بات مان لی جس کے ہاتھوں تباہ و برباد ہوئے تھے، مگر امن و آشتی کے فرشتے کی نہ مانی۔ انگریز کی طرف سے ڈالی گئی نفرت ان کے دلوں میں پروان چڑھتی رہی۔ حتیٰ کہ ۱۹۳۹ء میں پھر فسادات ہوئے۔ اور ان کے اندر فرقہ وارانہ ذہنیت بھی آخر تک قائم رہی۔ لیکن دیہات میں پشتونولی (پٹھانی غیرت) اور بھائی چارے کی وجہ سے ۱۹۴۷ء کے ہنگاموں میں جہاں جہاں بھی خدائی خدمتگار تحریک تھی، ڈیرہ اسمٰعیل خان کے علاوہ صوبہ بھر میں ہندوؤں اور سکھوں کی عزت اور مال و جان سب کچھ محفوظ تھا۔ اس ضمن میں درابن، چودھوان، پارک، گل امام، کلاچی، عیدا خیل اور مروت کے دوسرے مقامات قابل ذکر ہیں، جہاں خدائی خدمتگاروں نے حملہ آور مسلم لیگی اور دوسرے فسادی عنصر کا بڑی جرأت سے مقابلہ کر کے ہندو اور سکھوں کی حفاظت کی۔ ان ہنگاموں میں شہید ہونے والوں میں ڈیرہ کے اندر مسیٰ اور کلاچی کے شہید واسد معید تر کے نام ہمیشہ زندہ رہیں گے۔ خدائی خدمتگاروں کی بدولت سارے صوبہ سرحد میں اغوا کی معدودے چند واردات کو چھوڑ کر امن امان رہا۔ پنجاب کی طرح پٹھانوں کی دھرتی پر غلیظ اور شرمناک واقعات نہیں ہوئے۔

(ڈیرہ اسمٰعیل خان کے واقعات باچا خان کی خواہش اور ہدایت کے مطابق تارنگ صاحب کے تحریر کردہ ہیں)

اُس نے اس موقع پر اُسی نالے کے قدیم پیسے جو باہر کے دیہات سے داخل ہو کر شہر میں بسنے والے
شہر کے لوگوں کی کھانے پینے کی چیزوں کے علاوہ اُن کے مویشیوں کے لئے گھاس کے انباروں
کے انبار سپلائی کئے اور اُن کی حفاظت کا انتظام بھی کیا۔ نتیجہ یہ ہوا کہ بنوں کے لوگوں کو
چنداں تکلیف نہ پہنچی اور انسانی زندگیوں کے علاوہ جانور بھی ضائع ہونے سے بچ گئے۔
ڈپٹی کمشنر کا تباہ کن و غیر انسانی منصوبہ ملک صاحب مرحوم نے شرمندۂ تکمیل نہ ہونے دیا۔
لہٰذا مجبور ہو کر اسے محاصرہ اُٹھا لینا پڑا۔

(۱۵)

گاندھی ارون پیکٹ ہو چکا تھا لیکن پھر بھی ہمارے گاؤں (اتمان زئی) میں جلسے پر
حکومت نے فائرنگ کر دی۔ قصہ یوں ہوا کہ ہمارے گاؤں میں خدائی خدمتگاروں کا جلسہ
ہو رہا تھا۔ فوج نے آ کر چاروں طرف سے جلسہ گاہ کو گھیر لیا اور لوگوں سے کہا کہ منتشر ہو جائیں
لوگ منتشر نہیں ہوتے تھے۔ تب اُن پر گولی چلادی گئی کچھ لوگ گولیاں کھا کر شہید ہو گئے
لیکن اتنے ظلم و ستم کے باوجود انگریز ہمارے جلسے بند نہ کر سکے اور جب جلسے ہوتے تھے تو
فوجوں اور رسالوں کے ذریعے منتشر کئے جاتے تھے۔ خدائی خدمتگار کہتے تھے کہ ہماری فوجیوں
میں سکھوں اور آفریدیوں کی ہمارے ساتھ بڑی ہمدردی رہا کرتی تھی لیکن ہمارے بھائی
بنگش اور خٹک ہم پر ذرا بھی رحم نہیں کھایا کرتے تھے بلکہ ہمیں بڑی بیدردی سے
زدو کوب کرتے تھے۔ اتمان زئی کے جلسے میں فائرنگ کے وقت گولیوں کی بوچھاڑ
اتنی سخت تھی کہ آخر نہتے پُرامن لوگ مجبور ہو گئے کہ جلسے کی جگہ کو چھوڑ دیں اور منتشر
ہو جائیں۔

یہاں بھی ایک عجیب و غریب واقعہ رُونما ہوا۔ کہ جلسے کی رونق دیکھنے کے لئے
بہت سی عورتیں اور لڑکیاں بھی آئی ہوئی تھیں۔ ان میں رب نواز خان کی ایک جواں سال
بہن بھی تھی۔ وہ بجائے اس کے کہ فائرنگ کی وجہ سے جلسہ گاہ سے دور بھاگ جاتی

اُلٹا اس محشر خیز میدان کی طرف جدھر سے فائرنگ ہو رہی تھی دوڑ پڑی۔

جلسے سے بھاگنے والے لوگوں نے اُسے آوازیں دیں "اے بہن! کہاں جا رہی ہو۔ خدا کے واسطے دیکھو تو سہی، یہ کیا حال ہو رہا ہے۔ رُک جاؤ بہن! اُدھر تو قیامت بپا ہے، خدارا کیا کرتی ہو رُکتی کیوں نہیں؟"

ربنواز خان کی بہن نے گرج کر جواب دیا "اِسی لئے تو نہیں رکتی میں اُدھر جانے سے کہ تم لوگ اُدھر سے بھاگے چلے آرہے ہو۔ مجھے جانے دو تاکہ میں گولی کو سینے پر کھاؤں۔ اور فرنگی کو یہ کہنے کا موقع نہ دوں کہ پٹھانوں میں کوئی بھی ایسا انسان نہیں رہا جو اپنے عقیدے کی خاطر موت کو للکار سکے۔"

اس لڑکی کی غیرت بھری باتوں اور رکردار نے لوگوں پر ایسا زبردست اثر کیا کہ تمام لوگ واپس پھر جلسہ گاہ کی طرف لوٹ پڑے۔ انگریزوں نے جب دیکھا کہ یہ لوگ جلسہ گاہ کی طرف آرہے ہیں تو انہوں نے ان سے پوچھا کہ وہ اُدھر کیوں جا رہے ہیں؟

لوگوں نے جواب دیا "ہم اپنے آدمیوں کی لاشیں لے جانا چاہتے ہیں تاکہ تم لوگ انہیں تلف نہ کردو۔"

یہ لوگ اتنی بھاری تعداد میں جمع ہو گئے کہ انہوں نے انگریزی فوج کو اپنے گھیرے میں لے کر انہیں ایسا خوفزدہ کر دیا کہ جلسہ گاہ سے چلے جانے کے لئے فوج کے سامنے یہ شرط رکھ دی کہ انہیں فوج کی تلاشی لینے کی اجازت ہو تاکہ وہ تلاشی لے کر اپنی تسلی کر لیں کہ فوج اُن کے کسی شہید کی لاش اپنے ساتھ نہیں لے جا رہی ہے۔ انگریز فوج نے لوگوں کی یہ شرط مان لی۔ لوگوں نے ہر ایک سپاہی کی تلاشی لے لی۔ اگرچہ ایک طرف ان کے آدمی مارے گئے، لیکن دوسری طرف اِن کو بڑی شاندار فتح نصیب ہوئی۔

ہمارے ساتھ انگریز کے اس سلوک اور رویئے کی وجہ سے صرف صوبہ سرحد کے لوگ ناراض نہیں تھے بلکہ پنجابیوں اور قبائلی علاقوں کو بھی زبردست غصہ تھا چنانچہ

آفریدیوں نے پشاور میں لکڑی گودام پر مسلح حملہ کردیا۔ مہمندوں، سیالوں، اتمانخیلوں اور بامندوں اور سالارزئیوں نے شبقدر ڈھیری، مٹہ اور دوسرے مقامات پر حملے شروع کردیئے۔ مجاہدین نے لیکنڈی اور سوبان خوڑ میں اپنا مرکز قائم کرلیا تھا اور مہینوں تک انگریزی فوجوں سے ان کی جنگ جاری رہی۔ قبائلیوں کے ان علاقوں پر جہاں انگریزی حکومت کا براہ راست تسلط اور فوج موجود تھی یہ حملے ہوئے، لیکن جہاں انگریز حکومت سے قبائلیوں کی مستقل حد بندی نہیں تھی، یا سرحد کی کوئی ایجنسی بیچ میں حائل تھی وہاں وہ جرگوں کی شکل میں انگریزوں کے پولیٹیکل ایجنٹوں کے پاس گئے اور انہیں الٹی میٹم دیئے کہ مجھے (خان عبدالغفار خان کو اور ملنگ بابا (گاندھی جی) کو فوراً رہا کردیا جائے، سُرخپوشوں کو بھی جیل خانوں سے رہا کردیا جائے۔ پٹھانوں پر ظلم اور زیادتیاں کرنے سے احتراز کیا جائے

اسی قسم کی بغاوت یا طوائف الملکی تمام قبائل میں پیدا ہوگئی (اس سلسلے میں نیشنل ارکائیوز آف انڈیا کے خفیہ ریکارڈ میں واضح اور مفصل تفصیلات موجود ہیں) مذکورہ بالا مطالبات کے ساتھ ساتھ قبائلیوں نے انگریزوں کو مسلح جنگ کی دھمکیاں بھی دیں۔ چنانچہ ترکانڑی قوم کا ایک بہت بڑا جرگہ جو ماموندوں سالارزئیوں اور اتمان خیلوں پر مشتمل تھا، مالاکنڈ کے پولیٹیکل ایجنٹ سے ملا۔ ان جرگوں کا آنکھوں دیکھا حال لوگوں نے میرے سامنے بیان کیا۔ اس سے پتہ چلا کہ پولیٹیکل ایجنٹ نے اس جرگے کے لئے ملاقات کے وقت چائے کا بہت اعلیٰ انتظام کیا تھا جرگے والوں کے سامنے میز پر روپوں کے ڈھیر اور نوٹوں کے بنڈل لگا رکھے تھے تاکہ وہ اپنے ان مہمانوں کی عزت کرسکے اور روپوں اور دولت کا لالچ دے کر انہیں مسحور کرسکے، لیکن اس جرگے میں کسی نے چائے کا پیالہ اپنے منہ سے نہ لگایا۔ صرف یہی نہیں کہ قبائلیوں نے روپوں کے ڈھیروں اور نوٹوں کے انباروں پر نفرت و حقارت سے

تحرک دیا بلکہ ان پٹھان غیور بھائیوں کا غیض و غضب اس حد تک بڑھا ہوا تھا کہ جب پولیٹیکل ایجنٹ نے ایک خان کے ساتھ جس کا نام بادشاہ خان تھا، ہاتھ ملانا چاہا تو بادشاہ خان نے اپنا ہاتھ پیچھے کھینچ لیا اور اس سے کہا۔

"وہ ہاتھ جو میرے پختون بھائیوں کے خون سے رنگے گئے ہیں انہیں چھو کر میں اپنے آپ کو ناپاک نہیں کرنا چاہتا"

قبائلی سردار بادشاہ خان سالارزئی قبیلے کی پشتو قوم کا چشم و چراغ تھا۔ پولیٹیکل ایجنٹ نے ان قبائلی سرداروں کی بڑی خوشامد کرتے ہوئے کہا "مجھے آپ لوگ مہلت دیں کہ میں حکومتِ ہند کے سامنے آپ کا یہ قومی مطالبہ پیش کرسکوں"۔ اس کے بعد وہ چلا بھی گیا، لیکن میرے لئے قبائلی بھائیوں نے جس شفقت کا اظہار فرمایا اور وطن دوستی کا جو ثبوت پیش کیا اس کی خوشگوار یاد ابھی تک میرے ذہن میں تازہ اور محفوظ ہے اور میں اسے مرتے دم تک نہیں بھلاؤں گا۔

انگریزوں نے اپنی حکومت کے زمانے میں اور اب پاکستان کی حکومت نے بھی ہمیں یہ اجازت کبھی نہ دی کہ ہم اپنے ان قبائلی بھائیوں، ایجنسی کے لوگوں اور ریاستوں کے بھائی بندوں سے تعلقات رکھیں اور باہم ان کے پاس جائیں اور ان کی غمی خوشی میں شریک ہوں۔

پشتونوں کا یہ واحد خاندان اور واحد ملک انگریزوں نے مختلف انتظامی حصوں میں بانٹا ہوا تھا۔ ایک تو سرحد کا وہ علاقہ جس میں ہم رہتے ہیں اور اسے گورنر کا صوبہ کہا جاتا تھا۔ دوسرے ایجنسیوں کے علاقے ہوتے تھے جو پولیٹیکل ایجنٹ کے براہِ راست اختیار کے ماتحت ہوتے تھے۔ سوم وہ ریاستیں تھیں جن کا نظام پولیٹیکل ایجنٹوں کی وساطت سے ہوتا تھا چہارم آزاد قبائل تھے۔ اسی طرح بلوچستان ایک علیحدہ صوبہ تھا جو صوبہ سرحد کی طرح چار طبقوں میں بانٹا گیا تھا۔ قصہ کوتاہ یہ

کہ پٹھانوں کی یہ دنیا آٹھ حصوں میں منقسم تھی، جن میں سے ایک حصہ بھی دہلی سے ارتباط اور تعلق رکھنے کا مجاز نہیں تھا اس سے انگریزوں کی غرض اور اب پاکستان کا مطلب یہ ہے کہ ہم لوگ چھوٹے چھوٹے ٹکڑوں اور قبیلوں میں ایک دوسرے سے جُدا رکھے جاسکیں اور ہمیں ایک اپنا بھائی چارہ قائم کرنے کے لئے کھلا نہ چھوڑا جائے اس ظلم نے ہمارے ملک اور ملّت کو اس قدر نقصان پہنچایا ہے کہ چنگیز اور ہلاکو کی وحشت کو بھی مات کر دیا ہے۔ کیونکہ اُن وحشی چنگیز اور ہلاکو نے تو چند ہزار یا لاکھ انسان ہلاک کئے تھے اور بمصداق " بلائے آمد و لے بخیر بگذشت[1] " چلے گئے تھے لیکن اس پالیسی (یعنی انگریزی و پاکستانی پالیسی) کے ہاتھوں تو لاکھوں پختون، جو شاید ایشیا میں ایک مضبوط قوت بنتے اور انسانیت کی عظیم خدمت کرتے گھس گھس کر دنیا کی تاریخ اور صفحۂ ہستی سے بتدریج فنا ہو چکے ہیں۔

میرا تمام تر مجادلہ آج اسی ظلم کے خلاف ہے۔ میں کہتا ہوں کہ اس ملّت نے کونسا گناہ کیا ہے کہ تاریخ سے مٹائی جا رہی ہے۔ ان کا ملک چھینا جا رہا ہے اور ایک عظیم الشان و شریف النفس قوم کو موت کے گھاٹ اُتارا جا رہا ہے۔ یعنی اسے محکوم کرنے کی ناپاک و ناکام کوشش کی جا رہی ہے۔ میں بلوچستان سے چترال تک پٹھانوں کے بکھرے ہوئے قبیلوں کو رشتۂ اتحاد میں منسلک کرنا چاہتا ہوں۔ تاکہ ان میں ایک بھائی چارہ پیدا ہو جائے۔ ان کا غم والم ایک دوسرے کا مشترکہ درد و رنج بن جائے اور انسانیت کی خدمت کے لئے یہ غیور قوم (پشتون) دنیا میں اپنا قومی رول ادا کر سکے۔ میں شاید شدید درد کے احساس کے ساتھ اس بات کی طرف اشارا کر دوں کہ ہمیں غیروں نے بہت غلط رنگ میں دنیا کے سامنے پیش کیا ہے

---

[1] بلا آئی لیکن خیریت سے نکل گئی۔

مثلاً ایک طرف تو ہم پر سب دروازے بند رکھے ہیں تاکہ کوئی ہمارے پاس نہ آسکے اور
دوسری طرف ہمارے دشمن ہمارے خلاف پروپیگنڈا کر رہے ہیں کہ ہم وحشی ہیں اور
نہ جانے کیا کیا ہیں۔ یہ پروپیگنڈا ہمارے قبائلی بھائیوں کے خلاف مختلف طریقوں
سے اتنا زیادہ اور زور شور سے جاری ہے کہ انسان کو اس پر افسوس ہوتا ہے بشلاً
اُن کی بہادری کی تعریف تو کریں گے لیکن اس بہادری کو وحشت کا رنگ دیدیں گے۔
اُن کو آزادی سے پیار و محبت ہے، اس بات کی تعریف تو کریں گے لیکن ایسے الفاظ
میں کہ شاید اُن کی کوئی تنظیم نہیں ہے اور نہ ہی وہ کسی ضابطے کے پابند ہیں، جب بھی
اُن کے دل میں آتا ہے وہ انسانوں کو قتل کر دیتے ہیں اور جربات انہیں پسند ہوتی
ہے وہی کرتے ہیں۔ اُن کی مہمان نوازی کی صفت تو بیان کریں گے اور بات کو جھوٹ
اور مغالطے کی ایک ایسی حد تک پہنچا دیں گے ــــــ کہ اپنی مہمان نوازی کی روایت
کو برقرار رکھنے کے لئے ہی گویا یہ لوگ (قبائلی پٹھان) مجبور ہو جاتے ہیں کہ یہ چوری
بھی کریں، ڈاکے بھی ڈالیں۔ ایک یا دوسری حکومت سے پیسے یا رشوت لیں۔ یعنی
یہ کہ وہ جیسے کسی بھی اخلاق کے پابند نہ ہوں اور شتر بے مہار ہوں۔ اسی طور طریقے
سے یہ چالاک اور حکمران اقوام چاہتی ہیں کہ یہ بہرحال پٹھانوں کے ایک شریف طبقے
کو دنیا کے سامنے بدنما صورت میں پیش کریں۔ اور انہیں نہ صرف دنیا کی ہمدردی ہی
سے محروم رکھیں بلکہ خود غرض حکومت کو جواز، موقع اور بہانہ مہیا کریں کہ وہ انہیں
کچل کر رکھ دے۔ انہیں بموں سے اُڑا دے۔ مشین گنوں سے اُن کے وجود کو چھلنی چھلنی
کر ڈالے۔ اُن کے گھر مٹی میں ملا دے۔

یہ پشتون لوگ کئی سو سالوں سے، جو اُن کی سیاہ بختی کا زمانہ تھا، بہت بُری
طرح سے مبتلائے آلام چلے آرہے ہیں۔ مغلوں کے زمانے سے لے کر انگریزوں تک اور پھر
انگریزوں کے زمانے سے لے کر آج کی حکومت پاکستان تک سب نے ان لوگوں سے

(قبائلی پٹھانوں سے) یکساں وحشیانہ سلوک کیا ہے۔ انہیں پہاڑوں کے سنگین اور سخت ترین دامنوں اور شور کے بڑے میدانوں میں ایسے رکھا گیا ہے، یا رہنے کے لئے مجبور کیا گیا ہے کہ جیسے وہ قلعے میں رکھنے کے لائق اسیر ہوں۔ یعنی ان کو نہ تو ان کی زمین سے کچھ حاصل ہوتا ہے اور نہ ہی یہ لوگ تجارت کر سکتے ہیں۔ کیونکہ تجارت کے لئے تو زمانۂ حال میں ذرائع آمد و رفت و مواصلات کی ضرورت ہوتی ہے۔ انہیں کسی سے کسی قسم کی صنعت و حرفت میں کبھی تربیت حاصل کرنے کا موقع بھی نہیں دیا گیا، کیونکہ صنعت کی ترقی و تربیت کے لئے تو ایک طویل و پُرامن دَور کی ضرورت پڑتی ہے جس کا کئی سو سالوں سے اُن کے لئے قحط ہے۔ ان پر روزانہ بمباری ہوتی ہے۔ جنگ ہوتی ہے اور ان کا قتلِ عام ہوتا رہتا ہے۔ یہ علاقہ گویا سامراجی طاقتوں نے اپنی فوجوں کی عملی تعلیم و تربیت کے لئے ایک طرح سے میدانِ جنگ بنا رکھا ہے۔ اِن لوگوں کو نہ تو کسی نے کبھی تعلیم دی ہے اور نہ ہی ان کے لئے کوئی ہسپتال قائم کیا گیا ہے تاکہ وہ اپنی ادنیٰ سی بیماری کا بھی علاج کرا سکیں۔ مدیری گل (خوبصورت خودرو صحرائی پھول) کی مانند یہ لوگ پیدا ہو کر پلتے ہیں اور پھر ویسے ہی جنگل اور پہاڑ میں مٹی میں مل جاتے ہیں۔ نہ تو انہیں روٹی میسّر ہے اور نہ پانی، نہ کھیت کیاری ہے اور نہ باغ باغیچہ، نہ بازار ہیں اور نہ تجارتی منڈیاں، نہ زندگی ہے اور نہ ہی زندگی کی ضروریات و لوازمات۔ میں نہیں سمجھتا کہ سنگدل دنیا ان سے چاہتی کیا ہے؟ بجائے اس کے کہ انسانیت کے ناطے ان لاکھوں خوبصورت لڑکیوں اور غیور نوجوانوں پر رحم کرے، اس نے ان کے پیچھے مردم خور لگا رکھے ہیں اور اس پر ستم بالائے ستم تو یہ ہے کہ ان کے زخموں پر نمک چھڑکنے کے لیے انہیں بے عزت بھی کیا جاتا ہے اور پیچھے سے گالیاں بھی دی جاتی ہیں!۔

میری دوسری آرزو یہ ہے کہ ان شریف، بہادر، وطن دوست، غیرتی اور

ننگ وناموس کے پروانوں یعنی پٹھانوں کو غیروں کے ظلم واستبداد سے بچالوں اور ان کے لئے ایک ایسی آزاد دنیا بنادوں کہ جہاں وہ ہنستے کھیلتے ہوئے آسودہ زندگی بسر کر سکیں۔ میں چاہتا ہوں کہ ان کے اُن ویران اور مسمار گھروں کے ڈھیلوں اور مٹی کو چوم لوں، جو وحشی انسانوں نے برباد کئے ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ ان کے گلی کوچے اور گھر در اپنے ہاتھوں میں جھاڑو لے کر صاف کروں۔ میں چاہتا ہوں کہ ان کے خون سے لت پت کپڑے اپنے ہاتھوں سے دھوؤں اور پھر یہ خوبصورت انسان دنیا کے سامنے کھڑے کردوں اور دنیا سے کہوں کہ "آؤ، اب مجھے ان سے زیادہ شریف، شائستہ اور متمدن انسان کوئی ہو تو دکھادو۔"

خیر ذکر گاندھی اروِن پیکٹ کا چل رہا تھا۔ جب یہ پیکٹ ہوگیا تو تمام سیاسی قیدی رہا کردیئے گئے۔ صرف ایک میں ہی رہ گیا جسے رہا نہ کیا گیا اور میں گجرات کے جیل خانے میں اکیلا رہ گیا۔ میں نے سپرنٹنڈنٹ جیل سے پوچھا کہ "مجھے کس لئے بند رکھا گیا ہے؟" انہوں نے مجھے بتایا "یہاں مسلم رہنماؤں کی ایک کمیٹی آرہی ہے جس میں سر فضل حسین اور سر صاحبزادہ عبدالقیوم بھی شامل ہیں اور وہ آپ سے ملنا چاہتے ہیں۔"

میں نے سپرنٹنڈنٹ سے کہا "میں تو اُن سے نہیں ملنا چاہتا، اس لئے کہ جب ہم پر مصیبت تھی تب تو انہوں نے ہماری کوئی مدد نہ کی۔ اُس وقت تو انہوں نے مجھے فراموش کررکھا تھا اور اب جب مجھے راحت میسر آنے لگی ہے تو میں انہیں یاد آگیا ہوں۔ آپ مہربانی فرمائیں، انہیں اطلاع دیدیں کہ وہ یہاں تشریف نہ لائیں۔ لیکن اگر وہ آبھی گئے تو میں اُن سے ملاقات نہیں کروں گا۔"

اُدھر ہمارے لوگ (پٹھان) مہاتما گاندھی کے پاس گئے اور انہیں اس بات سے آگاہ کیا "جہاں سب سیاسی قیدیوں کو رہا کردیا گیا ہے وہاں عبدالغفار خان کو رہا کرنے کا نام ہی نہیں لیا جاتا۔ اس کی ایک خاص وجہ یہ ہے کہ سرحد کے چیف کمشنر سر سٹورٹ پیرسن

نے وائسرائے کو لکھا ہے کہ صوبہ سرحد میں ہم دو آدمی بیک وقت نہیں رہ سکتے۔ یا تو عبدالغفار خان رہے گا اور یا میں رہوں گا۔"

یہ اطلاع پاکر مہاتما گاندھی لارڈ اروِن کے پاس گئے اور اُن سے کہا "عبدالغفار خان کو بھی رہا کر دیجئے، کیونکہ وہ ہماری کانگریس کا ممبر ہے۔"

لارڈ اروِن اچھے آدمی تھے۔ انہوں نے گاندھی جی سے کہا "پٹھان اور عدم تشدد ناممکن۔ آپ کو چاہیئے کہ صوبہ سرحد میں جائیں اور اپنی آنکھوں سے حالات کا مطالعہ کریں کہ پختون کس حد تک عدم تشدد کے قائل ہیں۔"

یہ کہنے کے باوجود لارڈ اروِن نے میری رہائی کے احکام جاری کر دیئے اور میں رہا ہو گیا۔ اب میں اپنے صوبے میں آیا۔ یہاں کے حالات اور لوگوں کے جذبات دیکھے۔ یہ بڑے سازگار تھے۔ میں نے بسم اللہ کر دی اور کام کرنا شروع کر دیا۔ ایک منٹ بھی رائیگاں نہیں جانے دیا۔ لوگوں میں ہمت و خود اعتمادی پیدا کرنے کے لئے جب کبھی میں تقریر کرتا تو اس بات پر بہت زور دیا کرتا کہ "فرنگی کا ایک سینگ تو ٹوٹ گیا ہے پختونو! اٹھو، کمر کس لو اور اُس کا دوسرا سینگ بھی توڑ دو۔ یہ ملک تمہارا ہے اور خدا نے تمہارے بچوں کو عطا کیا ہے۔ لیکن آج تمہاری بے اتفاقی، خود غرضی کی وجہ سے انگریز تمہارے ملک کو ہڑپ کر رہے ہیں۔ حالانکہ خدا کا دیا ان کا اپنا ملک بھی ہے، مگر تمہارے وطن کو بھی کھا رہے ہیں۔ تمہارے بال بچے بھوکے پیاسے ہیں اور تمہارے ملک کی بدولت اُن کے بچے گلچھرے اڑا رہے ہیں اور ترقی کر رہے ہیں۔"

میری تقریر کے اس جملے "فرنگی کا دوسرا سینگ بھی توڑ دو" نے انگریز کو سیخ پا کر دیا۔ اس نے میرے ساتھیوں میں میرے خلاف پروپیگنڈا کیا "عبدالغفار صلح صفائی یا مفاہمت نہیں چاہتا بلکہ بگاڑ پیدا کرتا ہے۔ اس کی باتوں کا نتیجہ یہ ہوگا کہ ہم سب پر مصیبت آجائے گی۔"

انگریز نے ہمارے بعض ساتھیوں کے دماغ میں یہ بات بھی بٹھانے کی کوشش کی۔
"تم لوگ بڑے قابل اور لائق ہو اور یہ عبدالغفار خاں تمہاری طرح عالم نہیں ہے۔ کام تم لوگ کرتے ہو مگر نام اس کا ہوتا ہے"

اس قسم کے پروپیگنڈے کا اثر ہمارے بعض ساتھیوں پر ہوا بھی اور اُن کے چند ایک لیڈر جمع ہوئے۔ انہوں نے مردان میں ہمارے قاضی عطا اللہ جان کے یہاں ایک میٹنگ کی اور اس میٹنگ میں مجھ سے کہا کہ ایک تو آپ اپنے یہ دَورے ملتوی کر دیں اور دوسرے سینگ ٹوٹ جانے کی بات مت کیجئے"

میں نے کہا: "اچھا! آخر لوگوں سے کیا کہوں گا؟"

انہوں نے کہا: "ہم نے ایکدوسرے کی طرف دوستی کا ہاتھ بڑھایا ہے۔ اب ایسی بات نہیں کہنی چاہیئے"

میں نے انہیں کہا: "اس سے تو پٹھانوں میں وہ جذبہ نہیں پیدا ہو سکتا جو میں ان میں پیدا کرنا چاہتا ہوں"

انہوں نے پھر زور دیا کہ میں دَورے کرنا بند کردوں۔ میں نے رائے ظاہر کی: "یہ معاہدۂ مفاہمت پائیدار نہیں ہے۔ یہ جلد یا بدیر ٹوٹنے والا ہے۔ خیر خدا نے ہمیں کام کرنے کے واسطے ایک اچھا وقت دیا ہے اسے ضائع نہیں کرنا چاہیئے" لیکن بعض آدمیوں پر خوف طاری ہو گیا تھا۔ وہ خود تو کام کرتے نہیں تھے اور مجھے بھی کام کرنے نہیں دیتے تھے کیونکہ ان کا خیال یہ تھا کہ مجھے گرفتار کیا جائے گا تو وہ بھی میرے ساتھ دھرلے جائیں گے اور وہ قید ہونے اور جیل جانے کے لئے تیار نہیں تھے

(۱۴)

کراچی میں آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا اجلاس تھا۔ ہمیں اس میں شریک کرنے کے لئے دعوتیں آئی تھیں۔ اور یہ پہلی کانگریس تھی جس میں ہم شامل ہو رہے تھے۔ ہمارے ہمراہ اننی

یا ایک سو خدائی خدمتگار، جنہوں نے خوبصورت اور پرکشش سُرخ وردیاں زیب تن کی ہوئی تھیں، اپنے ساز و سامان سے لیس ہو کر کراچی کے لئے روانہ ہوئے اور بڑی دھوم دھام سے کراچی پہنچ گئے۔ راستے میں ہم نے خوب پروپیگنڈا کیا جس اسٹیشن پر ریل گاڑی کھڑی ہوتی ہمارے خدائی خدمتگار اپنے ساز و سامان کے ساتھ نیچے اُترتے اور اپنا پروپیگنڈہ کرتے۔

کراچی میں کانگریس نے ہمیں ایک علیحدہ کیمپ دیا جو خاص طور پر ہمارے لئے ہی بنایا گیا تھا۔ ہمارے خدائی خدمتگار ڈیوٹی بڑے شوق اور بہادرانہ انداز میں دیتے تھے۔ ان کے اندر زبردست احساسِ ڈسپلن بھی تھا اور جلسوں میں جس جگہ ڈیوٹی دینا مشکل نظر آتا تھا وہاں خدائی خدمتگاروں کی ڈیوٹی لگائی جاتی تھی اور وہ اپنا فرض منصبی بڑی خوبی اور شان سے ادا کرتے تھے۔ اس وجہ سے ہمارے والنٹیر لوگوں میں بیحد ہر دلعزیز ہو گئے تھے اور قدر و منزلت کی نظر سے دیکھے جاتے تھے۔ اس موقع پر گاندھی جی، جواہر لال جی اور کانگریس کے دوسرے بڑے بڑے لیڈروں سے ہماری جان پہچان ہو گئی۔ ان قومی رہنماؤں سے ہمیں بات چیت کرنے کا بھی موقع ملا۔

دہلی میں ڈاکٹر انصاری صاحب کے مکان پر ورکنگ کمیٹی کا اجلاس ہوا تھا میں بھی ورکنگ کمیٹی کا ممبر تھا اور اس جلسے میں شامل ہوا تھا۔ جواہر لال جی سے میری واقفیت نہیں تھی اور نہ ہی وہ مجھے جانتے تھے۔ اُس وقت تک ہم ایک دوسرے کے دوست و آشنا نہیں ہوئے تھے اور نہ ہی ایک دوسرے کی طبیعتوں سے واقف تھے۔ جواہر لال جی نے مجھے علیحدہ کر کے کہا "ہم پشاور کی کانگریس کمیٹی کے دفتر کو خرچ کے لئے پانچسو روپیہ دیا کرتے ہیں اور اب آپ لوگوں کے جرگے کے دفتر کو ایک ہزار روپے ماہوار دیا کریں گے۔"

میں نے انہیں کہا "پنڈت جی! ہمیں روپوں کی ضرورت نہیں۔ پھر ہم آپ سے روپے کیوں لیں۔ کیا یہ ملک صرف آپ ہی لوگوں کا ہے ہمارا نہیں اور اس کے لئے قربانی کرنا صرف آپ ہی کا فرض ہے، ہمارا فرض نہیں؟ یہ آپ کا اور ہمارا سب کا

مشترکہ ملک ہے۔ لہٰذا آپ اپنا بوجھ اُٹھایئے اور ہم اپنا بوجھ اُٹھائیں گے۔ اور اگر آپ لوگ ہماری امداد کرنا چاہتے ہیں تو آپ ہماری لڑکیوں کے لئے ایک اسکول بنوا دیجئے اور اس کے ساتھ ایک چھوٹا سا ہسپتال بھی ہو۔"

جواہر لال جی میری اس بات پر خفا ہو گئے اور مجھے تو کچھ نہیں کہا لیکن ڈاکٹر انصاری صاحب سے شکایت کی کہ باچا خان بہت مغرور شخص ہے۔ جب میں ڈاکٹر صاحب سے ملا تو انہوں نے مجھے کہا کہ میں نے جواہر لال جی کو کس لئے خفا کیا ہے میں نے انہیں کہا کہ میں نے تو ان سے خفگی کی ایسی کوئی بات نہیں کہی ہیں تو ایک خدائی خدمتگار ہوں اور خدائی خدمتگاری اور تکبر تو متضاد چیزیں ہیں۔ میں نے ڈاکٹر انصاری کو اپنی ساری بات سمجھا دی۔ اس کے بعد ہم اور جواہر لال جی ایکدوسرے کی طبیعتوں سے واقف ہو گئے پھر ہم نے اپنے باہمی تعلقات میں اس قدر پریم پیار اور محبت پیدا کر لی کہ دو بھائیوں میں بھی اتنا پریم پیار پیدا نہیں ہوا ہوگا۔ دراصل مجھے پیسوں کی بات بڑی مکروہ نظر آتی ہے اور میں نے اپنی ساری عمر میں کسی کے آگے پیسے کے لئے ہاتھ نہیں بڑھایا۔ ورکنگ کمیٹی کے ممبر ریل کا کرایہ لیا کرتے تھے اور جواہر لال جی نے اس بات پر بھی مجھ سے بڑی لڑائیاں لڑیں لیکن میں نے کرایہ کبھی نہیں لیا تھا۔

کراچی سے واپس آکر میں نے پھر اپنا دورہ شروع کر دیا اور جب ہم کوہاٹ پہنچے اور ضلع کوہاٹ کا دورہ شروع کر دیا تو بھرتی کرنے والے انگریزوں نے حکومتِ سرحد کے ذریعے وائسرائے سے میری شکایت کرتے ہوئے لکھا "کوہاٹ تو ہمارا بھرتی کا ایک مرکز ہے اِس لئے ہم عبدالغفار خان کو اِس ضلع میں دورے نہیں کرنے دیں گے اور اگر وہ آئے گا تو ہم اُسے گرفتار کر لیں گے۔"

اُن دنوں لارڈ ارون چلے گئے تھے اور اُن کی جگہ لارڈ ولنگڈن آچکے تھے۔ اب وہ ہندوستان کے وائسرائے تھے لارڈ ولنگڈن نے گاندھی جی کو لکھا کہ وہ مجھے گرفتار کرنا

چاہتے ہیں۔ گاندھی جی نے انہیں جواب دیا۔

"عبدالغفار خاں کو ہرگز ہرگز گرفتار نہ کیا جائے۔ اگر ایسا کیا گیا تو ہمارا معاہدہ (گاندھی اروِن پیکٹ) ٹوٹ جائے گا۔ لارڈ اروِن نے مجھ سے کہا تھا کہ میں سرحد جا کر پٹھانوں کے طور اپنی آنکھوں سے دیکھوں اس لئے آپ مہربانی فرما کر مجھے سرحد جانے کی اجازت دیجئے تاکہ میں ان لوگوں کو دیکھ لوں۔"

لیکن لارڈ ولنگڈن نے مہاتما گاندھی کو سرحد جانے کی اجازت نہ دی۔ اس پر گاندھی جی نے لارڈ ولنگڈن کو لکھا کہ اگر وہ انہیں سرحد جانے کی اجازت نہیں دیتے تو پنڈت نہرو کو اجازت دیں تاکہ وہ سرحد جا کر صورتِ حال کا مطالعہ کریں لیکن وائسرائے نے نہرو کے لئے اجازت دینے سے انکار کر دیا۔ تب گاندھی جی نے اپنے بیٹے دیوداس کا نام تجویز کیا۔ تب بار بار کے اصرار سے وائسرائے نے دیوداس کو صوبہ سرحد جانے کی اجازت دیدی۔

دیوداس پشاور پہنچ گئے۔ پشاور سے ہم لوگوں نے انہیں اپنے ساتھ لے کر اتمان زئی روانہ ہونا تھا۔ ہم اتمان زئی کے لئے ایک لاری میں بیٹھ گئے۔ جب یہ لاری شاہی باغ سے آگے بڑھی تو ہمارے ایک دوست کی موٹر کار آ پہنچ گئی لاری رکوائی گئی اور ہم لوگ لاری سے نیچے اتر کر موٹر میں سوار ہو گئے۔ موٹر کی اگلی سیٹوں پہ دو خدائی خدمتگار بیٹھے ہوئے تھے۔ وہ موٹر چلا رہے تھے۔ انہوں نے اپنی خوبصورت اور پرکشش سرخ وردیاں پہن رکھی تھیں اور ہماری موٹر پر جھنڈا بھی لہرا رہا تھا۔ میں، دیوداس اور خورشید بہن پچھلی سیٹوں پر بیٹھ گئے۔ جب ہم چارسدہ پہنچے تو ہمیں خبر ملی کہ ہماری اس لاری پر حملہ کرنے کے لئے ایک ڈاکو جو قاضی کے نام سے مشہور تھا، سردریاب کے پل کے قریبی جنگل میں بیٹھا ہوا ہے جب وہ لاری پل کے قریب پہنچی تو اس ڈاکو نے اس پر گولیاں چلائیں۔ اس لاری کو روک کر اس کی تلاشی لی۔ لیکن اسے مایوسی ہوئی۔ اس سانحے میں ڈاکو کی گولی سے ایک مسافر زخمی ہو گیا، جسے ہم نے خود چارسدہ کے ہسپتال میں زیر علاج دیکھا تھا۔ اس سے

بات چیت بھی کی تھی۔

یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ لاری پر ڈاکو کا حملہ ایک سوچی سمجھی اسکیم کے تحت ہوا تھا۔ ڈاکو قاضی کو حکومت کے مشورے سے قلی خاں نے بلایا تھا اور اُسے جنگل میں ہمیں مروا ڈالنے کے لئے ہی تیار کیا تھا۔ ہم پشاور سے تو اُسی لاری میں سوار ہو کر روانہ ہوئے تھے۔ حکومت نے حاکی تھانے کے ذریعے اس ڈاکو کو خبر دی تھی کہ اس لاری میں ہم لوگ سفر کر رہے ہیں۔ یہ تو خدا کا فضل تھا کہ اتفاقاً ہمیں راستے میں اپنے ایک دوست کی کار مل گئی اور ہم لاری سے اُتر کر موٹر میں سوار ہو گئے لیکن اس ڈاکو کو تو یہ اطلاع نہیں مل سکی تھی ہم اس لاری سے راستے میں اُتر گئے ہیں۔ یہی وجہ تھی کہ سرکار کی یہ سازش بکسر ناکام ہو گئی۔ لیکن اس سازش کی ناکامی سے سارا راز عوام پر عیاں ہو گیا اور اس کا نتیجہ یہ ہوا، جیسا کہ میں نے بعد میں سنا تھا کہ وہ ڈاکو قاضی جب آفریدیوں میں پہنچا تو آفریدیوں نے اُسے محض اس وجہ سے قتل کر ڈالا کہ انہیں معلوم ہو گیا تھا کہ اُس نے ہمیں قتل کرنے کی مذموم کوشش کی تھی۔ آفریدیوں کے نزدیک قاضی کی یہ حرکت پشتونولی (پٹھانی روایات) کے سراسر خلاف تھی۔ اُن کو غصہ تھا کہ اگر اس سانحے میں مہاتما گاندھی کے فرزند کا قتل ہو جاتا تو اس سے پشتونوں کی بدنامی ہندوستان بھر میں ہوتی، جو انہیں برداشت نہیں تھی۔ خیر ہم بخیر و عافیت اپنی منزل پر پہنچے اور اس کے بعد دیوداس نے ہمارے سارے علاقے کا دورہ کیا اور ہم نے انہیں سب کچھ دکھایا اور وہ سمجھ گئے کہ قومی کام کرنے کی وجہ سے ہی انگریز ہم سے ناراض اور مغلوب الغضب تھے۔

اس زمانے میں ہمارے صوبے میں مسلم لیگ کا وجود نہیں تھا۔ انگریزوں کو ہماری جماعت کا مقابلہ کرنے کے لئے ایک پارٹی کی ضرورت تھی۔ چنانچہ ہمارے مقابلے کے لئے انگریزوں نے خاکسار پارٹی قائم کر دی۔ اس وقت عنایت اللہ خاں مشرقی پشاور کے گورنمنٹ ہائی سکول کے ہیڈ ماسٹر تھے۔ گورنمنٹ نے انہیں اعتماد میں لے لیا اور اسی کے ذریعے انگریزوں نے ہماری جماعت کے مقابلے کے لئے خاکسار تحریک جاری کی لیکن خدائی

خدمتگار تحریک ملک میں بہت ہردلعزیز تھی۔ اس لئے خاکسار تحریک صوبہ سرحد میں ترقی نہ کر سکی
لیکن ہندوستان کے دیگر حصوں میں جلدی پھیل گئی۔ بعد میں عنایت اللہ خان مشرقی کی کمزوری
اور لکھنؤ میں معافی مانگنے کی وجہ سے یہ تحریک ختم ہوگئی۔ اسی طرح اور تحریکیں بھی ہمارے
صوبے میں جاری ہوئی تھیں لیکن خدائی خدمتگار تحریک کا مقابلہ کوئی دوسری تحریک نہ
کرسکی اور وہ اپنی موت آپ مرگئیں۔

حقیقت یہ تھی کہ ایک طرف تو ہم اپنے صوبے میں خوب کام کرتے تھے اور دوسری
طرف خدائی خدمتگار تحریک صوبہ میں جنگل کی آگ کی طرح پھیلتی جاتی تھی۔ صرف کوہاٹ کے
ضلع میں ہمارے خدائی خدمتگاروں کی تعداد ایک لاکھ تھی۔ انگریز اس کو برداشت نہیں کرسکتے
تھے اور اس فکر میں تھے کہ مجھے گرفتار کرلیں۔ میں پورے زور سے اس لئے کام کر رہا تھا کہ مجھے
علم تھا کہ میں کسی وقت بھی گرفتار کر لیا جاؤں گا، کیونکہ انگریز کوشش کر رہے تھے کہ وہ گاندھی
جی کو میری گرفتاری کے لئے رضامند کرلیں لیکن گاندھی جی اُن کی یہ بات نہیں مانتے تھے۔ اس
معاملے کو لے کر گاندھی جی اور وائسرائے ہند کے مابین کشمکش جاری تھی۔ بالآخر گاندھی جی
بے حد مجبور ہوگئے اور انہوں نے میرے پاس ایک آدمی بھیج دیا کہ میں ان کے (گاندھی جی)
پاس چلا جاؤں۔

ان دنوں گاندھی جی باردولی میں تھے۔ میں باردولی روانہ ہوگیا۔ راستے میں بھوپال
کے ریلوے اسٹیشن پر محمد علی صاحب کے داماد شعیب قریشی نے دیکھ لیا۔ یہ ہمارے ساتھ
خلافت میں کام کرتے تھے۔ اس وقت وہ بھوپال کے نواب کے ساتھ تھے۔ شعیب نے مجھے
وہاں اترنے پر مجبور کیا اور میں ایک رات کے لئے بھوپال میں ٹھہر گیا۔ رات کو انہوں نے مجھے
نواب بھوپال کا مہمان بنا دیا۔ شوکت علی صاحب بھی انہی کے مہمان تھے۔ نواب صاحب نے
تنہائی میں میرے ساتھ طویل گفت و شنید کی اور آخر میں مجھے یہ کہا کہ اگر میری مرضی ہو تو
وہ دونوں وائسرائے کے پاس چلے جائیں گے اُن کے ساتھ ملاقات کریں گے۔ اور نواب صاحب

نے یہ توی اُمید ظاہر کی کہ میں جو کچھ بھی پشتونوں کے لیئے مانگوں گا وائسرائے صاحب ضرور دیدیں گے۔ لیکن میں نے وائسرائے کے پاس جانے سے انکار کر دیا اور میں نے نواب صاحب سے کہہ دیا کہ مجھے اتنا یقین اُن پر نہیں ہے اور دوسرے اس وقت میں باردولی جا رہا ہوں۔

جب باردولی پہنچ گیا تو مہاتما جی سے میں نے گفت و شنید کر لی اور میں نے انہیں کہہ دیا "یہ سب بہانے و حیلہ سازیاں ہیں۔ حقیقت یہ ہے کہ حکومت مجھے کام نہیں کرنے دیتی اور اچھا ہے کہ آپ (گاندھی جی) وائسرائے ہند کو لکھ دیں کہ جن لوگوں نے مجھ پر الزامات لگائے ہیں ان کو وائسرائے ہند بلالیں۔ وہ لوگ، وائسرائے اور آپ (گاندھی جی) کے سامنے میرے خلاف الزامات کے ثبوت پیش کریں۔ آپ دونوں جج بن جائیں اور اگر میرے خلاف ثبوت مل جائے یعنی الزامات ثابت ہو جائیں تو آپ دونوں مجھے جو سزا دیں گے وہ مجھے بسر و چشم منظور ہو گی۔

گاندھی جی نے وائسرائے کو میری یہ تجویز لکھ دی اور اس کے ساتھ دوسری بات یہ لکھی کہ اگر وائسرائے صاحب انہیں اجازت دیں تو وہ خود سرحد جا کر اپنی آنکھوں سے تمام حالات و واقعات دیکھ لیں گے۔ اگر وائسرائے صاحب چاہیں کہ وہ (گاندھی جی) مجھے ساتھ لے کر ان کے پاس شملہ پہنچ جائیں تو ایسا کیا جائے۔

یہ گرمی کا موسم تھا اور ان دنوں وائسرائے شملہ میں تھے۔ کچھ دن مجھے گاندھی جی نے وائسرائے کے جواب کے لئے ٹھہرائے رکھا کہ اسی اثنا میں وائسرائے کی طرف سے جواب یہ ملا کہ مہاتما گاندھی کو مجھے ساتھ لے کر شملہ آنے کی ضرورت نہیں اور نہ ہی موجودہ وقت میں گاندھی جی کا سرحد جانا وائسرائے مناسب سمجھتے ہیں۔ یہ جواب ملنے پر مہاتما جی مان گئے کہ واقعی میری بات سچی تھی۔ وہ سمجھ گئے کہ اب میں جا کر اپنا کام کر سکتا ہوں۔

شملہ میں کانگریس ورکنگ کمیٹی کی میٹنگ تھی میں بھی اس کے لئے گیا تھا۔ دو خدائی خدمتگار بھی میرے ہمراہ تھے۔ گاندھی جی راؤنڈ ٹیبل کانفرنس کے لئے لندن جا رہے تھے۔

اس کے بارے میں کچھ صلاح و مشورہ کرنا تھا۔ گاندھی جی چلے گئے۔ اور ہم لوگ شملہ میں ٹھہر گئے۔ ہمارے ساتھ اسلامیہ کالج کا ایک نوجوان تھا جس کا باپ انٹیلی جنس ڈیپارٹمنٹ کا ایک بڑا افسر تھا۔ اُس نے مجھے سیسل ہوٹل شملہ میں اپنا مہمان بنایا اور میرے ساتھ فیروز خاں نون اور پنجاب کے چند معززین بھی کھانے پر بلائے۔ جب ہم کھانے کے لئے ڈائننگ ہال میں داخل ہو رہے تھے تو میرے ساتھ خدائی خدمتگار بھی تھے۔ وہ بہت خوش شکل نوجوان تھے۔ اُنہوں نے پُر کشش سُرخ وردیاں پہن رکھی تھیں۔ چاروں طرف بہت سے انگریز اور میمیں بیٹھی ہوئی تھیں۔ اُنہوں نے ہمارے سُرخ پوشوں کو جو دیکھا تو انہیں بڑا اشتیاق نگاہوں سے دیکھتے ہی رہ گئے۔ جب ہم نے کھانا کھا لیا تو فیروز خاں نون نے ہم سے شکوہ کیا کہ "آپ پٹھان لوگ کانگریس کے ساتھی ہو گئے ہیں اور ہمیں بڑا بھاری نقصان پہنچایا ہے۔"

میں نے اُن سے کہا کہ اِس میں ہمارا کیا قصور ہے؟ ہم تو پہلے آپ ہی کے پاس آئے تھے جب آپ نے ہمیں صاف جواب دے دیا تو اس کے بعد ہم لوگ کانگریس کے پاس گئے۔ ہم لوگ انگریزوں کی غلامی سے تنگ آ چکے ہیں اور آزادی کے خواہاں ہیں اور اگر آپ لوگ بھی آزادی کے طالب ہیں تو ہم آپ کے ساتھی ہیں۔

فیروز خاں نون نے کہا کہ بہت اچھا ہم آپس میں صلاح و مشورہ کر کے آپ کو اطلاع دیدیں گے لیکن فیروز خاں نون جب سے ایسے غائب ہوئے کہ پھر ۱۹۴۶ء میں پٹنہ کے مقام پر ہی دکھائی دیئے یعنی بہار کے فسادات میں۔

غرض میں شملہ میں تھا۔ ہندوستان کے خارجہ محکمہ کے سکریٹری باول صاحب نے مجھے خط لکھا کہ "اگر آپ مجھ سے ملنے کی تکلیف کر سکیں تو آپ کی بہت بڑی مہربانی ہوگی"

میں نے اُسے جواباً لکھا: "افسوس کہ میں آپ سے نہیں مل سکتا"

اس نے پھر گاندھی جی سے کہا اور گاندھی جی نے مجھ سے پوچھا کہ میں نے باول صاحب کی ملاقات سے کیوں انکار کیا ہے۔ میں نے گاندھی جی سے کہا کہ میں ایک کمزور انسان ہوں۔

پھسلن پر پاؤں نہیں رکھتا۔ ایسا نہ ہو کہ کہیں پھسل جاؤں۔

مہاتما جی بڑے ہنسے اور مجھے کہا "کیا میں انگریزوں سے ملاقات اور گفت و شنید نہیں کرتا؟"

میں نے اُن سے کہا "آپ تو مہاتما ہیں"

قصّہ کوتاہ یہ کہ مہاتما جی نے مجھے مجبور کر دیا اور ان کی دلجوئی کے لئے میں ہاول صاحب سے ملنے چلا گیا۔ ہاول صاحب ہمارے صوبۂ سرحد میں رہ چکے تھے۔ وہ بڑے با اخلاق اور شریف انسان تھے۔ اور ویلی صاحب جو ڈپٹی فارن سیکریٹری تھے مجھ سے خوب واقف تھے۔ جب ہم لوگ باتیں کرنے بیٹھ گئے تو ہاول صاحب نے مجھ سے گلہ کیا اور کہا "ہمارے اور پختونوں کے بہت اچھے تعلقات تھے لیکن پختونوں میں کچھ ایسے لوگ پیدا ہو گئے کہ اُن کی شعلہ بار تقریروں کی وجہ سے ہمارے اور پٹھانوں کے تعلقات خراب ہو گئے"

میں نے اُن سے کہا "شعلہ بار تقریریں کسی کے تعلقات خراب نہیں کرتیں۔ آپ اِنہی ویلی صاحب سے دریافت کیجئے کہ آپ لوگوں نے ہمارے ساتھ کیا کیا ہے؟" اِس کے ساتھ ہی ویلی صاحب سے میں نے کہا "جوان! تم بات نہیں کرتے چپ کیوں ہو، تمہیں تو سب کچھ معلوم ہے۔ تم تو اُن دنوں پشاور کے ڈپٹی کمشنر تھے اور ہمیں تو کانگریس سے تمہیں لوگوں نے ملایا ہے"

ہم نے ابھی اپنی باتیں ختم نہیں کی تھیں کہ ٹیلی فون آ گیا اور ہاول صاحب نے مجھے بتایا کہ "یہ ہوم سیکریٹری ایمرسن صاحب کا ٹیلی فون ہے۔ وہ کہتے ہیں کہ آپ اُن سے مل لیں"

میں نے ہاول صاحب سے کہا کہ "انہوں نے میرے ساتھ وقت مقرر نہیں کیا میں اُن سے نہیں مل سکتا"

ہاول نے پھر انہیں ٹیلی فون کے ذریعے کہا "مہربانی کر کے عبدالغفار خان سے کہیے کہ وہ ایک لمحے کے لئے آپ سے آکر ملیں۔"

ہاول صاحب نے مجھے بتایا کہ اسی راستے میں ایمرسن صاحب کا دفتر ہے اچھا یہ ہوگا کہ چند ایک منٹوں کے لئے اُن سے ملتا جاؤں۔

میں ان (ہاول اور ڈیلی) سے رخصت ہوا اور راستے میں ایمرسن کے پاس چلا گیا۔ میں اُن کے کمرے میں داخل ہوا ہی تھا کہ انہوں نے چھوٹتے ہی مجھ سے پُر رُعب انداز میں کہا "دیکھو، تم نے میرٹھ میں تقریر کی اور اس میں تم نے یہ کہا کہ فرنگی (انگریز) کا چہرہ تو سفید ہے مگر اس کا دل کالا ہے۔ اور اگر تمہاری یہ تقریریں آج میں لندن میں شائع کر دوں تو پھر امید نہیں ہے کہ انگریز تمہیں مراعات دے اور اصلاحات قرار داں کرے۔"

میں نے اسے کہا "میں نے صرف اتنی ہی بات نہیں کہی اور بھی بہت کچھ کہا۔ میری طرف سے آپ کو اجازت ہے کہ آپ میری وہ تمام تقریر اخبارات میں شائع کرا دیں۔ میں نے تو اپنی تقریر میں کہا تھا کہ ہمارے فرنگیوں سے بہت اچھے تعلقات تھے۔ اور ہم تو ان پر عاشق تھے۔ جب ہم کہیں سے اچھی چیز حاصل کر لیتے تھے تو اسے خود نہیں کھاتے تھے۔ اپنی اولاد کو بھی نہیں دیتے تھے بلکہ اسے ان کے پاس لے جاتے تھے کہ وہ (فرنگی یعنی انگریز) ہم سے خوش ہو جائیں، لیکن ہم انہیں خوش نہیں کر سکے اور وہ اصلاحات جو ہندوستان منظور نہیں کرتا تھا انہوں نے ہمیں وہ بھی قرار داں نہیں کیں۔ اسی لئے میں نے یہ کہا تھا کہ ایسا معلوم ہوتا ہے کہ ان کے چہرے تو سفید ہیں لیکن ان کے دل بڑے میلے ہیں۔"

ایمرسن صاحب کی باتیں ایسی نہیں تھیں جیسی کہ ہاول صاحب کی تھیں کیونکہ ایمرسن کی ساری عمر پنجاب میں گزری تھی۔

شملہ میں "سول اینڈ ملٹری گزٹ" اخبار کا ایک نامہ نگار تھا۔ اور اس کا ایک ساتھی تھا۔ وہ میرے پاس اکثر آتے جاتے تھے۔ میری اور وائسرائے کی ملاقات کے بارے میں انہوں نے بڑی غلط فہمیاں پیدا کر دی تھیں اور نامہ نگار نے ایک غلط خبر اپنے اخبار میں شائع کی تھی کہ "سرحد کی تحقیقات کے بارے میں ورکنگ کمیٹی نے عبدالغفار خان کی باتیں نہیں مانی ہیں اس لئے عبدالغفار خاں استعفٰے دیدیں گے"۔ اس خبر نے پنجاب اور صوبۂ سرحد میں ایک بہت بڑا ہنگامہ برپا کیا تھا۔ میں جب لاہور پہنچا تو سر صاحبزادہ عبدالقیوم کا ایک آدمی میرے پاس آیا۔ یہ آدمی خاص طور پر صوبۂ سرحد سے میرے لئے آیا تھا اور اس نے مجھے کہا "مجھے صاحبزادہ صاحب نے خاص طور پر آپ کے پاس بھیجا ہے اور آپ سے انہوں نے کہا ہے کہ خدا کے واسطے کہیں کانگریس کو نہ چھوڑیئے گا اور اگر آپ کانگریس سے علیحدہ ہو گئے تو پھر انگریز ہمیں کچھ بھی نہ دیں گے"۔

میں شملہ سے واپس آیا تو ہمارے بعض ساتھیوں کے دلوں میں انگریزوں نے خوف اور خفگی پیدا کر رکھی تھی اور انہوں نے چھپ چھپ کر میری مخالفت شروع کر رکھی تھی۔ ہمارے بعض ساتھی یہ بات تحریک کے لئے اچھی نہیں سمجھتے تھے۔ انہوں نے ہماری اصلاح کے لئے کوشش کی اور ایسے ساتھیوں نے ہمیں میاں جعفر شاہ کے یہاں اکٹھا کیا اور بہت سی باتوں کے علاوہ میرے مخالفین یہ بات بھی کہتے تھے "ہمارا ہندوؤں پر بھروسہ اور اعتماد نہیں ہے۔ ایسا نہ ہو کہ وہ راؤنڈ ٹیبل کانفرنس میں ہماری حق تلفی کر دیں۔ ہمیں اس بارے میں ایک ایسی قرارداد منظور کرنی چاہیئے"۔

میں نے انہیں کہا "ابھی تک ہمارے ساتھ انہوں نے کوئی بے اعتباری کی بات نہیں کی ہے۔ ایسے وقت میں اس قسم کے مسئلے ہمیں نہیں چھیڑنے چاہئیں۔ اور اگر انہوں نے ہمارے ساتھ کوئی ایسا کام کیا تو پھر ہمیں کسی نے باندھ تو نہیں رکھا ہے۔ میں تم سے وعدہ کرتا ہوں کہ اگر انہوں نے کبھی ایسا کوئی کام کیا تو آپ سب سے آگے ہو جانا اور ہم

سب خدائی خدمتگار آپ کے پیچھے چل پڑیں گے "۔ قصہ کوتاہ یہ کہ ہمارے تمام اختلافات کا فیصلہ ہوگیا۔

سر رلیف گرفتھ ان دنوں صوبہ سرحد کے چیف کمشنر تھے۔ وہ صوبے میں ایک دربار منعقد کرنا چاہتے تھے۔ سر گرفتھ نے مجھے بھی دعوتِ شمولیت دی لیکن میں نے وہ نامنظور کردی۔ اس کے بعد انہوں نے میرے لئے ایک حکم بھیج دیا کہ وہ مجھ سے ملنا چاہتے ہیں لیکن میں نے یہ حکم بھی نہ مانا اور اُن سے ملاقات کرنے کو نہیں گیا۔ اس پر وہ مجبور ہوگئے اور انہوں نے میرے پیچھے پولیس کو بھیج دیا۔ چنانچہ پولیس مجھے چیف کمشنر کے پاس لے گئی۔ اُن سے ملاقات کے دوران ان خطرات کا ذکر آیا جو بقول چیف کمشنر گرفتھ ملک کو پیش تھے۔ چیف کمشنر نے کہا "ہمیں تین خطرات کا سامنا ہے۔ ایک قبائل دوسرا افغانستان اور تیسرا روس "۔

میں نے اُن سے کہا کہ " اگر آپ لوگوں کو واقعی قبائل سے خطرہ ہے اور چاہتے ہیں کہ ان کی اصلاح ہو تو ہم حاضر ہیں کہ آپ سے تعاون اور امداد کریں لیکن شرط یہ ہے کہ آپ لوگ اپنی موجودہ قبائلی پالیسی ترک کردیں اور انہیں دشمن کی نگاہ سے نہیں بلکہ دوست کی نظر سے دیکھنا شروع کردیں اور ایک ایسے پروگرام کو قبائلیوں میں ہماری مدد اور تعاون سے عملی شکل دیں کہ جس سے قبائلیوں کو فائدہ پہنچے "۔

گرفتھ صاحب نے پنسل اور کاغذ لے لیا۔ نوٹ لینے شروع کردیئے اور میں جو کچھ بھی کہتا تھا اسے وہ لکھتے جاتے تھے۔ میں نے اُن سے کہا " آپ لوگ قبائلیوں کی تباہی اور قتل مقاتلے پر جو کچھ خرچ کرتے ہیں اس کے آدھے خرچ سے ان کے لئے گھریلو صنعتیں قائم کردینا چاہئیں تاکہ وہ اپنے لئے آزاد اور باعزت روزی کما سکیں اور وہ صنعت وحرفت اور تجارت سے آشنا ہو جائیں اور قبائلیوں میں ان کے بچوں کی تعلیم کے لئے مدرسے قائم کردیئے جائیں تاکہ ان کی اولاد نئی زندگی کی اہلیت اور

قابلیت اپنے اندر پیدا کرے۔ اُن کے لئے ہسپتال بھی بنا دیئے جانے چاہئیں تاکہ ان کا علاج معالجہ ہو سکے۔ اسی طرح یہ غیرت مند پٹھان پشتون قوم کے کارآمد افراد اور مفید شہری بن جائیں گے۔"

افغانستان سے خطرے کے بارے میں میں نے گرفتھ صاحب سے کہا ـــ "افغانستان سے آپ کو کوئی خطرہ نہیں، کیونکہ ایک تو افغانستان کی حکومتیں ہمیشہ آپ کی دوست ہوتی ہیں، حتیٰ کہ جو حکومت آپ کو ناپسند ہوتی ہے وہ حکومت قائم ہی نہیں رہ سکتی اور دوسری بات یہ ہے کہ ہم پٹھان لوگ آپ کے دوست ہیں۔ وہ بھی آخر ہمارے بھائی اور عزیز ہیں۔ وہ بھی خواہ مخواہ آپ کے دوست بنے رہیں گے۔ رہ گیا روس سے خطرے کا سوال ـــ اِس خطرے کے مقابلے کا بہتر طریقہ تو یہ ہے کہ ہمیں ہمارا حق دیدیا جائے تاکہ یہ ملک ہمارا ہو جائے۔ تو ہم ایک بڑی قوم ہیں، جو دریائے آمو سے لے کر آدھے پنجاب تک پھیلے ہوئے ہیں۔ ہم پر کوئی حملہ نہیں کر سکتا۔ اور اگر کسی کے سینگ میں خواہ مخواہ خارش ہونے لگے گی تو ہم اُس کی خارش کا علاج کرتے ہوئے اپنے ملک کی حفاظت کے لئے اپنی جانوں پر کھیل جائیں گے۔

گرفتھ صاحب نے یہ سب باتیں لکھ لیں اور مجھے کہہ دیا "میں دہلی جا رہا ہوں تاکہ وائسرائے سے یہ باتیں کروں" گرفتھ صاحب کی شکل و صورت اور پیشانی سے معلوم ہوتا تھا کہ ہماری باتوں سے وہ متفق ہیں۔ گرفتھ صاحب نے مجھ سے کہا "اچھا! پھر بھی تو کبھی مجھے ملا کرو گے؟"

میں اُن کے سامنے ہنس پڑا اور کہا "ہاں، لیکن اِس طریقے سے جیسے کہ آج آپ نے میرے ساتھ برتا ہے۔ (یعنی پولیس کے ذریعے)"

انہوں نے کہا "دیکھو، یہ اتنے لوگ میری ملاقات کے لئے آرزومند ہیں اور کئی دنوں سے انتظار کر رہے ہیں اور اِن میں ذرا باہر بیٹھے ہوئے بڑے بڑے خانبہادر

اور خوانین کو تو دیکھو جواب بھی بیٹھے ہوئے ہیں۔ لیکن میں ان سے نہیں ملتا ہوں اور تمہاری منت سماجت کرتا ہوں مگر تم مجھے نہیں ملتے "

میں نے اُن سے ہنس کر کہا "گرفتھ صاحب! یہ لوگ شخصی فائدے کے لئے آپ کا طواف کرتے ہیں۔ میں آپ لوگوں سے کوئی شخصی خواہش نہیں رکھتا کہ ایسی خوشامدیں کر کے اپنے آپ کو تھکاؤں "

گرفتھ صاحب نے میز پر مکہ مار کر کہا "ایک بدقسمت حکومت جو دیانتدار لوگوں کو اپنے سے دور رکھتی ہے اور بددیانت لوگوں سے گھری رہتی ہے۔ اس کا اس کے سوائے اور کیا انجام ہوگا کہ وہ فنا ہو جائے گی۔ خدا انگریز حکومت کی مدد کرے "

میں گرفتھ صاحب سے رخصت ہوا اور وہ وائسرائے ہند سے ملنے دہلی چلے گئے میں اس امید میں تھا کہ اگر خدا کو منظور رہا تو میرے ملک اور ملت کے لئے کچھ ہو جائے گا۔ لیکن کچھ دن بعد گرفتھ صاحب جب وائسرائے سے ملاقات کر کے واپس آگئے تو انہوں نے سب سے پہلے مجھ پر ہاتھ صاف کئے اور ۲۴ دسمبر ۱۹۳۱ء کو مجھے گرفتار کر لیا۔ ہندوستان بھر میں سب سے پہلے مجھے ہی گرفتار کیا گیا۔ حالانکہ ابھی تک گاندھی جی لندن کی گول میز کانفرنس سے بھی واپس نہیں آئے تھے۔ سرحد میں اندھا دھند مارپیٹ شروع ہو گئی اور میرے بعد ہزاروں کی تعداد میں پٹھانوں کو گرفتار کر لیا گیا۔

ہمارے ملک میں ملک کی آزادی کے لئے دو قسم کی تحریکیں شروع ہوئی تھیں۔ ایک پُر تشدد اور دوسری عدم تشدد پر مبنی۔ تشدد کی تحریک پہلے شروع ہوئی تھی۔ اور اس کے چالیس پچاس سال بعد ۱۹۲۹ء میں عدم تشدد کی تحریک شروع ہوئی تھی۔ تشدد کی تحریک کو انگریزوں نے تشدد کے ساتھ بہت جلد دبا دیا تھا۔ لیکن عدم تشدد پر مبنی تحریک کو ناقابلِ بیان مظالم اور قید و بند کے باوجود انگریز نہ دبا سکے۔ تشدد کی

تحریک نے لوگوں میں خطرہ اور بزدلی پیدا کردی تھی اور لوگوں کو بے جرأت اور اخلاقاً کمزور بنا دیا تھا۔ لیکن عدم تشدد کی تحریک نے پٹھانوں کے دلوں سے خطرہ نکال باہر پھینکا اور ان میں بہادری پیدا کردی۔ اس تحریک نے لوگوں کا اخلاق بلند کردیا اور ان میں جرأت پیدا کردی۔ تشدد کی تحریک نے لوگوں کے دلوں میں اس تحریک سے نفرت پیدا کردی۔ اور عدم تشدد کی تحریک نے لوگوں میں باہمی پیار اور محبت پیدا کردی۔ پٹھانوں میں قومیت اور بھائی چارے کی ایک نئی زندگی پیدا کردی اور ان کی شاعری، ان کے ادب، ان کے تمدن اور ان کی معاشرت میں ایک عظیم انقلاب پیدا کردیا۔

حقیقت یہ ہے کہ "تشدد نفرت ہے اور عدم تشدد محبت ہے"۔ اس نفرت کی بڑی وجہ یہ تھی کہ ایک آدمی کسی انگریز کو تو ہلاک کردیا کرتا تھا مگر اس قتل کی سزا انگریز صرف اسی آدمی (قاتل) کو نہیں دیتے تھے بلکہ اس سے متعلقہ گاؤں اور سارے علاقے کو اجتماعی جرمانہ اور قید کی سزا دیا کرتے تھے۔ لوگوں کی نگاہ میں اس تمام ظلم اور زیادتی کا سبب وہ آدمی (انگریز کا قاتل) اور اس کی پُر تشدد تحریک تھی۔ اس وجہ سے لوگ یہ خیال کرتے تھے کہ اُن کی یہ سب مصیبتیں اس آدمی اور اسی تحریک کی وجہ سے ہیں۔ لیکن ہماری عدم تشدد پر مبنی تحریک میں تو ہر آدمی تکلیف کا خیر مقدم کرتا تھا۔ اس سے قوم کو کوئی نقصان نہیں پہنچتا تھا، فائدہ ضرور ہوتا تھا۔ یہی وجہ تھی کہ لوگوں میں اس تحریک کے تئیں ہمدردی اور محبت پیدا ہوگئی تھی۔ لہٰذا تشدد کی تحریک اپنے مقصد میں ناکام ہوگئی اور یہ عدم تشدد کی تحریک اپنے مقصد میں کامیاب ہوگئی۔ اس نے ملک کو آزاد کرا لیا اور انگریزوں کو اپنے ملک سے باہر نکال دیا۔

خدائی خدمتگار تحریک صرف سیاسی تحریک نہیں ہے۔ یہ تحریک پٹھانوں کی سیاسی، مجلسی، اقتصادی اور روحانی تحریک ہے۔ اسی تحریک کی بدولت پٹھانوں میں پریم، پیار، محبت، بھائی چارہ، یگانگت اور قوم پروری کا احساس اور خدمت کے

جذبات پیدا ہوئے ہیں۔ اس تحریک نے پٹھان قوم کو دوسرا بڑا فائدہ یہ پہنچایا ہے کہ چونکہ پشتون کا تمام تر تشدد اپنے بھائی کے خلاف تھا اور تشدد کے ہاتھوں ان کا گھر برباد تھا۔ عدم تشدد نے اسے آباد و شاداب بنا دیا۔ انگریز کہا کرتے تھے "عدم تشدد کے کاربند پٹھان تشدد کے دیوانے پٹھانوں سے زیادہ خطرناک ہیں" اور یہی وجہ تھی کہ ۱۹۳۲ء میں انگریزوں نے ہم پر بے شمار مظالم کئے! جبر و استبداد اور قیدوں کے علاوہ ایسے شرمناک کام بھی اس غرض سے کئے ہیں کہ پٹھان لوگ تشدد پر آمادہ ہو جائیں۔ لیکن انہیں اس کمینہ مقصد میں کامیابی حاصل نہ ہوئی۔ اس ظلم اور ناروا سلوک کی چند مثالیں بیان کر دینا بیجا نہیں ہوگا۔

انگریزوں نے پٹھانوں کی شلواریں اتاریں۔ پٹھانوں کو ننگا کیا۔ چارسدہ کی پکٹنگ میں تو انہوں نے خدائی خدمتگاروں کے تمام کپڑے اتار لئے اور اُن کے خایوں یعنی فوطوں میں پھندے ڈالے گئے۔ پھندوں اور رسیوں کے ذریعے خدائی خدمتگاروں کے خایوں کو کھینچا جاتا تھا۔ جب وہ بیہوش ہو جاتے تھے تو انہیں ٹٹی پیشاب سے بھرے ہوئے ناندیں پھینک دیتے تھے۔ اور اس میں انہیں غوطے دیتے تھے۔ یہ تو میں نے بطور مثال آپ کے سامنے صرف چارسدہ کا ایک واقعہ بیان کیا ہے۔ اسی طرح کے انتہائی شرمناک ناقابلِ بیان مظالم ہمارے صوبے میں انگریز نے روا رکھے کرہاٹ میں ہمارے خدائی خدمتگاروں کو سرکاری آدمی پکڑ لیتے تھے اور انہیں پوس ماگھ کے مہینوں میں ہڈیوں کو کڑکڑا دینے والی سردی میں ٹھنڈے پانی کے اندر غوطے دیتے تھے۔ گولیوں سے خدائی خدمتگاروں کو اڑا دینا تو سرکار کا ایک شغل تھا۔ خدائی خدمتگار تحریک کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ صرف ہری پور کے ایک ہی جیلخانے میں دس بارہ ہزار خدائی خدمتگار قیدی تھے اور اتنی سخت سردی میں ان قیدیوں کو صرف ایک ایک کمبل اور ایک ایک چپاتی دی جاتی تھی۔ وہ بھی کسی کو ملتی تھی اور کسی

کو نہیں ملتی تھی۔ بہت معزز اور تعلیم یافتہ قیدیوں کو بید وں سے پیٹا گیا، اُن سے چکیاں پسوائی گئیں اور گھانیوں میں باندھا گیا یعنی اُن سے کولہو چلوائے گئے۔ اور انہیں قیدِ تنہائی کی کوٹھریوں میں بند کیا گیا۔ قصّہ کوتاہ یہ ہے کہ ایسا کوئی ظلم نہیں تھا جو ان غریبوں پر نہ توڑا گیا ہو۔

۲۴ دسمبر ۱۹۳۱ء کو میں ڈاکٹر خان صاحب کے بنگلے میں تھا۔ بہت زیادہ کام کرنے کی وجہ سے میں بیمار ہو گیا تھا۔ آدھی رات کا وقت تھا کہ پولیس نے آکر مجھے گرفتار کر لیا اور میرے ساتھ ڈاکٹر صاحب کو بھی پکڑ لیا۔ ہمیں موٹر میں بٹھایا گیا اور اٹک کے پل پر پہنچا دیا گیا۔ تھوڑی دیر کے بعد قاضی عطاء اللہ اور سعد اللہ کو بھی گرفتار کر کے وہاں لے آئے۔ سعد اللہ ڈاکٹر خان کا بڑا فرزند تھا اور انجینیر تھا اور ابھی ابھی انگلینڈ سے آیا تھا۔ وہاں ایک اسپیشل ٹرین کھڑی تھی۔ ہم سب کو اس میں بٹھا دیا گیا اور گاڑی روانہ ہوئی۔ ہمارے ساتھ ایک سردار خیل کابلی انسپکٹر پولیس تھا۔ وہ قاضی صاحب کا بھی واقف تھا۔ انسپکٹر صاحب نے بتایا کہ انہیں ڈاکٹر صاحب نے موت کے منہ سے بچایا تھا۔ دوسرا ہمارے ساتھ ایک پنجابی انسپکٹر تھا۔

میرا تو ہمیشہ یہ قاعدہ رہا ہے کہ جب میں گرفتار کر لیا جاتا ہوں اور جو پولیس میرے ساتھ ہوتی ہے، میں اُن سے کوئی بات نہیں پوچھتا اور نہ ہی اُن سے کچھ مانگتا ہوں۔ قاضی صاحب نے اس پشتون افسر سے اخبار مانگ لیا، لیکن وہ اسے ڈر کے مارے کب دیتا تھا۔ پنجابی انسپکٹر کا یہ کام تھا کہ جب کبھی ہم ڈبے کی کھڑکی کھول لیتے تھے تو یہ اُسے فوراً بند کر دیتا تھا تاکہ ہمیں کوئی دیکھ نہ لے۔ آخر میں نے اس سے کہا کہ "ارے لڑکے! ہم عورتیں تو نہیں ہیں کہ تم یہ کھڑکیاں بند کرتے ہو اور تمہاری یہ کوشش ہوتی ہے کہ ہمیں کوئی دیکھ نہ لے"۔ لیکن وہ بڑا بے شرم تھا۔

جب ہمارا ڈبہ یوپی (اتر پردیش) میں پہنچ گیا تو یہاں سرحدی پولیس سے ہمارا

چارج لینے کے لئے ایک انگریز افسر بہمراہ ایک گورا سارجنٹ آیا ہوا تھا۔ وہ انگریز میرے پاس آیا۔ اس نے میرے ڈبّے کا دروازہ کھول دیا اور مجھے کہا: "آؤ باہر آکر اسٹیشن پر اپنے پاؤں آزاد کرنے کے لئے ٹہلو۔"

اب اس انگریز اور ان مسلمان افسروں کے رویئے میں فرق کا اندازہ کیجئے۔ حالانکہ اول الذکر (انگریزوں) سے ہماری جنگ تھی۔ ان سے ہم حکومت لے رہے تھے اور وہ حکومت اپنی اپنے بھائیوں کے لئے حاصل کرنا چاہتے تھے۔ میں ڈبے میں بیٹھا ہوا تھا کہ اس اثناء میں وہی انگریز آیا۔ اس کے ہاتھ میں گلاس تھا اور اس میں شراب تھی۔ اس نے بڑے پیار و محبت سے مجھے پیش کی اور کہا کہ اسے پی لو۔ میں نے جواب دیا کہ میں شراب نہیں پیتا۔ یہ بات سن کر وہ بہت حیران ہوا۔ میں اس کی یہ رواداری اور پریم کبھی نہیں بھلا سکا۔

جب ہم الہ آباد پہنچے تو یہاں ڈاکٹر خان صاحب کو اتار لیا گیا اور انہیں نینی جیل میں بھیج دیا گیا۔ جب گاڑی تھوڑی اور آگے بڑھی تو سعد اللہ خان کو ہم سے علیحدہ کر لیا گیا اور اُسے بنارس جیل پہنچا دیا گیا۔ پھر بہار کا صوبہ شروع ہو گیا اور بہار میں قاضی عطاء اللہ کو ہم سے علیحدہ کر لیا گیا اور انہیں گیا کے جیل لے جایا گیا۔ اور مجھے ہزاری باغ کے جیل خانے میں لے جایا گیا۔ ہزاری باغ جیل اسٹیشن سے چالیس میل دور ہے۔ مجھے جب موٹر میں بٹھایا گیا تو میرے ساتھ پشاور کا سردار خیل انسپکٹر اور دو انگریز افسر بھی بیٹھ گئے ایک ڈپٹی کمشنر تھا اور دوسرا سپرنٹنڈنٹ پولیس تھا۔ ہمارے بیٹھتے ہی انہوں نے مجھے انگریزی کا ایک اخبار پڑھنے کو دیا۔ وہی اخبار جو ہمارا سردار خیل انسپکٹر اپنے دوست اور محسن کو نہیں دیتا تھا، جس نے اُس کے اپنے قول کے مطابق اسے مردہ سے زندہ کر دیا تھا۔

جب میں جیل خانے میں داخل ہوا تو جیل خانے کے اس افسر نے جو ہندو تھا میرے پاس آکر مجھ سے پوچھا: "یہ پولیس افسر (سردار خیل) کون ہے اور کس جگہ کا رہنے والا ہے؟"

میں نے اُن سے پوچھا "یہ آپ کیوں دریافت کرنا چاہتے ہیں؟"

انہوں نے مجھے بتایا کہ "یہ تو ایک بہت رذیل انسان ہے۔ مجھے کہتا تھا کہ اس آدمی کا خوب خیال کرنا۔ یہ بہت ہی خطرناک آدمی ہے"

مجھے ایک بارک میں تنِ تنہا بند کر دیا گیا۔ اور بڑے صاحب اور چھوٹے صاحب کے بغیر اور کسی کو میرے پاس آنے یا مجھ سے ملنے کی اجازت نہیں تھی۔ میں شاہی قیدی تھا۔

کلکٹر ہر مہینے میرے پاس آتا تھا۔ میں ہمیشہ تنہائی میں بیمار پڑ جاتا ہوں۔ آہستہ آہستہ میری صحت گرنے لگی۔ وہ کلکٹر بڑا اچھا آدمی تھا۔ اس نے حکومت کو لکھا کہ گیا میں میرا جو ساتھی ہے اُسے میرے ساتھ بھیج دیا جائے۔ قاضی صاحب گیا میں تھے۔ وہ بھی تنہائی میں تھے اور مجھے تو پھر بھی تھوڑی بہت نیند آجاتی تھی۔ لیکن اُس بیچارے کو تو بالکل نیند نہیں آتی تھی۔ میری طرح سے وہ بھی حکومت کی آنکھوں میں کانٹا تھے۔ کلکٹر کی اس سفارش کی حکومت نے مخالفت کی اور ان کی بجائے حکومت نے میرے پاس ڈاکٹر خان صاحب کو بھیج دیا۔ جب ڈاکٹر صاحب آگئے اور انہوں نے یہ دیکھا کہ مجھے تو ہمیشہ اس بارک میں بند رکھا جاتا ہے اور وہ مینی جیل میں باہر پھرا کرتے تھے۔

ہزاری باغ کے اس جیل کا سپرنٹنڈنٹ ایک پنجابی تھا اور وہ ڈاکٹر صاحب کے ساتھ جنگ یورپ میں کہیں ایک ہی جگہ رہا تھا۔ مگر بڑا بزدل تھا۔ ڈاکٹر صاحب جب کبھی باہر ٹہلنے کی بات کرتے تو وہ کہا کرتا "نا بھائی میں مارا جاؤں گا" لیکن ڈاکٹر صاحب اس بات پر اڑے ہوئے تھے۔ بالآخر اس نے ہمیں جنگلے کے باہر سے باہر جانے کی اجازت دے ہی دی۔ اس کے بعد جب ہمیں پتہ لگ گیا کہ اس جیل خانے میں تو راجندر پرشاد، آچاریہ کرپلانی اور بہار کے دیگر بہت سے قیدی ہیں تو ہم کبھی کبھی ان سے ملنے لگے۔

بہار کے لوگ بہت اچھے اور شریف انسان ہیں۔ جب ہمیں اجازت مل گئی تو ہم کبھی کبھار جیل خانے میں گھوما پھرا کرتے تھے اور ان دوسرے قیدیوں سے بھی ملتے تھے اور

ہمارے اُن سے تعلقات بھی قائم ہو گئے۔ ہمارے جیل خانے کا افسر جسے چھوٹا صاحب کہتے تھے بڑا اچھا آدمی تھا اور قوم پرستوں سے بڑی ہمدردی رکھتا تھا۔ اس کے ساتھ ہم نے یہ طے کر لیا کہ جو سیاسی قیدی کل کو رہا ہو گا اُسے آج (ایک دن پہلے) شام کو ہمارے پاس بھیج دیا کرے۔ چنانچہ جو بھی سیاسی قیدی رہا ہوتا تھا اُسے ہم چائے پارٹی دیا کرتے تھے۔ بہار کے لوگ ویسے تو بہت اچھے ہیں، مگر ان میں چھوت چھات بہت زیادہ ہے۔ لیکن ایک ساتھ رہنے کی وجہ سے ان کی چھوت چھات میں بڑی کمی آ گئی۔ اور ان کی بہت سی اصلاح ہو گئی۔

ایک دن ایک شخص کو چائے پارٹی پر ہم نے اپنا مہمان بنایا۔ جب چائے آ گئی تو چائے کے ساتھ پکوڑے اور تلے ہوئے بینگن بھی تھے۔ میں مہمان کے لئے پیالی میں چائے ڈالتا تھا اور پیالی اس کے ہاتھ میں پکڑا تا تھا اور پھر میں پکوڑے اٹھاتا تھا اور اُسے دے دیتا تھا۔ ڈاکٹر صاحب بینگن اُٹھا کر اُسے دیتے تھے۔ وہ چائے پیتا تھا اور پکوڑے کھاتا تھا جب چائے ختم ہو گئی تو وہ ہنسنے لگا میں نے جب اس سے دریافت کیا کہ یہ ہنسی آسے کس بات پر آئی تو اس نے کہا کہ ہم میں اتنی چھوت چھات تھی کہ ایک دن ایک مسلمان پوسٹ مین آیا تھا۔ اُس نے مجھے میرا ایک پوسٹ کارڈ دیا تھا۔ پوسٹ مین سے کارڈ لیتے وقت میں نے اس کارڈ کو اپنی انگلیوں میں ایک کونے سے پکڑا۔ دوسرا کونا مسلمان پوسٹ مین کے ہاتھ میں تھا۔ اس وقت میرا بھائی پاس کھڑا تھا۔ اس نے مجھ پر پانی ڈالا اور کہا کہ تو بھرشٹ (ناپاک) ہو گیا ہے۔

بہار کے رہنماؤں سے مجھے محبت تھی۔ میں ان کی وہ محبت اپنے دل سے نہیں نکال سکوں گا۔ بہار کے عورت مرد دونوں بڑے بہادر ہیں اور انہوں نے ملک کی آزادی کے لئے بڑی قربانیاں کی ہیں۔ مردوں کو تو چھوڑ دیجئے۔ میں آپ کو ایک عورت کی کہانی سناتا ہوں۔ یہ خاتون ہمارے ساتھ جیل خانے میں قید تھی۔ ایک دن چھوٹا صاحب آیا اور

اس نے مجھے اس عورت کا قصہ سنایا۔ اُس نے مجھے بتایا۔ آج اس جیل خانے میں ایک عورت کا خاوند جو وکیل ہے اس سے ملاقات کے لئے آیا تھا۔ اس کے ہمراہ پانچ بچے بھی تھے۔ ملاقات کے دوران اُس نے اپنی عورت کی بڑی منت سماجت کی کہ یہ جو دو چھوٹے بچے ہیں یہ وہ لے اور یہ تین اس کے پاس رہیں گے یعنی دو وہ عورت اور بڑے تین بچے وہ اپنے پاس رکھے گا۔

عورت نے خاوند کو جواب دیا "سب بچے تم ہی رکھو گے میں تو انہیں اپنے پاس رکھنا چاہتی تھی تم ہی نے میری بات نہیں مانی تھی۔ اب میں انہیں نہیں رکھوں گی۔"

چھوٹے صاحب نے کہا "میں نے اس عورت سے پوچھا کہ ان بچوں کو تم کیوں نہیں رکھتیں؟" اُس نے جواب دیا "جب کانگریس نے جنگ کا بگل بجایا تھا تو میں نے اپنے خاوند سے کہا تھا کہ یہ ملک و قوم کی جنگ ہے۔ لوگ جا رہے ہیں تم بھی چلے جاؤ۔ لیکن اس نے یہ کہہ کر انکار کر دیا تھا کہ اس نے ایک دو مقدمے عدالت میں دائر کر رکھے ہیں وہ مقدمے جب ختم کر لے گا تو وہ اس جنگ میں حصہ لے گا۔ کچھ دن کے بعد میں نے اس سے پوچھا کہ کیا وہ مقدمے ختم ہو گئے ہیں یا ابھی باقی ہیں؟ اس نے جواب دیا تھا کہ نہیں تھوڑے سے رہ گئے ہیں۔ کچھ دن کے بعد پھر میں نے اس سے پوچھا تو اس نے مجھے کچھ گول مول سا جواب دیا تب میں سمجھ گئی کہ یہ جیل جانے کے لئے تیار نہیں ہے تو میں خود چلی گئی۔ پکٹنگ پر کھڑی ہو گئی۔ مجھے گرفتار کر کے اس جیل میں قید کر دیا گیا۔"

اس جیل خانے میں راجندر بابو اور ان کی ہمشیرہ بھی قید تھیں۔ اسی طرح سے بہت سی عورتیں اور مرد اسی جیل خانے میں ہمارے ساتھ قید تھے۔ جس قوم کی عورتیں اور مرد اپنے ملک کی آزادی کے لئے کمر کس لیتے ہیں وہی اپنی منزلِ مقصود پر پہنچتی ہے۔ یہی وجہ تھی کہ انگریز مجبور ہو گئے کہ وہ چلے جائیں۔ لہٰذا انہوں نے ہمارا ملک ہمارے حوالے کر دیا۔

تین سال کے بعد جب ہم ہزاری باغ جیل سے رہا ہوئے تو ہم اس عورت کے مہمان بنے۔ میں شاہی قیدی تھا۔ میرے بچوں کو الاؤنس نہیں دیا جاتا تھا۔ حالانکہ ڈاکٹر خان صاحب اللہ قاضی صاحب کے بچوں اور ان کے گھر کے دوسرے آدمیوں کو الاؤنس دیا جاتا تھا اور سعد اللہ کی ماں کو بھی الاؤنس ملتا تھا، لیکن میرے بچوں کو نہیں دیا جاتا تھا۔ اس کا نتیجہ یہ ہوا کہ غنی پیسوں کی کمی کی وجہ سے امریکہ سے واپس آگیا اور اپنی تعلیم کو تکمیل تک نہ پہنچا سکا۔ میری اپنی جائیداد بھی بہت تھی۔ کیونکہ ہم تو سب قید ہو گئے تھے۔ ہمارا کوئی رہا نہیں تھا اور حکومت کے اشارے پر ہمارے کاشتکاروں یعنی زرعی مزدوروں نے ہمارا مال خرد برد کر دیا تھا۔ تقریباً تین سال کے بعد ہمیں رہا کیا گیا لیکن صوبہ سرحد اور پنجاب میں ہمارا داخلہ بند کر دیا گیا۔ ہمیں کہہ دیا گیا کہ ہم لوگ ہندوستان بھر میں چل پھر سکتے ہیں لیکن پنجاب اور سرحد میں نہیں جا سکتے۔

بہار میں ہمارے بہت سے سیاسی قیدی دوست بن گئے تھے۔ ہم ہزاری باغ سے پٹنہ چلے گئے۔ راجندر پرشاد اور دوسرے دوستوں سے ملنے کے بعد ہم واردھا گئے۔ واردھا میں گاندھی جی تھے۔ انہوں نے اور سیٹھ جمنا لال جی بجاج دونوں نے ہمیں وہاں آنے اور رہنے کی دعوت دی تھی۔ ہم وہاں چلے گئے۔ ۱۹۳۴ء میں بمبئی آل انڈیا کانگریس کمیٹی کا اجلاس تھا۔ ہمارے واردھا پہنچنے کی اطلاع جب سارے کانگریسی حلقوں میں پہنچ گئی تو استقبالیہ کمیٹی نے یہ فیصلہ کیا کہ باچا خان یعنی مجھ کو اس کانگریس کا صدر بنایا جائے اور راجندر پرشاد نے مجھے تار بھی دے دیا کہ مجھے صدارت کے لئے منتخب کر لیا گیا ہے اور وہ استعفیٰ دیتے ہیں اور مجھے اپنی جگہ پر صدر مقرر کرتے ہیں، لیکن میں نے یہ بات منظور نہ کی اور تار کے ذریعے انہیں اطلاع دے دی کہ "میں ایک سپاہی ہوں، خدائی خدمتگار ہوں۔ میں خدائی خدمتگاری کروں گا"۔ کچھ دنوں کے بعد ہم واردھا سے کلکتہ چلے گئے۔ وہاں کی کارپوریشن نے ہمیں استقبالیہ ایڈریس پیش

کیا۔ میرا یہ خیال تھا کہ اس صوبہ میں مسلمانوں کی آبادی زیادہ ہے اور سیاسی طور پروہ پسماندہ ہیں لہٰذا میں ان کی خدمت کروں گا۔ میں نے کلکتہ میں مختلف جگہوں پر چند تقریریں کیں اور مسلمانوں پر یہ بات واضح کی کہ میں یہاں تمہاری خدمت کے لئے آیا ہوں۔ میں دیہات میں کام کرنا چاہتا تھا۔ کیونکہ مصیبت دیہات میں ہوا کرتی ہے۔ اور مصیبت زدہ لوگ بھی دیہاتوں میں بستے ہیں۔ کلکتہ میں مسلمانوں کی ایک مجلس تھی۔ سہروردی بھی اسی مجلس کے ممبر تھے اور انہیں کے قماش کے دیگر مسلمان بھی اس میں تھے ان لوگوں نے میری امداد تو درکنار اُلٹی سر توڑ کوشش کی کہ میں دیہات میں نہ جا سکوں کیونکہ اس سے ان کی لیڈری میں فرق پڑتا تھا۔ جب میں ان مسلمانوں سے بالکل مایوس ہو گیا تو پروفیسر نرپھل گھوش نے جو میرے دوست تھے اور ورکنگ کمیٹی کے ممبر بھی تھے مجھ سے کہا کہ وہ میرے ساتھ دیہات میں جائیں گے اور کہ یہ مسلمان تو مردہ ہیں۔ مجھے بنگال کے آدمی کی اس لئے ضرورت تھی کہ دیہات کے لوگ سوائے بنگالی زبان کے دوسری کسی زبان کو نہیں سمجھتے تھے اور میں بنگالی نہیں جانتا تھا۔

پرپھل بابو اور میں دیہات کے دورے پر چل پڑے۔ ہم جس گاؤں میں بھی جاتے وہاں میں اپنے طریقے پر کام شروع کرتا۔ میں لوگوں سے ملتا، اُن سے بات چیت کرتا، انہیں میں یہ سمجھاتا کہ ہندوستان سونے کا دیش تھا۔ ہر گھر میں دودھ اور گھی کی افراط تھی۔ چاول عام تھے۔ لیکن اب یہ کیا ہو گیا ہے کہ ہمارے بچے بھوکے پیاسے ننگے بدحال اور خوار و زار ہیں۔ وہ غریب میری باتیں بڑے غور و خوض سے سنتے تھے۔ آخر میں ہم انہیں یہ کہا کرتے تھے کہ جب تک یہ ملک آزاد نہیں ہوتا اور اس ملک کی باگ ڈور تمہارے ہاتھوں میں نہیں آتی تب تک تم اور تمہارے بچے پیٹ بھر کر کبھی نہیں کھا سکیں گے۔

اسی طرح جب ہم نے کچھ دن لوگوں میں گھوم پھر لیا تو ہم نے ایک جگہ جلسہ منعقد

کردیا۔ ہمارے اس پہلے جلسے میں پچاس ساٹھ آدمی جمع ہوئے تھے۔ کچھ دنوں کے بعد جب ہم نے دوسرا جلسہ کیا تو اس میں دو سو لوگ اکٹھے ہو گئے تھے اور اسی طرح بتدریج جلسوں میں لوگوں کی تعداد بڑھتی جاتی تھی۔ اس اثناء میں بمبئی کانگریس کا وقت قریب آ گیا اور ہم بمبئی چلے گئے۔ جانے سے پہلے میں نے پرچل بابو سے کہہ دیا کہ یہ لوگ مُردے نہیں ہیں، مگر انہیں زندہ کرنے والا کوئی نہیں ہے

بمبئی کے کانگریس اجلاس میں وہاں کی کرسچین سوسائٹی کے چند آدمی میرے پاس کانگریس پنڈال میں آئے اور مجھے دعوت دی میں ان کی سوسائٹی میں گیا۔ انہوں نے مجھ سے خدائی خدمتگاری کے بارے میں پوچھا۔ میں نے ان سے خدائی خدمتگاری کا سارا قصہ بیان کیا اور ہمارے ساتھ جو بیتی تھی وہ بھی میں نے انہیں سب سنا دی۔ مجھے اس وقت تک یہ معلوم نہیں تھا کہ سچ بولنا بھی انگریزوں کے قانون میں جُرم ہے۔ جب کانگریس کا اجلاس ختم ہو گیا اور ہم واپس وردھا چلے آئے اور بنگال جانے کا پروگرام بنا لیا اور یہ بھی فیصلہ کر لیا کہ وہاں میں اتنے دن تک کام کرتا رہوں گا کہ جب تک مجھے اپنے صوبے میں واپس جانے کی اجازت نہیں مل جاتی۔

میرے اس ارادے کا پتہ جب حکومت کو لگ گیا تو اس کے من چھتا کا بیٹا کہ بنگال کے ہندو تو پہلے ہی سے بیدار ہیں اور اگر یہ مسلمان بھی جاگ پڑے تو پھر وہ ان کی چوری نہیں کر سکے گی اور اس کی خیر بھی نہیں ہو گی۔ پھر کیا تھا۔ پولیس آ گئی۔ مجھے گرفتار کر لیا گیا۔ میں نے بمبئی میں جو تقریر کی تھی اس کی پاداش میں مجھے دو سال قید سخت کی سزا ہو گئی۔ پہلے مجھے بمبئی کے جیل خانے میں بند کیا گیا۔ پھر وہاں سے سابرمتی جیل میں منتقل کر دیا گیا۔ اس جگہ کا ایک انگریز سپرنٹنڈنٹ بڑا سخت مزاج تھا۔ مجھے اُس نے اکیلے ایک وارڈ میں بند کر دیا۔ اس وارڈ میں نمبردار کو بھی اندر آنے کی

اجازت نہیں تھی۔ وہ وارڈ کا دروازہ باہر سے تالا لگا کر بند رکھتا تھا اور باہر ہی بیٹھا رہتا تھا۔ اس جگہ کی خوراک اور ہماری خوراک میں بڑا فرق تھا۔ مجھے بی کلاس دی گئی تھی۔ لیکن اس صوبے کی بی کلاس اور ہمارے یہاں کی سی کلاس میں کوئی فرق نہیں تھا۔ یہاں بی کلاس کے لئے چارپائی نہیں تھی۔ میں فرش پہ سویا کرتا تھا۔ میرے ساتھ کوئی بات کرنے والا نہیں تھا۔ یہاں بندر بہت تھے۔ میں انہی بندروں سے کھیلا کرتا تھا۔ بالآخر جب میں بہت سخت بیمار پڑ گیا۔ مجھے انفلوئنزہ ہو گیا۔ لیکن باوجود اتنی سخت بیماری کے مجھے ہسپتال نہیں لے جایا گیا۔ یہاں تک کہ وارڈ میں بھی مجھے چارپائی نہ دی گئی۔ میں سیمنٹ کے فرش پر پڑا رہتا تھا۔ لیکن خدا نے اپنی مہربانی سے مجھے صحت یاب کر دیا۔

کچھ مدت کے بعد صوفیہ میری ملاقات کے لئے آئی۔ اس کے بعد گاندھی جی بھی تشریف لائے اور ان کی کوشش سے کچھ عرصے کے بعد مجھے اے کلاس دے دی گئی۔ میرا کھانا بنانے والا کوئی نہیں تھا۔ اس دوران جیل خانہ جات کا جرنیل دورے پر آ گیا اور جب وہ میرے پاس پہنچا تو میں نے اس سے دو مطالبے کئے۔ ایک یہ کہ بمبئی میں میرا ایک باورچی تھا۔ یہاں میرا باورچی نہیں ہے لہٰذا مجھے وہ باورچی منگوا دیا جائے اور دوسرا یہ کہ اس جگہ کی آب و ہوا مجھے موافق نہیں ہے لہٰذا مجھے کسی اور جگہ بھیج دیا جائے۔ جرنیل بہت شریف آدمی تھا۔ صوبہ سرحد میں بھی رہ چکا تھا۔ اس نے مجھے کہا کہ وہ مجھے پنجاب کو منتقل کر دیتا ہے۔ اور میرے لئے پشاور سے پشتون باورچی منگوا دیتا ہے۔ میں نے اسے بہت کہا کہ پنجاب مجھے لینے کے لئے تیار نہیں ہے اور میں وہی بمبئی والا اپنا باورچی مانگتا ہوں پشاوری باورچی نہیں چاہیے۔ اس کا خیال تو نیک تھا وہ یہ سمجھتا تھا کہ اگر مجھے پنجاب بھیج دیا جائے گا تو میں گھر کے نزدیک ہو جاؤں گا اور جب میرے

لئے پٹھان باورچی آجائے گا تو اُسے مجھ سے ہمدردی ہوگی اور وہ میری خدمت بڑی اچھی طرح کرے گا۔ اس نے کوشش کی۔ لیکن پنجاب نے تو مجھے لینے سے انکار کر دیا اور پشاور سے جیل والوں نے ایک ایسا آدمی بھیج دیا جو کھانا پکانا تو جانتا نہیں تھا لیکن ٹی بی کا مریض تھا۔ اسے بھیجنے سے ان کا مطلب یہ تھا کہ یہ جو میرے ساتھ رہے گا تو مجھے بھی ٹی بی ہو جائے گی۔

مجھے احمد آباد کے سابرمتی جیل سے ڈسٹرکٹ جیل بریلی میں بھیج دیا گیا۔ بریلی میں سنٹرل جیل بھی تھا اور اس میں سیاسی قیدی بھی تھے۔ اگر مجھے وہاں منتقل کیا ہوتا تو مجھے آرام رہتا۔ لیکن وہ تو مجھے تکلیف دینا چاہتے تھے۔ اس طرح میری قید و بند کا دور چلتا رہا۔

ایک دن آیا کہ ڈاکٹر خان صاحب جب سنٹرل اسمبلی کے ممبر منتخب ہو گئے تب اُنہیں صوبہ سرحد جانے کی اجازت مل گئی۔ ڈاکٹر خان اور اُن کی اہلیہ صاحبہ مجھ سے ملنے کے لئے بریلی میں آئے۔ اس جگہ کے جیل خانے کے جیرنیل صاحب بہت اچھے آدمی تھے۔ کرنل سلامت اللہ خان اُن کا نام تھا۔ جب وہ دورہ کرتے ہوئے اس جیل خانے میں آئے تو میں نے اُن کے سامنے باورچی سے نجات دلانے کا مطالبہ رکھا۔ میں نے انہیں بتایا کہ میرا باورچی اصل میں باورچی نہیں ہے ٹی بی کا مریض ہے۔ اُسے میرے پاس اس لئے بھیجا گیا ہے کہ مجھے بھی یہی مرض لگ جائے۔ مجھے باورچی مت دیجئے لیکن اس باورچی سے مجھے خلاصی دلوائیے۔ اسے بھی تکلیف ہے اور مجھے بھی تکلیف ہے۔ جرنیل صاحب نے مہربانی کی اور اُسے اس جگہ سے رخصت کر دیا۔ اس طرح مجھے اس باورچی سے نجات مل گئی۔

یہاں مجھ سے ملاقات کرنے کے لئے رفیع احمد قدوائی بھی آئے تھے جیل خانہ جات کے وزیر صاحب بھی تشریف لائے تھے۔ اس وقت گرمی شروع ہو گئی تھی۔ انہوں

نے لکھا کہ مجھے کسی ٹھنڈی جگہ پر بھیج دیا جائے، لیکن حکومت نے جب تک گرمی رہی مجھے ٹھنڈی جگہ نہ بھیجا اور جب برسات شروع ہوگئی اور لوگ پہاڑوں سے میدانوں کی طرف آرہے تھے تب مجھے الموڑہ بھیج دیا گیا۔ وہاں دو دو تین تین دن تک مسلسل بارش جاری رہتی تھی اور میں بارک سے باہر نہیں نکل سکتا تھا۔ بالآخر میری قید کی میعاد پوری ہوگئی اور رہائی کے وقت مجھے پھر یہ نوٹس مل گیا کہ میں پنجاب اور سرحد میں نہیں جاسکتا۔ لہٰذا میں ۱۹۳۶ء میں پھر واپس وردھا آگیا جب ہمارے صوبے میں صوبائی اسمبلی کے الیکشن ختم ہوگئے تو اگست ۱۹۳۷ء میں اپنے صوبہ میں چلا گیا۔

(۱۶)

۱۹۳۷ء میں سرحد اسمبلی کے الیکشن ہوگئے۔ اس میں اکثریتی پارٹی خدائی خدمتگاروں کی تھی۔ مگر گورنر نے وزارت بنانے کی دعوت سر نواب صاحبزادہ عبدالقیوم کو دی۔ جسے اس کے اپنے حلقے میں خدائی خدمتگاروں کے ہاتھوں شکست فاش کھانی پڑی تھی اور ضلع ہزارہ کے غیر پختون حلقے سے کامیابی حاصل ہوئی تھی۔ حکومت کی امداد سے ہندو، سکھ اور آزاد ممبران کا تعاون اسے حاصل ہوگیا۔ لہٰذا اس نے اپنی وزارت قائم کی لیکن وہ بہت دن چل نہ سکی اور وہ پانچ چھ ماہ کے بعد شکست کھا گئے۔ ۳ ستمبر ۱۹۳۷ء کے دن جب صاحبزادہ صاحب کے خلاف تحریک عدم اعتماد منظور ہوگئی تو ڈاکٹر خان صاحب نے خدائی خدمتگار ممبران کے تعاون سے وزارت بنائی۔ اس وزارت میں قاضی عطاء اللہ صاحب وزیر تعلیم تھے۔ قاضی صاحب نے پرائمری تک اسکولوں میں پشتو تعلیم جاری کرنے کے علاوہ اس زبان کو لازمی قرار دے دیا اور اس وزارت نے لوگوں کی بہبودی کے لئے اور بھی تھوڑے بہت کام کئے تھے۔

اِس وزارت نے سب سے پہلے جو کام کیا وہ یہ تھا کہ پشتو زبان ملک میں رائج کر دی۔ انگریزوں نے اِس زبان سے بڑی بھاری بے انصافی کی تھی ہندستان بھر میں ہندوستانی بچوں کو ابتدائی تعلیم اپنی مادری زبان میں دی جاتی تھی لیکن ایک پشتون قوم تھی کہ اس کے بچے اِس سے محروم کیے گئے تھے۔

اِس وزارت نے ہماری تحریک کو فائدے کی بجائے نقصان پہنچایا۔ کیونکہ دراصل طاقت اور اختیار گورنر کے ہاتھوں میں تھے۔ اور ماتحت افسر نہ تو وزیروں کا حکم مانتے تھے اور نہ ہی وزیروں سے تعاون کرتے تھے۔ وہ گورنر کی آنکھ کے اشارے کی طرف دیکھتے رہتے تھے۔ وہ جیسا اشارہ کرتے ویسا ہی وہ کام کرتے تھے۔ دوسری بات یہ تھی کہ ہم نے تو محض آٹھ آنے حاصل کئے تھے اور قوم مانگتی تھی پورا روپیہ۔ لیکن ہمارے پاس روپیہ کہاں تھا۔ علاوہ ازیں ہماری تحریک میں سنڈیکیٹ کی ایک نئی بلا بھی نازل ہو گئی تھی اور وہ یہ تھی کہ ہمارے کارکن دیانتداری اور ایمانداری سے کنٹرول کی چیزوں کی تقسیم نہیں کر پائے تھے۔

سن ۱۹۳۹ء میں جنگ شروع ہو گئی اور ہندوستان کی تمام صوبوں کی کانگریسی وزارتوں کے ساتھ ہماری وزارت بھی مستعفی ہو گئی۔

جس وقت جنگ میں جاپان بھی شامل ہو گیا تھا اس وقت سورت میں (پونا ہونا چاہیئے) کانگریس ورکنگ کمیٹی کا اجلاس منعقد ہوا۔ اس اجلاس میں ایک قرارداد منظور کی گئی کہ "ہم جنگ میں انگریزوں کی امداد کرنے کو تیار ہیں لیکن اس شرط پر کہ انگریز جنگ کے بعد ہمیں آزادی دینے کا اعلان کر دیں"۔ اس موقع پر میں نے اور مہاتما گاندھی نے کانگریس ورکنگ کمیٹی سے استعفے دیدیئے کیونکہ ہم تشدد کے قائل نہیں تھے اور جنگ میں انگریزوں کی امداد کرنے کے معنی تشدد کو تقویت پہنچانا تھا۔

اِس اجلاس کے بعد ملک میں انفرادی ستیہ گرہ شروع ہو گیا، لیکن مہاتما جی کی

منظوری کے بغیر کسی کو ستیہ گرہ کے کرنے کی اجازت نہیں تھی۔ صوبہ سرحد کے لئے گاندھی جی نے اپنے یہ اختیارات مجھے منتقل کر دیئے تھے۔ صوبہ سرحد میں حکومت ستیاگرہیوں کو گرفتار نہیں کرتی تھی چونکہ انگریز اس جنگ کو بار بار آزادی اور جمہوریت کی جنگ کا نام دیتے تھے، لیکن ہندوستان کو آزادی دینے کا نام نہیں لیتے تھے، اس لئے کانگریس نے مجبور ہو کر انگریزوں کی غیر ملکی حکومت کے خلاف ایک اجتماعی تحریک شروع کر دی۔ یہی وجہ تھی کہ کانگریس نے ۸ راگست ۱۹۴۲ء کے روز بمبئی میں انگریز کے خلاف "بھارت چھوڑ دو" نام سے ایک قرارداد منظور کر لی۔ اس قرارداد کی رُو سے انگریزوں سے سارے ہندوستان اور صوبۂ سرحد میں یہ مطالبہ کیا جاتا تھا کہ "اے انگریزو ہندوستان خالی کر دو یہاں سے نکل جاؤ"۔ جہاں انفرادی ستیہ گرہ کے دوران ستیہ گرہی ملک کے عوام سے کہتے تھے کہ "انگریزوں کو موجودہ جنگ میں مالی و جانی امداد دینا گناہ ہے۔ یعنی چندہ اور بھرتی نہیں دینا چاہیئے"۔ وہاں اجتماعی تحریک میں ہر ایک انگریز کے خلاف "بھارت چھوڑو" کا نعرہ لگایا جاتا تھا اور انگریز حکومت کے قانون کی خلاف ورزی کر کے ہزاروں لوگ گرفتار ہوتے تھے۔ انہی دنوں ہم نے سردریاب کے کنارے خدائی خدمتگاروں کا ایک مرکز قائم کیا جس کا نام "مرکز اعلیٰ خدائی خدمتگاران" تھا۔ ہندوستان میں سول نافرمانی شروع ہو گئی تھی لیکن صوبہ سرحد میں ابھی تک ہم نے شروع نہیں کی تھی۔

جس وقت ہم نے سول نافرمانی کرنے کا فیصلہ کیا تو ہمارے جرگے نے تمام اختیارات مجھے دے دیئے اور میں ہی سول نافرمانی کی تحریک چلانے کے لئے ڈکٹیٹر مقرر کیا گیا۔ دراصل میں تو لفظ ڈکٹیٹر ہی سے ڈرتا ہوں، کیونکہ مطلق العنانی اور ڈکٹیٹری میری فطرت میں موجود نہیں ہے۔ اسے میں پسند نہیں کرتا، اسی لئے میں جو کچھ بھی کرتا یا ہر وہ حکم جو میں دیا کرتا اس کے بارے میں سب سے پہلے اپنے ساتھیوں سے صلاح و

مشورہ کر لیتا۔ یہاں یہ بات قابلِ ذکر ہے کہ جس وقت سول نافرمانی کرنے یا نہ کرنے کے سوال پر جرگے میں بحث جاری تھی تو ہزارہ کے حاجی فقیر اخان نے یہ تجویز پیش کی کہ ہمیں ٹیلی فون کے تار کاٹنے اور ریل کی پٹریاں اکھاڑنے کی اجازت دی جائے۔ میں نے اُن سے کہا کہ یہ میں صرف اس شرط پر مان سکتا ہوں کہ جو آدمی ریل کی پٹری کو نقصان پہنچائے یا تار کاٹے اُسے چاہیئے کہ وہ یہ کام کر کے خود پولیس تھانے میں جاکر اور پوری صاف گوئی و جرأت کا اظہار کرتے ہوئے یہ کہہ دے کہ "یہ کام میں نے کیا ہے"۔ اس سے ایک تو پشتونوں کے اندر اخلاقی جرأت پیدا ہو جائے گی اور چونکہ وہ یہ جرأت آمیز کام کھلے بندوں کریں گے تو اس سے اس غیرت بھرے اعلان کی وجہ سے ہو سکتا ہے کہ دوسرے لوگوں میں بھی اخلاقی جرأت کی ایسی عادت پیدا ہو جائے اور تیسری بات یہ ہو گی کہ اس کے کام کی وجہ سے اور لوگوں پر بے جا شک و شبہ نہیں ہو گا اور خدا کی مخلوق آزار اور سختی کا شکار نہیں ہو گی۔

بہرحال میری ہدایت اور ڈسپلن کے تحت خوب زور شور سے سول نافرمانی شروع ہو گئی۔ فیصلے کے مطابق ہم لوگ عدالتوں اور کچہریوں پر چھاپے مارتے تھے۔ بنوں، کوہاٹ، ٹانک اور پشاور میں عدالتوں پر حملے شروع ہو گئے تھے۔ انگریزوں کی طرف سے ہماری اس تحریک کا جواب بڑی سختی سے دیا گیا۔ لیکن پشاور کے ایک مسلمان ڈپٹی کمشنر نے انگریزوں کی روایتی وفاداری میں انگریزوں سے بھی زیادہ اپنی انگریز پرستی کو اونچا اُچھالا اور انگریزی کی یہ مثال درست ثابت کرنے کی کوشش کی کہ "بادشاہ سے بھی زیادہ بادشاہی کا خیر خواہ نکلا"۔ اس ذاتِ شریف کا نام جناب اسکندر مرزا تھا۔ جہاں انگریز حکمران اپنے علاقوں میں اپنی فوجوں کو لوگوں پر لاٹھی چلانے کا حکم دیتے تھے جناب مرزا بذاتِ خود اُٹھ کھڑے ہو جاتے اور لاٹھی ہاتھ میں لے کر خدائی خدمتگاروں کو مار مار کر ادھ موا کر دیتے تھے۔ حتیٰ کہ ایک خدائی خدمتگار اُن کی لٹھ بازی سے شہید ہو گیا۔

اس غدائی خدمتگار کا نام سید اکبر تھا۔ جناب مرزا کے کارناموں میں سے ایک اور شریفانہ واقعہ بھی لکھ دینا چاہیئے۔ آپ نے غدائی خدمتگاروں کے کیمپ میں اُن کے سالن میں ایک دن زہر ڈال دی تھی اور اس سے وہ تمام غدائی خدمتگار جنہوں نے کھانا کھالیا تھا وہ ایسے بیمار ہوئے کہ موت کے دروازے پر پہنچ گئے۔

ان مرزا صاحب کے ہم پٹھانوں پر اور بھی بہت سے احسانات اور مہربانیاں ہیں، لیکن میں ان پر پردہ ڈالتا ہوں اور انہیں اُس خدا کے سپرد کرتا ہوں جس کے پاس ہم سب کو ایک دن حاضر ہونا ہے۔ مرزا صاحب بعد میں پاکستان کے صدر مملکت بھی بن گئے تھے اور وہ 'اسلام اسلام' اور 'وطن پرستی' کے نعرے بھی لگانے لگ گئے تھے اور میں بھی ان کی صدارت کے دوران 'وطن دشمنی' اور 'نامسلمانی' کے الزام میں جیل میں قید و بند کی اذیت اُٹھاتا رہا۔

خیر میں وقتاً فوقتاً متیہ گرہ کا حال معلوم کرنے کے لئے اپنے صوبے میں پھرتا رہتا تھا۔ ایک دن میں کوہاٹ کی طرف جا رہا تھا کہ درّے کے 'سپینہ تھانے' میں مجھے گرفتار کر لیا گیا۔ مجھے موٹر میں بٹھا کر پشاور لے جایا گیا اور وہاں مجھے چھوڑ دیا گیا۔ اسی طرح جہاں بھی میں جاتا تھا یہ لوگ (انگریزی حکومت کی پولیس) مجھے گرفتار کر لیا کرتے تھے اور مجھے واپس پشاور لا کر چھوڑ دیتے تھے، لیکن مجھے یہ سلوک پسند نہیں تھا، اس لئے میں نے پچاس آدمیوں کا ایک جتھا بنایا اور ہم لوگ چارسدہ سے پیدل یا مردان کے لئے روانہ ہوئے۔ راستے میں ہم جگہ بہ جگہ جلسے کرتے تھے۔ جس وقت ہم لوگ میروشی ڈھیری میں پہنچے تو یہاں ہمارے لئے پولیس بیٹھی ہوئی تھی۔

---

[1] جب باچا خان مضروب ہو کر جیل میں آئے تو اُن کی عجیب حالت تھی۔ کپڑوں پر خون کے دھبے تھے۔ کانوں، ٹھوڑی اور جسم کے مختلف حصوں پر گہری چوٹیں تھیں۔ پولیس

(باقی اگلے صفحہ پر)

ہم نے ایک دوسرے کے ہاتھوں میں ہاتھ ڈال کر ایسی زنجیر سی بنا رکھی تھی کہ ہم ایک دوسرے سے جدا نہیں ہوتے تھے اور اگر پولیس والے ہمیں جدا کر بھی دیتے تھے تو بھی ہماری پھر یہ کوشش ہوتی تھی کہ ایک دوسرے کے ساتھ مل جائیں۔ پولیس نے بالآخر لاٹھیاں سنبھال لیں اور ہم پر تابڑ توڑ برسانی شروع کر دیں۔

انگریزی حکومت میں ہماری تحریک کے ابتدائی دور کو چھوڑ کر انگریزوں نے دشمنی اور سختی کے باوجود ہمیشہ میری عزت کی تھی اور شخصی طور پر انہوں نے کبھی میرے ساتھ ایسا کوئی سلوک نہیں کیا تھا کہ جس سے میری بے عزتی ہوئی ہو، یا مجھے مار پیٹ کی گئی ہو، یا مجھے زخمی کیا گیا ہو۔

مثال کے طور پر ایک دفعہ میں ایبٹ آباد کے جیل خانے میں قید تھا۔ ہمارے جیل خانہ جات کے جرنیل مسٹر اسمتھ دورے پر ایبٹ آباد آئے تھے اور سیدھے مجھے دیکھنے کے لئے جیل میں چلے آئے۔ میں جیل میں ایک چھوٹی سی تنہا کوٹھری میں اکیلا الگ تھلگ بند تھا۔ اسمتھ صاحب نے میرے ساتھ علیک سلیک کے بعد باہر جا کر سپرنٹنڈنٹ جیل کی طرف دیکھ کر اس نے غیض و غضب بھرے ہوئے لہجے میں کہا

(بقیہ حاشیہ صفحہ گزشتہ) کی لاٹھیوں سے دو پسلیاں ٹوٹ چکی تھیں۔ سفید داڑھی گرد و غبار میں اَٹی پڑی تھی لیکن چہرے پر پھر بھی شگفتگی تھی۔ وہ مٹیالے رنگ کا کرتا اور پاجامہ پہنے ہوئے تھے۔ چند پولیس والے بھی ان کے ساتھ جیل میں آئے۔ میں نے زندگی میں پہلی بار انہیں اتنے قریب سے دیکھا۔ اس وقت میرے ساتھ حضرت مولانا عبدالرحیم پوپلزئی بھی موجود تھے۔ دونوں ایک دوسرے سے بغلگیر ہوئے اور میں نے دونوں کی آنکھوں میں چھلکتے ہوئے آنسو دیکھے۔ محبت اور خلوص کے یہ آنسو دونوں کے دلی جذبات کا اظہار کر رہے تھے۔

"باچا خان کو تم نے کبوتروں کی اس چھوٹی سی کوٹھری (ڈربے) میں ڈالا ہوا ہے۔ تم نے اُسے ہسپتال کے بڑے کمرے میں کیوں نہیں بھیجا"

اُس نے سمتھ صاحب کو بڑے ادب اور آہستگی سے کہا "حکومت سرحد کا حکم ایسا ہی ہے میں کیا کر سکتا ہوں"

سمتھ صاحب نے اسی وقت اسی جگہ سے گورنر سرحد کو ٹیلیفون کیا اور اُن سے کہا "جارج کننگھم! کیا کوئی اپنے ایک بہادر دشمن سے ایسا سلوک کرتا ہے جیسا کہ آپ نے باچا خان کے ساتھ روا کر رکھا ہے"

کننگھم اپنے کرتوتوں پر شرمندہ ہوا اور اس نے اپنا حکم واپس لے لیا۔ لیکن سمتھ صاحب نے اس سے پہلے ہی مجھے کسی اچھی جگہ منتقل کرنے اور میرے لئے اچھے ساتھی مہیا کرنے کا حکم دے دیا تھا۔ چنانچہ میر الرکادلی اور تین دیگر ساتھی میرے پاس بھیج دیئے گئے تھے۔ حالانکہ میں نے سمتھ صاحب سے ایسی خواہش ظاہر نہیں کی تھی۔ جس وقت وہ مجھے ساتھی دینے لگے تھے تو انہوں نے مجھ سے دریافت ضرور کیا تھا کہ مجھے کونسے ساتھی چاہئیں۔ میں نے اُن سے کہا تھا کہ جو انہیں پسند ہوں۔ لیکن سمتھ صاحب نے میرے پاس جواب بھیجا تھا کہ یہ ساتھی انہیں اپنے لئے تو نہیں چاہئیں یہ میرے لئے ہیں، اس لئے مناسب یہ ہے کہ میں خود اپنی پسند کے ساتھی طلب کروں۔ وہ مجھ پر اپنی پسند کے ساتھی نہیں ٹھونسنا چاہتے۔

سمتھ صاحب کے اس شریفانہ سلوک کا یہ ذکر کرتے ہوئے یہاں مجھے پاکستان کی حکومت کے رویے کی بات بھی یاد آتی ہے۔ میں اس کی عملداری میں ہمیشہ قید تنہائی میں ہی رکھا گیا۔ اور جتنا بھی چیخا چلایا کہ مجھے ایک ساتھی تو دے دو لیکن کسی نے بھی مجھے ممنون نہیں کیا ــ اور اگر کوئی ساتھی دیا بھی تو وہ پاگل تھا یا مریض۔ جو میرے لئے تکلیف اور سر دردی کا موجب بنا۔ لیکن انگریزوں کی حکومت میں

کچھ دیسی ملازم اس عقیدے کے مزدور تھے جو یہ سوچتے تھے کہ اگر وہ مجھے شخصی طور پر سزر پہنچائیں گے یا میری بے حرمتی کریں گے اور انگریزان کی اس وفاداری سے باخبر ہو جائیں گے تو وہ اس انگریز پرستی کے طفیل دنیاوی زندگی میں ترقی کرینگے۔ میروس ڈھیری کے اس واقعے میں بھی ہمیں ایک ایسے حقیر پولیس افسر سے واسطہ پڑا۔ انہوں نے مجھے اس قدر مارا پیٹا کہ میری دو پسلیاں ٹوٹ گئیں۔ وہ آدمی پولیس کا انسپکٹر خوشدل خان تھا جس کے نام کے معنی اچھے دل والے خان کے ہیں۔ تو اچھے دل والے اِس خان صاحب نے اپنے لئے انگریزوں کی وفاداری کی فہرست میں جگہ تو بنا لی لیکن متمدن دنیا کے سامنے یہ کسی اچھے سونے کا انسان اپنے آپ کو پیش نہیں کر سکا۔ خدائی خدمتگاروں سے اس کے سلوک کا اندازہ ناظرین میرے ساتھ اس کے سلوک سے بخوبی لگا سکتے ہیں۔ انہوں نے ہم سب کو پکڑ لیا اور مردان جیل میں لے گئے۔ دوسرے دن ہمیں رسالپور پہنچا دیا اور اس جگہ سے ہمیں ہری پور جیل میں لے آئے۔

(۱۷)

جنگ کے زمانے میں جب جاپانی افواج برما میں پہنچ گئیں تو ہمیں فکر لاحق ہو گیا کہ جاپانی بہت تیزی سے آگے بڑھ رہے ہیں اور اگر ان کی یہی رفتار جاری رہی تو وہ بہت جلد یہاں پہنچ جائیں گے۔ ہم اپنے قبائل کے لئے متفکر ہو گئے۔ ہم چاہتے تھے کہ آنے والی مصیبت کا مقابلہ ایک جگہ اکٹھے ہو کر وطن پرستی کے جذبے کے ساتھ وطن کی حفاظت کے لئے کریں۔ اس کے لئے ضروری تھا کہ ہمارا بھائی چارہ ہو۔ ہمارا ایک ہی مشورہ، ایک ہی صلاح اور ہم سب کا ایک مشترکہ راستہ ہو۔ ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ قبائلی علاقے میں ہم اپنے وفد بھیجیں۔
اس وقت سر جارج کننگھم ہمارے گورنر تھے۔ میں نے انہیں ایک خط

لکھا کہ وہ ہمیں اجازت دے دیں تاکہ ہم اپنے آدمی قبائل میں بھیج دیں۔ چونکہ انگریز ہمیں اصلاحی اور تعلیمی کاموں کے لئے بھی قبائیلیوں میں نہیں جانے دیتے تھے۔ اس لئے گورنر نے مجھے جواباً لکھا: "وہ ہمیں اس بات کی اجازت نہیں دے سکتے۔ اس پر ہم نے اپنا جرگہ بلا لیا۔ اور گورنر نے بھی اپنے پولیٹیکل ایجنٹوں کو صلاح مشورے کے لئے بلا لیا۔ ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ چونکہ یہ ہماری موت اور زندگی کا سوال ہے چاہے حکومت ہمیں اجازت دے یا نہ دے ہم اپنے وفد ضرور قبائلی علاقوں میں بھیجیں گے۔ دوسری طرف سرحد کی حکومت نے پولیٹیکل ایجنٹوں کے مشورے کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ وہ ہمیں (خدائی خدمتگاروں کو) یہاں تو کچھ نہیں کہیں گے۔ لیکن جب ہم قبائیلیوں میں آجائیں گے تو ہماری اچھی طرح سے خبر لیں گے۔ ہم نے آفریدیوں، وزیروں، مسعودوں اور باجوڑ میں اپنے وفد بھیج دیئے۔ ہمارے آفریدیوں میں جانے والے وفود کو کسی قسم کی مشکلات پیش نہ آئیں اور وہ اپنی اپنی منزلِ مقصود پر پہنچ گئے۔ لیکن ہمارے اس وفد کو جو باجوڑ جا رہا تھا بڑی مشکلات کا سامنا کرنا پڑا۔ خدائی خدمتگاروں پر مشتمل اس وفد کے راستے میں مالاکنڈ کے پولیٹیکل ایجنٹ نے رانازئی کے قبیلہ کے خوانین کو بٹھا رکھا تھا۔ جب ہمارا وفد سخاکوٹ میں پہنچا تو ان خوانین نے اُسے روک لیا۔ اور واپس چلے جانے کی ہدایت کرتے ہوئے کہا کہ وہ وفد کو اپنے علاقے میں نہیں گھسنے دیں گے۔

اس وفد کا رہنما کامدار خان تھا۔ اُس نے اُن سے کہا: "دیکھیے خان صاحبان! ہم لوگ خدائی خدمتگار ہیں اور آپ لوگوں کی خدمت کے لئے آئے ہیں۔ چونکہ ہمارے ملک میں ایک عظیم مصیبت آنے والی ہے اس کے پیش نظر ہم اس مقصد کے لئے آپ کے علاقے میں جانا چاہتے ہیں کہ آپ لوگ اور ہم آپس میں سر جوڑ کر

بیٹھ جائیں اور آنے والی مصیبت کا تدارک کریں" لیکن ان خان صاحبان کے کانوں پر جوں تک نہ رینگی۔ انہیں تو فرنگی (پولیٹیکل ایجنٹ) نے بھیجا تھا اور پولیٹیکل ایجنٹ ان کا مطلق العنان حکمران تھا۔ وہ بس یہی رٹ لگاتے تھے کہ وہ ہمیں اپنے ملک میں نہیں گھسنے دیں گے۔

کامدار خان نے انہیں بہت سمجھایا کہ ہم جب ایک دفعہ قدم آگے رکھ دیتے ہیں تو اس قدم کو پیچھے نہیں ہٹاتے۔ اِس پر اُن خوانین سے بحث سی شروع ہوگئی اور یہ قیل وقال سُن کر بہت سے لوگ اکٹھے ہوگئے۔ خوانین کا ارادہ تھا کہ وہ زور زبردستی سے خدائی خدمتگاروں کو اپنے علاقے سے نکال باہر کردیں لیکن جب انہوں نے دیکھا کہ عام لوگوں کی ہمدردی خدائی خدمتگاروں کے ساتھ ہے، اگر وہ کوئی ایسی ویسی حرکت کرتے ہیں تو عوام ان سے جنگ کرنے کو تیار ہیں۔ تب انہوں نے خدائی خدمتگاروں کو چھوڑ دیا۔

اس کے بعد خوانین میرے پاس مرکز میں آئے۔ میرے ساتھ بھائی چارے عزیز داری اور قوم پرستی کی بڑی باتیں کرنے لگے اور انہوں نے میری بہت منت سماجت کی کہ یہ خدائی خدمتگار وفد مالاکنڈ کے راستے باجوڑ کو نہ جائے دوسرے راستے سے چلا جائے۔ چنانچہ میں نے کامدار خان کو لکھ دیا کہ وہ مالاکنڈ کا راستہ چھوڑ دیں اور اتمان خیلوں کے راستے سے باجوڑ چلے جائیں۔ وفد نے وہ راستہ ترک کر دیا۔ اور اگرے کے راستے سے اتمان خیلوں کی طرف روانہ ہوئے۔ راستے میں کاکا خیل میاؤں (میاں لوگ یا میاخیل) نے ان کو روک لیا۔ اور جب ہمارے خدائی خدمتگار ان کے گاؤں کے قریب سے گزر رہے تھے، تو یہ میاں لوگ باہر نکل آئے اور بغیر کسی وجہ کے ان پر ٹوٹ پڑے۔ انہیں اٹھا اٹھا کر نیچے پٹکا اور بڑی بے دردی سے مارا پیٹا۔ انہوں نے خدائی

خدمتگاروں پہ یہ جور و ستم اس لئے روا سمجھا کہ کسی طرح پولیٹیکل ایجنٹ کو یہ معلوم ہو جائے کہ انہوں نے خدائی خدمتگاروں کے ساتھ ایسا نامناسب برتاؤ کیا ہے "کاکاخیل" بیاں لوگوں کی بدقسمتی سے اکثریت ہر دور میں وقت کی حکومت کی وفادار رہی ہے۔ حتیٰ کہ چترال تک یہی لوگ انگریزی فوجوں کے آگے آگے گئے تھے۔ اور لوگوں کے مال و دولت لوٹنے میں پیش پیش رہے تھے

ہمارا یہ وفد جب باجوڑ میں پہنچ گیا تو وہاں بادشاہ گل صاحب نے ان کے لئے بڑی مشکلات پیدا کر دیں۔ اس نے لوگوں میں یہ پروپیگنڈا کیا کہ اُن کے علاقے میں ایسے لوگ آرہے ہیں جنھوں نے سُرخ کپڑے پہنے ہوئے ہیں۔ یہ لوگ ہندو ہیں اور ان کے قتل کر دینے میں بڑے ثواب ملتے ہیں۔ بادشاہ گل صاحب نے ہمارے خلاف یہ سارا پروپیگنڈا افغانستان کے وزیر اعظم ہاشم خان کے ایما سے کیا تھا۔ کیونکہ بادشاہ گل انہی ہاشم خان کا آدمی تھا اور ہاشم خان کو انگریزوں نے ایسا کام کرنے کے لئے مجبور کیا تھا۔ اس وقت ہاشم خان افغانستان کا وزیر اعظم تھا۔

ایک موقع پر باجوڑ میں گاؤں کے نوجوان اس بات کے لئے تیار ہو گئے تھے کہ ہمارے خدائی خدمتگاروں کی چاند ماری کر دیں یعنی انہیں گولی مار کر موت کے گھاٹ اُتار دیں۔ لیکن ان کے بزرگوں نے ان سے کہا کہ "تم لوگ ذرا صبر سے کام لو۔ یہ سرخ پوش کہیں جا تو سکتے نہیں۔ ہم ان سے پوچھ تو لیں"

جب خدائی خدمتگار گاؤں کے حجرے میں بیٹھ گئے تو ان لوگوں نے ان سے پوچھا کہ وہ کون ہیں اور کہاں جانا چاہتے ہیں؟

اس استفسار کا جواب دینے کے لئے عبدالمالک اُستاد جو ہم پٹھانوں کا

ایک عظیم قومی شاعر تھا، کھڑا ہو گیا اور بولا ہم لوگ آپ کے بھائی ہیں۔ خدائی خدمتگار ہیں اور ہمیں باچا خان نے آپ لوگوں کے پاس اس لئے بھیجا ہے کہ اس ملک میں بھیانک مصیبتوں کا بہت بڑا سیلاب آرہا ہے۔ اس موقع پر ہم سب پشتونوں کو سر جوڑ کر متحد ہو جانا چاہیئے اور اس سیلاب کا سدِ باب کرنا چاہیئے۔ ایسا نہ ہو کہ اس سیلاب میں ہم بہہ جائیں اور تباہ ہو جائیں " عبدالمالک کے ان الفاظ کا ان لوگوں پر خوب اثر ہوا اور انہوں نے اپنے نوجوانوں کو بڑی لعنت ملامت کی۔ بادشاہ گل کی انتہائی مخالفانہ کوششوں کے باوجود یہ وفد بہت زیادہ کامیاب ہوا اور اس نے باجوڑ میں قابلِ تعریف کام کیا۔

ہاشم خان کا مخالفانہ اور دشمنانہ رویّہ یہیں تک محدود نہیں تھا۔ جب ہم انگریزوں کی کچہریوں پر چھاپے مار رہے تھے تو ہاشم خان نے اسی بادشاہ گل کو حاجی محمد امین کے ہمراہ ہمارے خلاف کام کرنے کے لئے پشاور بھیجا تھا۔ یہاں یہ وضاحت کر دینا ضروری ہے کہ حاجی محمد امین جلال آباد کے نزدیک (افغانستان میں) اڈہ نام کے گاؤں میں رہ رہا تھا۔ اور وہ کسی وقت حاجی صاحب ترنگ زئی کا خلیفہ تھا۔ ہاشم خان نے اسے ہمارے خلاف انگریزوں کی خاطر بھیجا تھا، تاکہ وہ ہمارے لوگوں (پشتونوں) کی توجہ انگریزوں کی طرف سے ہٹا دے۔ حاجی محمد امین جب پشاور پہنچا تو اس نے انگریزوں کی عدالتوں پر خدائی خدمتگاروں کی طرف سے ہو رہے دھاووں کے مقابلے میں پیشہ ور عورتوں کے چکلوں پر چھاپے مارنا شروع کر دیئے۔ اس کا مطلب یہ تھا کہ لوگوں کی توجہ انگریزوں سے ہٹا کر ادھر مبذول کر دے۔ لیکن وہ لوگوں کی توجہ جنگِ آزادی سے کسی دوسری طرف ہٹا نہ سکا۔ کیونکہ ہم نے ملک میں کام کیا تھا اور ہمارے لوگوں میں اتنی سوجھ بوجھ آچکی تھی کہ انہیں اسلام کے نام پر گمراہ کرنا اور دھوکہ دینا ممکن

نہیں تھا۔ بادشاہ گل صاحب کے باپ حاجی صاحب آف ترنگ زئی بذاتِ خود بہت اچھے انسان تھے اور ہمارے پکّے ساتھی تھے۔ لیکن بادشاہ گل ہماری یہ ساری مخالفت پیسوں اور اقتدار کے لالچ سے کر رہا تھا۔ اس کے لئے گئوشالہ میں دو شیر خوار گائیں کھڑی ہوئی تھیں۔ ایک شیر دار گائے انگریزی حکومت اور دوسری افغانستان۔

(۱۸)

ہری پور ہزارہ کے سنٹرل جیل میں ہمارے ہزاروں ساتھی قیدی تھے۔ ان میں سے اکثر رہا ہو گئے اور تھوڑے سے رہ گئے تو پھر مجھے واپس ہری پور جیل میں بھیج دیا گیا۔ ہم میں اکثر قیدی نظر بند تھے۔ ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ ایسے نکمے بیٹھے نہیں رہیں گے، کوئی کام کریں گے اور ہم نے حکومت سے کہہ دیا کہ ہمیں نواڑ بننے کا کام دے دیا جائے۔ اُن دنوں پچیس فٹ نواڑ بننے کی مزدوری آٹھ آنے دی جاتی تھی۔ ہمارے بہت سے آدمیوں نے بڑے پیسے کما لئے۔ لیکن یہ پیسے کوئی بھی ساتھی اپنی ضروریات پر خرچ نہیں کرتا تھا۔ یہ سب پیسے ہم لوگ اپنے مرکز کو بھیجتے تھے۔ دوسرا کام ہم نے یہ کیا کہ یہاں ہمارے بہت سے خدائی خدمتگار تھے جنہیں لکھنا پڑھنا نہیں آتا تھا۔ اُن کے لئے لکھنے پڑھنے کا انتظام کیا۔ اور بہت سے خدائی خدمتگاروں نے لکھنا پڑھنا سیکھ لیا۔

اس موقع پر مجھے اس بات کی ضرورت محسوس ہوتی ہے کہ میں ایجنسیوں کے متعلق بھی تھوڑی سی وضاحت کر دوں۔ پشتونوں کے ملک کی تقسیم جو پہلے انگریزوں نے اور اب پاکستان نے جس طریقے سے کی ہے اس کی طرف ایک دوسری جگہ پر بھی میں نے کچھ اشارا کیا ہے۔ یہاں میں اس مکروہ انتظامی تقسیم کے سلسلے میں صرف ایجنسی کو لیتا ہوں۔

صوبہ سرحد کا وہ علاقہ جو گورنر کے زیرِ اثر قانونی طور پر اسمبلی کے ذریعے منظم کیا جاتا ہے اسے اضلاع بندوبستی کا نام دیا جاتا ہے۔ اس علاقے اور آزاد قبائل کے

درمیان ایک بفر زون ایجنسیوں کا ہے۔ یہ علاقہ پولیٹیکل ایجنٹ کے براہ راست زیر حکومت ہوتا ہے۔ اس میں کسی قسم کا نہ تو کوئی قانون ہوتا ہے اور نہ عدالت ــــ یہاں تک کہ پولیٹیکل ایجنٹ کے کسی حکم کے خلاف کسی کو اپیل کرنے کی بھی اجازت نہیں ہے۔ ایجنسیوں کے لوگ بے چارے جاہل، مظلوم اور اس حد تک معتوب ہوتے ہیں کہ ایک (واحد) شخص کے حکم سے مرتے ہیں اور زندہ ہوتے ہیں۔

ایجنسی کے لوگوں کو بندوقیں رکھنے کی اجازت ہوتی ہے اور انہیں یہ اجازت بھی ہوتی ہے کہ ایک دوسرے کو قتل کر دیں۔ ایک دوسرے کا مال غصب کرلیں اور ایک دوسرے کے دشمن بنے رہیں تاکہ ہمیشہ پولیٹیکل ایجنٹ کے رعب کے نیچے وہ خوشامد کرکے اپنی جان بچانے کے لئے اس کے آسرے پر زندگی بسر کرتے رہیں۔ اس بفر زون کے قیام کی غرض وغایت یہ ہے کہ اگر قبائلی صوبے میں بندوبستی اضلاع پر کہیں حملہ کریں (ڈاکہ ڈالیں) تو وہ پہلے ان لوگوں یعنی ایجنسیوں میں سے گزرنے پر مجبور ہوں اور یہ لوگ (ایجنسیاں) اپنے سینے ڈھال بنا کر اُن کے مقابلے پر کھڑے ہوجائیں۔ یہ لوگ اتنے محکوم اور مظلوم ہیں کہ پولیٹیکل ایجنٹ کا ادنیٰ اشارہ ان کے لئے، اگر وہ زندگی بسر کرنا چاہیں، کافی ہوتا ہے۔ یہ لوگ آزاد قبائل کی طرح آزاد نہیں ہوتے اور دوسری طرف محکوم صوبے کی مانند قانون اور عدالت کے سائے سے بھی محروم ہوتے ہیں۔ ان کے علاقے میں پہلے انگریزی فوجیں، بارڈر پولیس اور لیوی اور اب پاکستان کی فوجیں وغیرہ ہمیشہ ڈیرہ ڈالے رہتے ہیں۔

میں نے جیل خانے میں مرغیاں پالی تھیں۔ میں مرغیوں سے انڈے نکلواتا تھا۔ اور اس کی آمدنی سے جتنے پیسے میرے ہاتھ لگتے تھے وہ میں مرکز کو دیا کرتا تھا۔ مرغیوں کے ان بچوں کو میں اپنے ہاتھ سے خوراک کھلاتا تھا جس وقت ان کے کھانے کا وقت ہوتا تھا وہ میرے ارد گرد خود بخود جمع ہوجاتے تھے میں اُن کے لئے ہاتھوں میں آٹا لے

ہوتا تھا۔ اس لئے کوئی چوزہ میری بغل میں بیٹھ جاتا، کوئی میرے ہاتھوں پہ بیٹھ جاتا اور کوئی میرے سر اور کندھوں پہ آ بیٹھتا۔ ایک دن کرنل سمتھ جو جیل خانہ جات کے جرنیل تھے، ہری پور میں دورے پر آگئے۔ انہوں نے ۱۹۳۰ء میں تو ہری پور جیل میں سیاسی قیدیوں پہ بڑی سختیاں کی تھیں اور ان پر بڑے مظالم توڑے تھے۔ وہ اس وقت جیل کے سپرنٹنڈنٹ تھے۔ لیکن اب بہت بدل چکے تھے اور بہت مخلص مزاج بن گئے تھے۔ ہمارے ساتھ اُن کو بہت اُنس ہو گیا تھا۔ حقیقت تو یہ ہے کہ فرنگی (انگریز) ایک قوم پرست اور بہادر قوم ہے۔ اور اُنہیں قوم پرستوں اور بہادر آدمیوں سے دل ہی دل میں بڑا اُنس تھا اور ان کی وہ قدر کرتے تھے۔ سمتھ صاحب نے جونہی مجھے مرغیوں اور چوزوں میں مشغول دیکھا تو اُنہوں نے اپنے ہمراہیوں کو رخصت کر دیا اور خود چُھپ چُھپ کر میرے پیچھے آکر کھڑے ہو گئے اور یہ تماشہ دیکھنے لگ گئے۔ تھوڑی دیر کے بعد انہوں نے مجھے گڈ مارننگ (سلام سحر) کہی میں نے جب پیچھے کی طرف دیکھا، سمتھ صاحب موجود تھے۔ اُنہوں نے مجھ سے پوچھا کہ "یہ کیا کر رہے ہو؟" میں نے انہیں جواب دیا کہ ذرا آپ اس بات کو تو سوچئے کہ اس میں انسان کے لئے ایک بہت بڑا سبق پوشیدہ ہے۔ دیکھ لیجئے کہ یہ جانور بھی جانتا ہے کہ میں اس کا دشمن ہوں اور اسے حلال کرنے کے لئے پال رہا ہوں، لیکن میں چونکہ اس سے پیار کرتا ہوں، اس لئے دیکھئے یہ کس طرح میری بغل میں اور ہاتھوں پر بیٹھے ہوئے ہیں۔ کیا یہ بات انسان کے لئے ایک بہت بڑا سبق نہیں ہے؟ جب ہم پیار سے حیوان کو اپنا دوست بنا سکتے ہیں تو انسان کو جو اشرف المخلوقات ہے، کیوں اپنا دوست نہیں بنایا جا سکتا؟

یہ سمتھ صاحب عجیب و غریب انسان تھے۔ وہ کہا کرتے تھے کہ اگر پاکستان بن گیا تو وہ اس میں ایک دن کے لئے بھی نہیں رہیں گے۔ چنانچہ جس دن پاکستان بننے

کا اعلان ہو رہا تھا تو وہ واقعی اسی دن صبح سویرے ریل گاڑی میں سوار ہو گئے اور صوبۂ سرحد سے انگلستان روانہ ہو گئے۔

۱۹۴۵ء میں ہمارے وزیروں کے دل میں یہ خیال پیدا ہوا کہ ہمارے اس صوبے کے لئے وزارت فائدہ مند ہے اور اگر انہوں نے وزارت لے لی تو اور کاموں کے علاوہ ان کے ساتھی سیاسی قیدیوں کو بھی، جو تین تین سال سے جیلوں میں پڑے ہوئے ہیں، رہائی مل جائے گی۔ انہوں نے اپنا ایک وفد گاندھی جی کے پاس بھی بھیجا تھا۔ جس نے گاندھی جی کو بتایا کہ ہندوستان کے حالات سے صوبۂ سرحد کے حالات جدا ہیں۔ گاندھی جی نے انہیں سیاسی قیدیوں کی رہائی کے سلسلے میں اجازت تو دے دی تھی، لیکن انہوں نے وفد سے یہ بھی کہا کہ وہ باچا خان یعنی مجھ سے پوچھ لے۔ چنانچہ ممبروں کا ایک وفد میرے پاس جیل خانے میں آیا اور سارے حالات سے مجھے آگاہ کیا۔ اس نے مجھ سے یہ بھی کہا کہ انگریز تو مجھے چھوڑیں گے نہیں۔ البتہ اگر انہوں نے وزارت قائم کر لی تو ان تمام خدائی خدمتگاروں کو وہ رہا کر دینگے۔ لیکن وہ مجھے قائل نہ کر سکے۔ میں نے انہیں کہہ دیا کہ آپ لوگ ہم سیاسی قیدیوں کی کوئی فکر نہ کریں۔ ہم قید میں تنگ نہیں ہیں۔ اور ایسی وزارت جس کو کوئی اختیار حاصل نہ ہو، اُسے لے لینے میں مجھے تو نقصان نظر آتا ہے۔ میری رائے وزارت لینے کے حق میں نہیں تھی، لیکن میں نہیں جانتا کہ آیا اور کارکنوں نے انہیں رائے دی تھی، کیونکہ مارچ ۱۹۴۵ء میں جونہی وزارت لے لی گئی اور وزارت لیتے ہی تمام سیاسی قیدی رہا کر دیئے گئے اور ہم لوگ جونہی جیل خانوں سے رہا ہو کر باہر آئے تو ہم نے اپنا کام شروع کر دیا، لیکن حکومت اور اس کے سب پٹھو ہمارے خلاف بڑے زور شور سے کام میں منہمک تھے۔ ہمیں اورنگ زیب کی وزارت نے بڑا فائدہ پہنچایا تھا اور لوگوں نے یہ محسوس کیا تھا کہ مسلم لیگ کی وزارت نے لوگوں کے لئے کیا کیا ہے۔

اور کانگریس منسٹری یا خدائی خدمتگاروں کی وزارت نے عوام کے لئے کیا کچھ کیا ہے۔ اورنگ زیب تو لوگوں کے لئے کچھ کر نہیں سکتا تھا۔ وہ تو اپنے عہدِ وزارت میں وہی کچھ کرتا رہا جو کچھ انگریز اُسے کہتے تھے اور جس میں ان کا اپنا مفاد ہوتا تھا۔ لیکن ڈاکٹر خان صاحب کی وزارت باوجود اِس کے کہ اُس کے ہاتھ میں چنداں اختیارات نہیں تھے پھر بھی اس نے لوگوں کے لئے بہت کچھ کیا تھا اور سب سے بڑی بات تو یہ تھی کہ ان کی وزارت انگریزوں کی کٹھ پتلی نہیں بلکہ لوگوں کی ہمدرد اور محب تھی۔

میں الیکشن کے حق میں نہیں تھا۔ میں کہتا تھا کہ ہم الیکشن چاہے جیت بھی لیں اور ہماری وزارت بھی بن جائے، لیکن جب ہم لوگوں کے لئے کچھ کر نہیں سکتے تو ہم ایسی وزارت لے کر کیا کریں گے؟ ہم تو وزارت حکومت کرنے کے لئے نہیں لیتے، ہم اگر وزارت لیتے ہیں تو خدمتِ خلق کے لئے لیتے ہیں۔

کلکتہ میں ورکنگ کمیٹی اور پارلیمنٹری بورڈ کی میٹنگ تھی۔ میں بھی اس میں شامل تھا۔ میں نے صوبہ سرحد کے مفصل حالات اور واقعات بیان کرنے کے بعد گاندھی جی سے کہا کہ میں اس الیکشن میں کوئی حصہ نہیں لینا چاہتا۔ گاندھی جی نے اس بات پر مجھ سے اتفاق کیا۔ پارلیمنٹری بورڈ نے بڑی کوشش کی کہ مجھے کسی طرح الیکشن میں حصہ لینے کے لئے راضی کرے، لیکن وہ مجھے آمادہ اور رضامند نہ کر سکا۔ ورکنگ کمیٹی کا اجلاس ختم ہونے کے بعد میں اپنے گاؤں چلا گیا اور اپنا کام کر رہا تھا۔ الیکشن سے میرا اتفاق نہیں تھا، لیکن اس سے یہ مطلب نہیں تھا کہ میں نے کام چھوڑ دیا تھا اور گھر میں بیٹھ گیا تھا۔ میں اپنی جماعت کا کام کرتا تھا اور ملک میں تابڑ توڑ دورے کر رہا تھا اور حکومت کے چرخوں کا میں خوب اچھی طرح سے مطالعہ بھی کر رہا تھا۔ حکومت ہماری مخالفت میں مشغول تھی۔ لیکن مجھے اس بات کا پتہ لگا کہ حکومت نے اسلامیہ کالج پشاور اور اسی طرح کے اسکول کالج صوبہ بھر میں بند کر دیئے ہیں اور طالب علموں کو مسلم لیگ کے

پروپیگنڈے کے لئے باہر میدان میں لا کھڑا کیا ہے۔ اور انگریزوں کی بیویاں بھی میں نے دیکھی ہیں کہ یہ گھوم رہی تھیں اور لوگوں سے کہہ رہی تھیں "ہم آپ کے پاس آئی ہیں۔ ہمیں دوپٹہ دان دیجئے اور یہ ہمارا دوپٹہ ووٹ ہے"۔ الیکشن کے پروپیگنڈے کے لئے بیگم شاہنواز کی لڑکی بھی دوسری کئی لڑکیاں اپنے ساتھ لے کر پنجاب سے سرحد میں آگئی تھی۔ اور پنجاب کے علاوہ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے طلبا، کلکتہ کے اسلامیہ کالج کے لڑکے اور ہندوستان کے دیگر مقامات کے کارکن اور لیگی رہنما بڑی بھاری تعداد میں صوبہ سرحد میں پہنچ گئے تھے۔ اس کے علاوہ حکومت اور مسلم لیگ نے پنجاب اور سرحد کے گدی نشین پیر اور پرہیزگار سب کو کوٹھریوں سے نکال کر الیکشن کے میدان میں جھونک دیا تھا۔ وہ ہمارے مقابلے میں کھڑے کر دیئے گئے تھے۔ میں نے جب انگریزوں اور اُن کی میموں کی طرف سے مسلم لیگ کے لئے الیکشن میں اتنی جدوجہد دیکھی تو میرا خیال بدل گیا۔ الیکشن میں صرف ایک مہینہ رہ گیا تھا کہ میں نے الیکشن کے لئے کام کرنا شروع کر دیا۔ یہ الیکشن (متحدہ ہند کے عام آخری انتخابات ۴۶-۱۹۴۵ء) ہندوستان اور پاکستان کے مسئلہ پر تھا۔ ہندو اور مسلمان کے سوال پر، مندر اور مسجد اور اسلام و کفر کے نام پر تھا۔ مسلم لیگی لوگوں سے کہتے تھے کہ مسجد کو ووٹ دیتے ہو یا مندر کو؟۔ ہندوستان کے دوسرے مسلمانوں کی طرح پٹھان دقیانوسی خیالات کے نہیں تھے۔ ان میں سیاسی شعور موجود تھا۔ انہیں سوجھ بوجھ حاصل تھی۔ انہیں کوئی اسلام کے نام پر دھوکہ نہیں دے سکتا تھا، کیونکہ وہ اسلام سے بخوبی واقف تھے اور اس کی تمام تر وجہ یہ تھی کہ صوبہ سرحد میں ایک قومی تحریک تھی۔ اور اس تحریک نے ملک و ملت کے لئے بڑی قربانیاں اور شاندار خدمات سرانجام دی تھیں۔ باقی ہندوستان کے مسلمانوں میں نہ تو کوئی قومی تحریک تھی اور نہ ہی کسی نے ایسی قومی تحریک میں کوئی کام کیا تھا۔ ووٹوں کے وقت حکومت نے مسلم لیگ کے لئے بہت کوشش کی اور غوائی

خدمتگاروں کی بڑی سخت مخالفت کی، لیکن خدا کے فضل سے مسلم لیگ نے شکست کھائی اور ہم لوگ بڑی بھاری اکثریت سے کامیاب ہوئے۔

حکومت اور اس کے کل پُرزوں نے ہمارے خلاف بڑا سخت کام کیا تھا۔ اس قدر کام اور پروپیگنڈہ خود مسلم لیگیوں نے نہیں کیا تھا۔ حکومت کا یہ کام بہت بڑا مکروہ دکھائی دیتا تھا ہم نے صلاح و مشورے کے بعد یہ فیصلہ کیا کہ ہم وزارت نہیں بنائیں گے اور ہم نے وزارت بنانے سے انکار کر دیا اور کہہ دیا کہ ہم تب تک وزارت بنانے کے لئے تیار نہیں جب تک حکومت ہمیں یہ اجازت نہ دیدے کہ جن سرکاری ملازموں نے الیکشن میں ہمارے خلاف حصّہ لیا ہے اور ملازمت کے قواعد و ضوابط کی خلاف ورزی کی ہے، ان پر ہم مقدمے چلائیں۔ اور مجرمین کو مناسب سزائیں دیں۔ ہمارے اس فیصلے کی خبر جو نہی ڈاکٹر صاحب کو ملی، انہوں نے اس سے سردار پٹیل کو آگاہ کر دیا، کیونکہ اُن کی یہ رائے تھی، کہ وزارت قائم کرلینی چاہیئے۔

سردار پٹیل نے مولانا ابوالکلام آزاد کو اس مسئلہ کے حل کے لئے سرحد میں بھیج دیا اور ہماری پشاور میں میٹنگ ہوئی۔ ہم نے مولانا صاحب سے صاف صاف الفاظ میں یہ بات، کہہ دی کہ جن لوگوں نے بے ایمانی کی ہے، اُن کے بارے میں جب تک حکومت ہماری شرط نہ مان لے اُس وقت تک ہم وزارت نہیں بنائینگے۔ مولانا صاحب واپس دہلی چلے گئے اور وہاں سے وائسرائے ہند سے ایک خط لے کر پھر صوبہ سرحد میں آگئے۔ اس خط میں وائسرائے نے کچھ گول مول طریقے سے ہماری یہ شرط مان لی تھی۔ اب ہم نے اپنے ساتھیوں سے صلاح و مشورے کر کے اس شرط پر وزارت بنالی کہ اختیارات ایک مرکزی کمیٹی کے ہاتھ میں رہیں گے۔

جولائی ۱۹۴۶ء میں ہندوستان کے لئے آئین بنانے کی غرض سے میں اور مولانا

ابوالکلام آزاد خدائی خدمتگاروں اور فرنٹیر اسمبلی کی طرف سے آئین ساز اسمبلی کے ممبر منتخب ہوئے تھے ہمارے صوبے کے تین ممبر تھے۔ دو تو ہم تھے اور تیسرا ممبر ضلع ہزارہ کا باشندہ تھا۔ الیکشن میں صرف یہی ضلع ہزارہ تھا جس میں مسلم لیگ کو ووٹ ملے تھے۔ اور مسلم لیگ کے امیدوار کامیاب ہوئے تھے۔ الیکشن میں اس قدر واضح اکثریت حاصل کرکے جس میں واضح مسائل پر ہم نے مقابلہ کیا تھا اور ایسے حالات میں جبکہ مسلم لیگ کو حکومت کی بھی پشت پناہی حاصل تھی اور ہندوستان کے تمام مسلم لیگی لیڈر اور ساری طاقت اور چالاکی ہمارے خلاف استعمال کی گئی تھی، ہماری کامیابی کا مطلب اس کے سوا اور کیا نکلتا ہے کہ ملک کی اکثریت ہماری پشت پر کھڑی تھی۔ لیکن اس کے باوجود جب ہماری نمائندگی کے سلسلے میں صوبہ سرحد میں پھر سے ریفرنڈم کرنے کا حکم ہم پر ٹھونس دیا گیا تو ہمیں قدرتی طور پر اس صریح ظلم کے خلاف غصہ آیا۔ اور ہم نے ریفرینڈم میں حصہ نہ لینے اور اس کا بائیکاٹ کرنے کا فیصلہ کیا، تاکہ دنیا کو ہمارے قہر، غصے اور ہمارے ساتھ کی گئی بے انصافی کا علم ہو جائے۔

وائسرائے کا یہ حکم نہ صرف منطق اور دلیل کے خلاف تھا، بلکہ ایک امتیازی یا استثنائی سلوک بھی تھا جو پشتونوں سے انگریزوں نے جاتے وقت روا رکھا جسے ہم ہرگز برداشت نہیں کر سکتے تھے۔ جہاں سارے ہندوستان میں ہر ایک صوبے کے اُن نمائندوں سے جو اسمبلی میں موجود تھے پوچھا گیا کہ آیا وہ ہندوستان میں رہنا چاہتے ہیں یا پاکستان میں جانا چاہتے ہیں، وہاں صوبہ سرحد کی اسمبلی کو یہ حق نہیں دیا گیا بلکہ سرحد کی اسمبلی اور اس اسمبلی کے ممبروں کی نمائندگی اور نمائندہ حیثیت کو انگریزوں نے پسِ پشت ڈال دیا۔ یہ پشتونوں کی پوری ملت کی بے حرمتی تھی جسے ہم کسی صورت میں بھی برداشت نہیں کر سکتے تھے۔

مجھے افسوس اور دکھ اس بات سے ہے کہ کانگریس ورکنگ کمیٹی نے بھی ہمارے

لیے کوئی غیرت نہ دکھائی اور ہماری حقیر سی امداد کے لیے بھی، جس کی ہمیں ان سے توقع تھی، ہمارے آڑے نہ آئی۔ اس نے ہمارے ہاتھ پاؤں باندھ کر ہمیں دشمنوں کے حوالے کر دیا، حالانکہ کانگریس ورکنگ کمیٹی کی سنگدلی، بے رُخی اور بے حسی آسام کے صوبے کے حق میں ایسی نہیں تھی، جبکہ وہاں کے وزیر اعظم گوپی ناتھ باردولائی نے گروپ بندی ماننے سے انکار کر دیا تھا (کرپس لارنس پلان ۱۹۴۶ء) اور شور مچا تھا۔ باردولائی کی چیخ و پکار اور شور کی وجہ سے کانگریس اس بات پر اڑ گئی تھی اور گروپ بندی کی وہ اسکیم نہیں مانی تھی۔ حالانکہ میں اس کا مخالف نہیں تھا۔ جب مجھ سے گاندھی جی نے دریافت کیا تو میں نے انہیں کہہ دیا تھا کہ تقسیم کی بجائے ہر ایک اسکیم اچھی ہے۔ اس حال میں اور ایسے سلوک کے بعد ایک پٹھان کی حیثیت میں ہم سے یہ پوچھنا بے محل تھا کہ آیا ہم ہندوستان کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں یا پاکستان میں جانا چاہتے ہیں۔ چونکہ کانگریس نے، جو ہندوستان کی نمائندہ جماعت تھی ہمیں نہ صرف اپنے سے دور ہی پھینک دیا تھا، بلکہ ہمیں دشمنوں کے حوالے کر دیا تھا۔ ان سے ملنا تو ہماری پٹھانی غیرت اور اخلاقیات و روایات کے لئے ایک طرح کی موت تھی۔ رہ گیا پاکستان کا مسئلہ تو اس مسئلے پر تو ہم نے مسلم لیگ کے مقابلے میں الیکشن لڑا تھا تو پھر ہمیں نئے سرے سے سر دردی کرنے کی کیا ضرورت تھی۔ ہم نے اسی وجہ سے مطالبہ کیا کہ ہمارے سامنے اگر کوئی ریفرینڈم کرانے کی تجویز رکھتا ہے تو بسم اللہ، وہ میدان میں آئے اور "پختونستان اور پاکستان" کے موضوع پر ریفرینڈم کر لیا جائے۔

ہمارے اس مطالبے پر بھی کسی نے کان نہ دھرے۔ ہم پر ریفرینڈم ٹھونس دیا گیا، چونکہ ہم ریفرینڈم میں حصہ نہیں لے رہے تھے، لہٰذا مسلم لیگ کے لئے میدان صاف تھا۔ ان سے جو چالاکی، فریب اور زور زبردستی ہو سکتی تھی وہ انہوں نے کی۔ لیکن پھر بھی وہ ایک سو میں سے پچاس اعشاریہ ایک ووٹ ہی مرمر کرلے سکے، جو

ایک ملت کی قسمت کا فیصلہ کرنے کے لئے کسی وجہ سے کافی نہیں تھے۔ انگریزوں نے نہ صرف ایک دیانتدار حکومت کی ماتحت اپنے آپ کو اس ریفرینڈم میں غیر جانبدار نہ رکھا بلکہ انہوں نے خود براہِ راست دونوں میں اپنی پولیس اور فوج کے ذریعے حصّہ لیا اور اپنی فوج اور پولیس کے ملازم جوق در جوق پولنگ اسٹیشنوں پر بھیجے کہ وہ اُن لوگوں کے نام سے جعلی ووٹ ڈالیں جنہوں نے ریفرینڈم میں حصّہ نہیں لیا تھا۔

اس سلسلے میں میرے ایک جیل خانے کے ساتھی کرنل بشیر نے ہری پور ہزارہ کے سنٹرل جیل میں ۱۹۵۵ء میں مجھے ایک داستان سنائی جبکہ وہ فوج میں تھا اور اسکی کمپنی بنوں کے قریب لکی مروت میں تعینات تھی۔ اُس نے بتایا کہ وہ تین مرتبہ اپنی کمپنی اور اس کے جوانوں کو پولنگ اسٹیشن پر لے گیا تھا تاکہ پاکستان کے حق میں اُن سے جعلی ووٹ ڈلوائے۔ کرنل بشیر کو بعد میں محکمہ انٹلی جنس میں ایک بڑا افسر مقرر کر دیا گیا تھا۔ جو آخر میں پنشن یافتہ ہو گیا تھا۔ ایک جرم میں دو سال کے لئے قید کی سزا ہوئی تھی اور وہ میرے ساتھ ایک ہی جیل میں رہتا تھا۔

سرحد کے ریفرینڈم کے سلسلے میں لاکھوں کی تعداد میں سرخپوشوں یعنی خدائی خدمتگاروں کے ووٹ سرکاری ملازموں اور ان کے خوشہ چینوں یعنی مسلم لیگیوں نے جعلی طور پر بھگتائے تھے۔ کیونکہ سرخپوشوں نے ریفرینڈم کا بائیکاٹ کر رکھا تھا۔ چنانچہ خان امیر محمد خان کا جعلی ووٹ بھی ایسے ووٹوں میں شامل تھا اور میرا جو اندیشہ تھا وہ درست ثابت ہوا۔

پاکستان کی اٹھارہ سالہ زندگی میں مجھے پندرہ سال جیل خانوں میں رکھا گیا ہے اور پھر ایسی قید میں جو خدا کسی کو نہ دکھائے، آمین! ــــ اس عرصے میں ہزاروں کی تعداد میں خدائی خدمتگار موت کے گھاٹ اُتار دیئے گئے۔ قید و بند میں مبتلا کئے گئے۔ اور ان کے ساتھ ایسے ناروا سلوک ہوئے ہیں اور اُن پر ایسے مظالم توڑے

گئے ہیں جنہیں انسانیت برداشت نہیں کر سکتی۔

ہندوستان کی اس آئین ساز اسمبلی کا مسلم لیگ نے بائیکاٹ کیا تھا۔ میں نے مسلمان ممبروں سے اس مسئلے پر بڑی بحث کی تھی اور ان سے کہا تھا کہ آپ اپنا آئین ساز اسمبلی میں چلے جائیں گے اور اس میں یہ تجویز پیش کر دیں گے کہ ہندوستان میں سوشلسٹ جمہوریت قائم کرنا چاہیئے۔ نیز اگر ہندوؤں نے تمہاری یہ بات مان لی تو ہم فیڈریشن میں رہ جائیں گے اور اگر انہوں نے ہماری یہ بات نہ مانی تو ہم اپنے اپنے صوبوں میں فیڈریشن سے جدا ہونے کی تجویزیں منظور کر لیں گے۔ یہ حق ہمیں حاصل ہے کہ فیڈریشن سے جدا ہو جائیں اور کہ ہمارا صوبہ ایک خود مختار ریاست بن جائے، لیکن مسلمانوں پر ایک ایسی چال چلائی گئی تھی کہ وہ کسی قسم کی بات پر غور و فکر کرنے کے لئے بھی تیار نہیں تھے اور مجھے تو یہ ایک مستقل جواب دیتے تھے کہ "تم ہندو ہو"۔

اس دوران لارڈ پیتھک لارنس وزیر ہند کی رہنمائی میں لندن سے ایک کیبنٹ مشن آیا تھا اور کانگریس کے اس ڈیلیگیشن کا جو ان سے بات چیت کرنے کے لئے بنایا گیا تھا، میں بھی ایک ممبر تھا۔ ہم چار آدمی کانگریس کے تھے۔ ابوالکلام آزاد، جواہر لال، سردار پٹیل اور میں —— اور چار آدمی مسلم لیگ کے تھے۔ جناح، لیاقت علی، نواب اسمٰعیل اور عبدالرب نشتر —— بات چیت شملہ میں شروع ہوئی۔ دوسرے دن بات چیت کے بارے میں ہم نے یہ کہا کہ سب سے پہلے آپ ورکنگ کیبنٹ کے ممبروں سے یہ فیصلہ کریں کہ آیا وہ ہندوستان کو آزاد کرنے اور اپنی فوجیں ہندوستان سے نکال لینے کے لئے تیار ہیں یا نہیں؟ ایسا نہ ہو کہ آپ لوگوں سے دوسری باتوں میں اصلی مطلب گول مال ہو جائے۔

دوسرے دن جب ہم گفت و شنید کرنے کے لئے گئے اور اجلاس شروع ہوا

تو جواہر لال نے یہ دونوں باتیں پیش کر دیں۔ وائسرائے لارڈ ویول نے پنڈت جی سے کہا "ہم تو ہندوستان چھوڑتے ہیں، لیکن یہ تو بتلائیے کہ کس کے حوالے کریں؟ — آپ لوگ آپس میں فیصلہ کرلیں"۔

جواہر لال نے لارڈ ویول کو جواب دیا "مسلم لیگ کے حوالے کر دیجئے لیکن آپ ضرور چلے جائیے"۔

اس بات کا اثر مسٹر جناح پر بھی ہوا اور انھوں نے کہہ دیا کہ اچھی بات ہم گھر میں فیصلہ کرلیں گے۔ اجلاس ملتوی ہو گیا۔ جناح صاحب اور جواہر لال اٹھ کھڑے ہوئے اور ایک دوسرے کمرے میں چلے گئے۔ ایک دو گھنٹے کے بعد باہر آئے اور فیصلہ اس بات پر ہوا کہ تین آدمیوں کی ایک کمیٹی بنائی جائے جس کے لئے ایک ممبر کانگریس منتخب کرے۔ ایک مسلم لیگ۔ اور ان دونوں کا سرپنچ دونوں کی اتفاق رائے سے مقرر کیا جائے۔ جو فیصلے ہم آپس میں متفقہ طور پر کریں گے وہ تو ٹھیک ہوں گے — اور جن باتوں پر ہمارا اختلاف پیدا ہو جائے گا ان کا فیصلہ تین آدمیوں کی یہ کمیٹی کرے گی۔

اس کمیٹی کے ممبران کو منتخب کرنے کے لئے دو دن مقرر کر دیئے گئے۔ تیسرے دن جب ہم آپس میں اکٹھے ہوئے اور لارڈ پیتھک لارنس نے، جو نہایت شریف انگریز تھا، جب جناح صاحب سے پوچھا تو جناح صاحب اس سارے فیصلے سے ہی منکر ہو گئے۔ اس وقت میں نے نشتر صاحب کو اشارہ کیا وہ میرے پاس آگئے۔ میں نے اُن سے کہا کہ جناح صاحب سے کہئے کہ وہ کھیل نہ بگاڑیں کیونکہ گاندھی جی نے میرے سامنے میرے ساتھیوں سے کہا ہے کہ مسلمان جو کچھ بھی مانگیں وہ انہیں دے دو۔ لیکن فیصلہ اتفاق رائے سے کرلو"۔

نشتر صاحب چلے گئے۔ جناح صاحب کے پیچھے کھڑے ہو گئے لیکن جناح صاحب

نے اُن کی طرف کوئی دھیان ہی نہ دیا۔ نشتر صاحب کچھ دیر کھڑے رہنے کے بعد پھر اپنی جگہ پر بیٹھ گئے اور وہ سارا معاملہ گڑبڑ ہو گیا۔ حقیقت یہ تھی کہ انگریز ہندو مسلم اتحاد و اتفاق نہیں چاہتے تھے اور ہندوستان کو تقسیم کرنے پر تلے ہوئے تھے۔

جب کانگریس اور مسلم لیگ کے درمیان باہمی فیصلہ نہ ہو سکا تو کیبنٹ مشن نے اپنا فیصلہ دے دیا اور اپنے فیصلے کا اعلان کر کے مشن واپس چلا گیا۔ اور وائسرائے نے ہندوستان کی عبوری حکومت قائم کر لی اور انگلستان کی پارلیمنٹ نے یہ اعلان کر دیا کہ چھ مہینے کے بعد ہم ہندوستان کو خالی کر دیں گے۔ بعض اختلافات کی بنا پر کانگریس نے عبوری حکومت بنانے سے انکار کر دیا تھا۔ مسلم لیگ نے فیصلہ کر لیا تھا کہ اگر کانگریس نے حکومت قائم نہ کی تو مسلم لیگ کرے گی۔ لیکن وائسرائے نے مسلم لیگ کی یہ تجویز نہ مانی۔ بالآخر کانگریس نے عبوری حکومت بنائی۔ جب یہ گورنمنٹ قائم ہو گئی تو میں نے جواہر لال سے کہا کہ "صوبۂ سرحد کے ان قبائلیوں پر کروڑوں روپے خرچ ہوتے ہیں۔ در اصل وہ روپیہ خود انگریز، قبائل کے سردار، ملک اور نوکر چاکر کھا جاتے ہیں۔ صوبہ اور اس کے باشندے اس سے بالکل محروم رہ جاتے ہیں۔ اس طرح اس قدر بھاری بھرکم خرچ کے باوجود ان لوگوں کو کوئی فائدہ نہیں پہنچا ہے۔ اب جبکہ اختیار ہمارے ہاتھ میں آ گیا ہے، آپ یہ علاقہ بچشمِ خود دیکھ لیں۔ ان لوگوں سے مل لیں۔ یہ لوگ بڑے عاجز مظلوم ہیں اور ان کا ملک، اکثر پہاڑ ہی پہاڑ ہے اور اگر تھوڑا سا احسان بھی ان کے ساتھ ہو جائے اور ان کی قوت لایموت کے واسطے کوئی ذریعہ پیدا ہو جائے اور ان کے بچوں کی تعلیم کے لئے انتظام ہو جائے تو اس کا ان لوگوں پر بہت اچھا اثر ہو گا اور یہ گڑبڑ جو کبھی کبھار ہو جایا کرتی ہے اس کا بھی خاتمہ ہو جائے گا۔"

جواہر لال کو میں نے اس بات پر راضی کر لیا اور انہوں نے مجھ سے وعدہ

کر دیا کہ وہ صوبہ سرحد میں آئیں گے اور ضرور ان لوگوں اور اس علاقہ کو دیکھیں گے۔ اور جس قدر بھی اُن سے ہو سکے گا وہ ان لوگوں کے لیے کریں گے۔ لیکن جس وقت جواہر لال نے سرحد کو جانے کا ارادہ کیا تو والسرائے نے اس کی مخالفت کی اور انہیں قبائلی علاقے میں جانے سے منع کیا۔ پنڈت نہرو نے والسرائے سے کہا کہ انہوں نے اس علاقے میں جانے کا وعدہ کر رکھا ہے اس لئے وہ ضرور جانا چاہتے ہیں۔

والسرائے سمجھ گئے کہ نہرو ٹلنے والا انسان نہیں تو انہوں نے نہرو کے ارادے کی مخالفت تو ترک کر دی لیکن ان کے پیچھے سرحد کے گورنر کو لگا دیا۔ اس وقت سرحد کا گورنر سر اولف کیرو تھا۔ وہ مسلم لیگ کا حمایتی تھا۔ وہ پنڈت نہرو سے ملنے کے لئے دہلی گیا اور ان کے پاس تین دن اور تین رات ٹھہرا، لیکن اُس نے نہرو جی کی اس بات سے اتفاق نہ کیا۔

دہلی سے واپس آکر گورنر سر اولف کیرو نے تمام پولیٹیکل ایجنٹوں کو ہمارے خلاف بُری طرح سے بھڑکا دیا۔ جب نہرو جی صوبہ سرحد میں تشریف لائے تو ہم نے قبائلی علاقہ کا دورہ شروع کر دیا۔ ہمیں معلوم ہو گیا کہ ہمارے لئے کتنی مشکلات پیدا کی گئی ہیں اور وہ سب مشکلات جو ہمارے راستے میں حائل تھیں سب گورنر کیرو کی پیدا کی ہوئی تھیں۔ ہم نے پہلے پہل اپنا دورہ وزیرستان سے شروع کیا۔ وزیرستان کے تمام پولیٹیکل ایجنٹ انگریز تھے۔ ان میں اتنی شرافت تھی کہ انہوں نے ہمارا مقابلہ شریفانہ طریقے سے کیا۔ انہوں نے یہ کیا کہ جس وقت میران شاہ میں جرگہ شروع ہو گیا اور ہم نے جرگے کو مخاطب کیا تو جرگہ اُٹھ کھڑا ہوا۔ جرگے نے یہ بات کہی کہ وہ ہندوؤں کی حکومت نہیں چاہتے اور جب ہم میران شاہ سے رزمک پہنچے تو وہاں بھی صرف یہی کچھ ہوا۔ پھر ہم وہاں سے وانا گئے تو وہاں بھی یہی کچھ ہوا۔ پھر جب ہم لوگ وہاں سے واپس دوبارہ میران شاہ آئے تو ان تمام پولیٹیکل ایجنٹوں سے جن کے ساتھ

ریذیڈنٹ بھی موجود تھا جواہر لال نے پوچھا کہ یہ جو کروڑوں روپیے اس ملک پر خرچ ہو رہے ہیں، اس روپیے سے آپ لوگوں نے ان لوگوں کے لئے کیا کیا ہے ؟ —— ان کے پاس اس بات کا کوئی جواب نہیں تھا۔ میں نے دخل در معقولات کرتے ہوئے کہہ دیا کہ انہوں نے پٹھانوں کے لئے بہت کچھ کیا ہے۔ انگریز میری اس بات پر قدرے خوش ہو گئے۔ لیکن جونہی اپنی اس بات کے بعد میں نے یہ بات کہی کہ انہوں نے پشتونوں کو اس قدر پست ہمت اور بزدل کر دیا ہے اور ان کو اتنا زبردست بنا دیا ہے کہ اگر پٹھان کو پیسہ دکھلا دو تو چاہے ان کا ملک، اسلام اور قوم سب کچھ دریا برد ہو جائیں انہیں ان چیزوں کی فکر نہیں ہوتی۔ وہ کہتے ہیں کہ ان کی بلا سے یہ سب کچھ بہہ جائے" ڈوب جائے، لیکن ان کے پیسے بن جائیں۔

میری یہ بات سُن کر وہ انگریز، جو میری پہلی بات سے خوش ہو گئے تھے، بہت خفا ہو گئے۔ چنانچہ جس وقت ہم سب کھانا کھانے بیٹھے تو وانا کے ایک نوجوان پولٹیکل ایجنٹ نے مجھ سے پوچھا "کیا واقعی ہم نے اس ملک کے لئے کچھ بھی نہیں کیا ہے ؟"

میں نے اُسے جواب دیا "بخدا کچھ بھی نہیں کیا ہے۔ اور اگر کہیں کچھ کیا ہے تو وہ مجھے دکھا دو۔"

میرے اس جواب سے اس پر کیا گزری ہو گی، اس پر دھیان دینے کی ضرورت نہیں اور ہمیں فرصت بھی نہیں تھی۔ ہم وہاں سے ٹانک چلے گئے اور ٹانک سے جنڈولہ گئے۔ اس جگہ کا پولٹیکل ایجنٹ ایک ہندو تھا جس کا نام دیوان شوسرن لال تھا یہاں قبائلیوں نے ہمارا بڑا شاندار استقبال کیا۔ ہمارے پاس دُنبے (برّے) لے آئے اور ہمارے اور ان کے درمیان جتنی باتیں ہوئیں انہوں نے سب باتوں کی تائید کی اور اُن سے اتفاق بھی ظاہر کیا۔ پھر جب ہم جنڈولہ کی طرف جا رہے تھے تو جگہ جگہ قبائلی ہمارے

استقبال کے لئے کھڑے ہوئے تھے ۔اس جگہ سے چل کر ہم لوگ واپس پشاور آگئے۔
دوسرے دن ہم خیبر چلے گئے ۔اس جگہ کا پولیٹیکل ایجنٹ مسلمان تھا صاحبزادہ خورشید اس کا نام تھا۔جب پہلے پہل ہمارا قافلہ جمرود پہنچا تو سڑک سے تھوڑے سے فاصلے پر آفریدی بیٹھے ہوئے تھے اور انہوں نے ہاتھوں میں جوتیاں لی ہوئی تھیں اور اُن جوتیوں کو ہماری طرف کر کے ہلا رہے تھے۔ پھر ہم لوگ تورخام تک چلے گئے (اب پاک افغان سرحد ہے) تورخام میں جب چائے پینے کے بعد ہم لوگ لنڈی کوتل پہنچے تو لوگ سڑک کے کنارے بیٹھے ہوئے تھے اور ہم پر پتھر برسا رہے تھے۔ پولیٹیکل ایجنٹ کی موٹر ہم سے آگے تھی ۔اس نے فوراً اپنی موٹر ٹھہرائی اور وہ موٹر سے اتر پڑا۔ سپاہی اس کے ساتھ تھے۔ اُن لوگوں پر بندوقیں چلا دی گئیں اور وہ وہاں سے بھاگ کھڑے ہوئے۔ پتھراؤ سے ہماری موٹر کے شیشے ٹوٹ گئے لیکن ہم میں سے کسی کو کوئی چوٹ نہ آئی اور نہ ہی ہم میں سے کسی کو پتھر لگا ۔صرف ہمارے ساتھ ایک انگریز تھا۔ وہ اُتر گیا تھا کیونکہ تصویر (فوٹو) لینا چاہتا تھا اُسے ایک پتھر ضرور لگا تھا۔

ہمارا دوسرے دن کا دورہ مالاکنڈ ایجنسی کے لئے تھا۔ ہمیں اطلاع ملی تھی کہ مالاکنڈ کا پولیٹیکل ایجنٹ پشاور آیا تھا اور اس نے گورنر سے ملاقات کی تھی۔ یہ آدمی انگریزوں کا ایک بہت بڑا بے ضمیر ایجنٹ تھا۔ اس پر کمینہ پن ختم تھا۔ اس کا نام شیخ محبوب علی تھا۔ اسی شیخ محبوب علی کے ہاتھوں ہماری قوم نے بڑی تکالیف اور روحانی عذاب اٹھائے ہیں اور یہ وہ آدمی ہے جو کابل میں برطانوی سفیر ڈیوڈ ہیمفری کی چاکری میں اس لئے نام پیدا کر چکا تھا کہ افغانستان میں امان اللہ خان کی حکومت کا تختہ اُلٹنے اور بچہ سقہ کو برسر اقتدار لانے میں سرگرم کار رہا تھا۔ ہمارے ساتھ جتنا خوشگوار سلوک ہوئے وہ اسی کے طفیل سے تھے۔ ان

واقعات میں ایک واقعہ مالاکنڈ کا بھی تھا۔

انسان غرور و نخوت میں خدا کو بھول جاتا ہے اور زعم میں نہ جانے کیا کچھ کر بیٹھتا ہے، لیکن خدا کی بے آواز لاٹھی اور قہر و غضب کو نہیں بھولنا چاہیئے۔ دنیا جانتی ہے کہ آج اسی محبوب علی کے گھر میں گدھے رینگ رہے ہیں۔ آخری زندگی میں وہ اس قدر بے عزت اور غمزدہ ہوا کہ اس کی حالت دیکھ کر سنگدل سے سنگدل انسان کا دل بھی پارہ پارہ ہو جاتا تھا۔ اس کے گھر میں صرف دو لڑکیاں اور ایک عورت تھی۔ اس کی ایک لڑکی کو اس کے بھتیجے نے اس کے گھر کے اندر اس کے سامنے ہی پستول سے اڑا دیا۔ دوسری لڑکی اپنی موت مر گئی اور اس کی عورت اس کا سارا مال و متاع لے کر بھاگ گئی۔ آج ملک میں اس کا کوئی نام و نشان بھی باقی نہیں ہے۔ نہ اس کی کوئی اولاد ہے، نہ کوئی گھر در ہے اور نہ ہی نام و ناموس۔ اور خود بھی خدا کو حساب دینے کے لئے دنیا سے اٹھ چکا ہے ؎

توہم شب را بسر کے می بری اے شمع کم فرصت
گرفتم سوختی پروانہ آتش بہ جائے را

ہاں تو مالاکنڈ ایجنسی کا پولیٹیکل ایجنٹ یہی شیخ محبوب علی تھا۔ میں نے پنڈت جواہر لال سے پوچھا کہ مالاکنڈ جائیں گے؟۔ انھوں نے کہا کہ ہم اپنا پروگرام تو نہیں چھوڑیں گے۔ وزیرستان میں تو ہمارے ساتھ فوج تھی لیکن جب خیبر جا رہے تھے تو فوج نہیں تھی، پولیس تھی۔ میں نے ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ ہم مالاکنڈ جائیں گے۔ لہٰذا فوج کا کچھ انتظام کیجئے اور اگر آپ فوج کا انتظام نہیں کر سکتے تو ہم اپنے خدائی خدمتگاروں کا انتظام کر لیتے ہیں اور دیکھئے کہ پولیس کا یہ موجودہ انتظام ہرگز منظور مت کیجئے۔

ڈاکٹر صاحب نے کہا "بہت اچھا۔ میں ضرور فوج کا انتظام کروں گا۔"

لیکن جب ہم رسالپور میں پہنچے تو کیا دیکھتے ہیں کہ وہی پولیس کھڑی ہے۔ یہ دیکھتے ہی میں بہت خفا ہوا۔ ایک دفعہ تو میں نے ارادہ کیا کہ میں ان (جواہر لال ڈاکٹر خان صاحب اینڈ پارٹی) کے ساتھ بالکل نہ جاؤں۔ پھر میں نے سوچا کہ جواہر لال تو میری خاطر ہی آئے ہیں، لہٰذا انہیں تو میں اکیلا نہیں چھوڑوں گا۔ لہٰذا مجبوراً میں اُن کے ساتھ چل پڑا۔ ہم مالاکنڈ میں اپنے مقررہ وقت سے پہلے پہنچ گئے۔ وہاں کوئی بھی نہیں تھا۔ جب ہم قلعے میں بیٹھے چائے پی رہے تھے تو اسی اثنا میں ہم نے کچھ نعرے سُنے کہ یہ شیخ کا لشکر ہے اور اسی وقت کے مطابق آیا ہے جو اسے بتایا گیا تھا، لیکن ہم تو ان کی آمد سے پیشتر پہنچ گئے تھے۔

اسی ایجنسی (مالاکنڈ) میں بھی ہمارے خدائی خدمتگار تھے۔ راحت خان ہمارا ایک ممتاز کارکن رات کو ہمارے پاس آیا۔ اس نے اطلاع دی کہ شیخ محبوب علی نے بہت سے لوگ بلائے ہیں، لہٰذا آپ لوگ بہت احتیاط اور غور و فکر سے کام لیں۔ ہم نے رات تو مالاکنڈ میں گزار دی۔ شیخ محبوب علی ہمارے ڈاکٹر خان صاحب کی بڑی خوشامد اور چاپلوسی کرتا رہا۔ اور ڈاکٹر صاحب کی یہی کمزوری تھی کہ وہ خوشامد اور چاپلوسی کے سامنے نہیں ٹھہر سکتے تھے۔ جب صبح صادق نمودار ہوئی اور ہمارے روانہ ہونے کا وقت ہونے لگا تو میرے پاس ایک خدائی خدمتگار آیا اور اُس نے خبر دی کہ ہم لوگوں کے آگے بہت سے لوگ راستے میں کھڑے کر دیے گئے ہیں لہٰذا روانہ ہونے سے پہلے ہمیں اپنا انتظام کر لینا چاہیے۔ میں نے ڈاکٹر صاحب کو علیحدہ کر کے یہ بات کہی۔ شیخ دور کھڑا تھا اور ہمیں دیکھ رہا تھا۔ پھر وہ آہستہ سے ڈاکٹر صاحب کے پاس آیا اور اُن سے دریافت کرنے لگا کہ کیا بات ہے؟ ڈاکٹر صاحب نے اسے حالات سے آگاہ کیا تو اس نے ڈاکٹر صاحب سے کہا: "کیا آپ میرے باپ نہیں ہیں۔ میں پٹھان نہیں ہوں کیا؟ میں ایسا حرامی ہوں کہ آپ سے غلط برتاؤ کروں گا؟"

ڈاکٹر صاحب نے ہم سے کہا چلو چلیں۔ ڈاکٹر صاحب نے شیخ کے بھروسے میں اکثر پولیس گارڈ کا انتظام بھی نہ کیا اور چل پڑے۔ شیخ آگے آگے جا رہا تھا اور ہم اس کے پیچھے پیچھے روانہ ہوئے۔ قلعہ کے دروازے میں انگریز جواہر لال کے لئے کھڑے ہوئے تھے۔ ہم نے موٹر روک لی۔ انہوں نے جواہر لال سے خدا حافظ کہا۔ اس اثناء میں شیخ محبوب علی وہاں سے رفوچکر ہو گیا۔ ہم جب قلعے سے باہر نکلے اور انگریزوں سے تھوڑا اس طرف ہوئے تو لوگ کھڑے تھے اور انہوں نے ہم پر پتھروں کا مینھ برسانا شروع کر دیا۔ انہوں نے سڑک پر لاری کھڑی کر رکھی تھی اور سڑک بند کر دی تھی۔ ہم پر پتھر برس رہے تھے۔ ایک پتھر میری پیٹھ میں لگا۔ میں قدرے بے ہوش ہو گیا۔ ہمارے ساتھ ایک جمعدار موٹر میں آگے بیٹھا ہوا تھا۔ وہ پتھروں سے بچنے کے لیے سیٹ پر جھک گیا تھا۔ اس کے پاس پستول تھا جس پر ڈاکٹر صاحب کی نظر جا پڑی۔ ڈاکٹر صاحب نے فوراً وہ پستول اس کے تاش سے باہر کھینچ لیا اور موٹر سے اپنا ہاتھ باہر نکالا اور جو لوگ ہمیں پتھر مار رہے تھے انہیں آواز دی کہ وہ ہٹ جائیں اور باز رہیں ورنہ گولی چلا دی جائے گی۔ لوگوں نے پستول دیکھا تو ہٹ کر دور چلے گئے۔ آگے لاری کھڑی تھی۔ ڈاکٹر صاحب نے پھر وہی پستول ڈرائیور کو دکھایا اور بولے "راستہ چھوڑ دو ورنہ ابھی تمہیں جہنم رسید کرتا ہوں۔"

ڈرائیور بھی لاری لے کر راستے سے ہٹ گیا۔ اس طرح ہم اس مصیبت سے بچ گئے۔ ہمیں قلعے کے دروازے کے اندر پتھر مارے گئے۔ انگریز ہمیں پٹتے دیکھ رہے تھے اور کچھ نہیں کرتے تھے، حالانکہ ہمارے ساتھ مرکزی حکومت کے بڑے وزیر جواہر لال تھے جن کے ہاتھ میں قبائلی علاقے کی باگ ڈور بھی تھی اور صوبہ سرحد کے وزیر اعظم ڈاکٹر خان صاحب بھی ہمارے ہمراہ تھے۔ جب ہم لوگ مالاکنڈ کے پہاڑ سے نیچے اترے تو ٹھہر گئے، کیونکہ ہماری موٹر کے شیشے ٹوٹ چکے تھے اور ہم زخمی ہو گئے

تھے۔ ہم لوگ موٹر سے اُتر پڑے۔ اتنے میں ہم کیا دیکھتے ہیں کہ ہماری گارڈ ہمارے سامنے آ گئی ہے۔ مردان کا ڈپٹی کمشنر جس کا نام کرٹس تھا وہ ہماری اس گارڈ کا انچارج تھا اور اسے حکومت نے ہماری حفاظت کے لئے مقرر کیا تھا وہ ہمارے پاس آیا اور ڈاکٹر صاحب کے آگے کچھ عذر معذرت کرنے لگا۔ حالانکہ وہ اور شیخ باہمی صلاح و مشورے سے یہ سب کچھ کر رہے تھے۔

جب ہم اس جگہ سے روانہ ہو رہے تھے تو میں نے ڈاکٹر صاحب سے کہا کہ آپ اپنی گارڈ کو حکم دیں کہ اُن کی ایک لاری ہم سے آگے رہے اور دوسری ہمارے پیچھے چلے اور جب سڑک پر آدمیوں کو دیکھے تو آگے والی لاری ٹھہر جائے سپاہی نیچے اُتر آئیں اور ان لوگوں کو منتشر کر دیں اور اگر منتشر نہ ہوں تو ان پر لاٹھی چارج کریں اور اگر پھر بھی منتشر نہ ہوں تو ان پر یہ دوسری لاری گولیاں چلا دے۔ خیر جب ہم مالاکنڈ سے نیچے اُترے اور درگئی میں پہنچ گئے تو پھر راستے میں لوگ کھڑے تھے۔ اور انھوں نے ہمیں پتھر مارے۔ ایک پتھر، جو ایک آدمی نے جواہر لال کی طرف پھینکا تھا، میں نے اپنے ہاتھ پر جھیل لیا۔ اور جواہر لال بچ گئے مگر میرا ہاتھ ٹوٹ گیا۔ ایک آدمی نے گندگی کی ایک ہانڈی اُٹھائی ہوئی تھی۔ اُس نے وہ ہانڈی موٹر پہ دے ماری۔ میں اور جواہر لال تو دونوں بچ گئے لیکن ڈاکٹر صاحب گندگی سے لت پت ہو گئے۔

ہم مصیبت سے پشاور پہنچے۔ وہ ساری مصیبت ڈاکٹر صاحب کے کارن کھینچنے کو ملی۔ اگر انہوں نے ہمیں اپنا انتظام کرنے دیا ہوتا تو ہم اپنا انتظام بڑی خوبی سے کر سکتے تھے۔ دوسرے دن ہمارے مرکز میں جلسہ تھا۔ ہم نے وہاں اپنا انتظام کیا تھا کہ حکومت کی سازش کے باوجود کسی کو اتنی جرأت نصیب نہ ہوئی کہ ہمارے یا ہمارے جلسے کے نزدیک بھی پھٹکتا۔

دوسرے دن ہم نے ڈاکٹر خان صاحب کو کہلا بھیجا کہ ہم نے اپنا انتظام کر لیا ہے

ہمیں آپ کی اور آپ کی حکومت کے انتظام کی ضرورت نہیں۔ جب ہم نے اپنا سارا انتظام مکمل کر لیا اور میں جواہر لال کے ساتھ بیٹھا ہوا تھا تو مجھے اطلاع ملی کہ آج بہت سے انگریز ڈاکٹر صاحب کے بنگلے میں بیٹھے ہوئے ہیں اور کہ وہ فوج کا انتظام کر رہے ہیں۔ اتنے میں خود ڈاکٹر صاحب ہمارے پاس آ گئے۔ میں نے انہیں کہا۔ ان انگریزوں کو اب رخصت کیجیے۔ ہمیں ان کی اور ان کی فوج کی ضرورت نہیں۔ آج ہم نے اپنا انتظام خود کیا ہے۔

ڈاکٹر صاحب نے کہا: "جانے دیجیے، کوئی ہرج نہیں، انہیں انتظام کرنے دیجیے۔"

میں نے ڈاکٹر صاحب سے کہہ دیا کہ میں انہیں ہرگز نہیں آنے دوں گا اور میں خود باہر چلا گیا۔ اور انگریزوں سے کہہ دیا کہ جب ہمیں ان کی طرف سے حفاظت اور انتظام کی ضرورت تھی تو اُن لوگوں نے ہماری وہ ضرورت پوری نہ کی۔ آج ہمیں اُن کی اور ان کے انتظام کی ضرورت نہیں ہے۔ ہم نے اپنا انتظام خود کر لیا ہے۔ وہ مہربانی فرمائیں اور تشریف لے جائیں اور ہمارا پیچھا چھوڑ دیں۔

انگریزوں نے ملا گوری سے مل کر ہمارے خلاف سازش کر رکھی تھی۔ ملا گوری پیر بابا کی صاحب کے مرید ہیں۔ انگریزوں نے انہیں کہا تھا کہ جو سڑک ستمرے سے ہو کر چارسدے کی پختہ سڑک سے نکلی ہے، اُس جگہ (پشاور سے انیس میل کے فاصلے پر) جب ہم پہنچیں تو وہ ہم پر حملہ کر دیں، لیکن ہم نے اپنا پورا انتظام کر رکھا تھا۔ مسلم لیگ کا ارادہ تو فساد کرنے کا تھا، لیکن انہیں جرأت نصیب نہ ہوئی۔ ہم نے پشاور سے اپنے مرکز سر دریاب تک سڑک کے دونوں کناروں پر خدائی خدمتگاروں کو ان کی سرخ وردیوں میں ملبوس کر کے کھڑا کر رکھا تھا اور دیہاتوں کے لوگ جنہیں مالاکنڈ کے واقعے کی اطلاع مل چکی تھی وہ لوگ بھی اپنے اسلحہ جات لے کر آئے ہوئے

تھے۔ یہ لوگ سرخ پوشوں کے عقب میں کھڑے ہوئے تھے، کیونکہ خدائی خدمتگار تو تشدد نہیں کرتے اور اسلحہ اپنے پاس نہیں رکھتے، لیکن عام پٹھانوں پر تو یہ پابندی نہیں تھی۔ انہیں ہم سے ہمدردی تھی اور وہ ہمارے ہمدرد تھے ۔ وہ لوگ سرخ پوش نہیں تھے ۔ وہ کہتے تھے کہ اگر کوئی تشدد کرے گا تو ہم اسے تشدد کا جواب تشدد سے دیں گے۔

مسلم لیگ کے کچھ لوگ فساد کرنے کی نیت سے ہمارے مرکز میں آئے بھی تھے۔ لیکن انہوں نے اِن لوگوں (مسلح دیہاتیوں) کو دیکھا تو بھاگ گئے۔ مرکز میں لاکھوں لوگ آئے تھے۔ خدائی خدمتگاروں نے جلسے کا بہت اعلیٰ انتظام کیا تھا۔ جلسہ نہایت کامیاب رہا۔ اس جلسے میں خدائی خدمتگاروں کی طرف سے جواہر لال کو ایک سپاسنامہ دیا گیا۔ جواہر لال نے اس کے جواب میں تقریر کی اور اس کے بعد میں نے تقریر کی۔ پھر جلسہ برخاست ہوا۔ ہم پشاور واپس آگئے اور دوسرے دن جواہر لال نہرو دہلی لوٹ گئے۔

(۱۹)

۱۹۴۵ء میں جب میں جیل خانے سے باہر آیا تو اُس وقت سخت بیمار تھا۔ میں جیل خانے میں ہمیشہ بیمار پڑ جاتا ہوں۔ انہی دنوں مہاتما گاندھی بمبئی میں تھے۔ انہوں نے مجھے لکھا کہ میں بمبئی آجاؤں۔ میں جب کبھی بمبئی یا سیواگرام جاتا تھا تو ایک رات راستے میں دہلی میں دیوداس گاندھی جی کے صاحبزادے اور راجہ جی کے داماد) کے گھر ٹھہرا کرتا تھا۔ دیوداس کی دھرم پتنی بڑی اچھی خاطر مدارات کرتی تھی اور دیوداس کا گھر مجھے اپنے گھر کی طرح لگتا تھا۔ میں یہ نہیں محسوس کرتا تھا کہ یہ کسی غیر کا گھر ہے۔ میں بمبئی چلا گیا۔ گاندھی جی برلا کے گھر تشریف فرما تھے۔ میں بھی انہی کے ساتھ ایک ہی جگہ رہنے لگا۔ ایک دن باتوں باتوں میں عدم تشدد کا ذکر آگیا۔ میں نے انہیں کہا۔ "گاندھی جی! آپ نے تو بڑی مدت سے ہندوستان کو عدم تشدد کا سبق دیا ہے۔

لیکن مجھے بہت تھوڑا عرصہ ہوا ہے کہ میں نے یہ سبق پٹھانوں کو دینا شروع کیا ہے۔
اس عدم تشدد کو پٹھانوں نے ہندوستانیوں کی نسبت جلد اور زیادہ سیکھ لیا ہے۔
اور آپ دیکھیں کہ ۱۹۴۲ء کی اس جنگ میں ہندوستان میں کتنا تشدد ہوا ہے،
لیکن صوبہ سرحد میں انگریزوں کی طرف سے اس قدر اشتعال انگیزی اور زور ظلم کے
باوجود ایک پشتون نے بھی تشدد نہیں کیا ہے۔ حالانکہ تشدد کا سامان بھی ہم لوگوں
کے پاس زیادہ ہوتا ہے۔"

اس کے جواب میں گاندھی جی نے مجھ سے کہا: "عدم تشدد بزدل آدمی کا کام
نہیں ہے۔ یہ بہادر آدمی کا کام ہے اور پشتون ہندوستانیوں سے زیادہ بہادر ہیں۔
یہی وجہ ہے کہ انہوں نے تشدد نہیں کیا ہے۔"

ہریجن کالونی یا سیواگرام میں جب ہم رہتے تھے اور جب پرارتھنا کا وقت
ہوتا تھا تو سب سے پہلے میں قرآن شریف کی تلاوت کیا کرتا تھا۔ میرے بعد ایک
جاپانی بدھ مذہب کا پیروکار اپنی مناجات بیان کرتا تھا۔ اور اس کے بعد ہندوؤں کی
پرارتھنا شروع ہوتی تھی۔ گاندھی جی کے دل میں سب مذہبوں کے لئے یکساں احترام
تھا اور وہ ان تمام مذاہب کو مبنی برحق سمجھتے تھے۔ اور بعینہٖ یہی میرا عقیدہ ہے۔
قرآن اور گیتا کا مطالعہ تو میں نے بڑی اچھی طرح کیا ہے اور جب میں سکھوں کے
ساتھ ڈیرہ غازی خان کے جیل میں تھا تو ان سے میں نے گرنتھ صاحب کا کافی زیادہ
حصہ سنا تھا۔ بدھ مذہب کے مطالعے کا مجھے بڑا شوق تھا۔ کیونکہ ہم لوگ خود بھی اسلام
سے پہلے بودھ تھے۔ لیکن بدھ مذہب کی کوئی کتاب میرے ہاتھ نہیں لگ سکی۔ انجیل
میں نے طالب علمی کے زمانے میں مشن ہائی اسکول میں پڑھی تھی۔ کیونکہ میں اسی اسکول
کا طالب علم تھا۔ توریت میں نے تھوڑی بہت جیل خانے میں پڑھی تھی۔ زرتشت کے
پارسی مذہب کی کتابوں کے مطالعے کا مجھے بڑا شوق تھا۔ کیونکہ وہ ہماری پٹھان

قوم کا پیغمبر تھا۔ جو افغانستان میں بلخ کا رہنے والا تھا لیکن اس وقت تک یہ لٹریچر مجھے میسر نہ آسکا۔ خورشید بہن اور بعض دیگر پارسی دوستوں کو میں نے اس کے لئے کہا تھا، لیکن کسی نے کوئی کتاب میرے پاس نہیں بھیجی۔ "میرا مذہب سچائی، پریم پیار اور خلقِ خدا کی خدمت ہے۔" مذہب ہمیشہ دنیا میں اخوت اور محبت کا پیغام لے کر آتا ہے اور جن لوگوں کے دلوں میں بنی نوع انسان کے لئے رواداری اور پریم پیار نہیں ہوتا اور جس آدمی کے دل میں نفرت ہوتی ہے ایسا آدمی مذہب سے بہت دور ہوتا ہے اور مذہب کی حقیقت سے بہت بے خبر ہے۔

۱۹۴۶ء میں ہندوستان میں جو فسادات شروع ہوئے تھے اُن کی ابتدا مسلم لیگ نے اپنے کلکتہ کے ڈائرکٹ ایکشن سے کی تھی۔ کلکتہ کے فسادات میں شروع میں تو ہندوؤں کے کچھ آدمی مارے گئے تھے، لیکن جب ہندوؤں اور سکھوں نے مسلم لیگ کے مانند تشدد کا اقدام کیا تو پھر اس مگہ کے مسلمانوں کا ناقابلِ بیان اور ناقابلِ تلافی مالی اور جانی نقصان ہوا۔ مسلم لیگ نے اس سلسلے کو جاری رکھنے کی غرض سے نواکھلی میں کلکتہ کا بدلہ لینے کے بہانے سے ہندوؤں پر زمین آسمان ایک کردیا۔ اور ایسے مظالم توڑے اور بے حیائی سے بھرے کام کئے کہ انسانیت نے شرم کے مارے اپنا مُنہ چھپا لیا۔ فرنگی اپنی پالیسی "پھوٹ ڈالو اور حکومت کرو" کے مطابق ہندوؤں کو بھی اپنے جال میں لے آئے اور انہوں نے بھی نواکھلی کا بدلہ لینے کے بہانے سے بہار میں مسلمانوں اور غریبوں پر چنگیز اور ہلاکو کے جور وجفا کی یادیں تازہ کردیں۔ مسلم لیگیوں کے دل کی مراد بر آئی۔ وہ خدا سے یہ دن مانگتے تھے۔

اس طرح کے مکروہ اور ناپاک ارادوں کے ساتھ وہ (مسلم لیگی) یا تو برسرِ اقتدار آنا چاہتے تھے اور یا پھر ملک کے ٹکڑے کرنے پر تُلے ہوئے تھے۔ اس کے لئے انہوں نے ملک کے ایک سرے سے دوسرے سرے تک ہندوستان بھر میں فسادات کی آگ

لگادی اور اپنے ہاتھ رنگنے شروع کر دیئے۔ انگریز لیگیوں کی ان حرکتوں پر بڑے خوش تھے کیونکہ ہندوستان کی ان خرمستیوں سے انگریز نوکر شاہی انگلستان کی مزدور پارٹی کی حکومت پر یہ بات واضح اور ثابت کرنا چاہتی تھی کہ ہندوستان کے لوگ درندوں کی مانند ایک دوسرے کے خون کے پیاسے ہیں اور ایک دوسرے کا گوشت پوست ادھیڑنے کے درپے ہیں اور یہ کہ انسانوں کی طرح رہنے کے شعور کا تو ان میں بالکل فقدان ہے۔ لہٰذا ان کے سروں پر انگریز کی حکومت کا تسلط ضروری ہے اور اگر ایسا نہیں ہوگا تو یہ ایک دوسرے کو تباہ و برباد کر دینگے۔

مسلم لیگ انگریزوں کی اپنی پیداوار تھی اس لئے انہوں نے بھی صورت حال کا ناجائز فائدہ اٹھانا پسند کیا اور ملک کا امن وسلامتی مٹانے کے لئے انگریز مسلم لیگیوں کی پشت و پناہ بن گئے۔

میں خود بہار میں گیا تھا۔ پٹنہ کے ضلع میں مسلمانوں کی بڑی بھاری تباہی ہوئی تھی۔ اس صوبے میں جگہ بہ جگہ گھروں کو لوٹا اور برباد کیا گیا تھا اور آگ لگادی گئی تھی اور بہت سے لوگ بھی ان میں مارے گئے تھے۔ میں نے جب اس علاقے کا دورہ شروع کیا اور دیہات کو دیکھا تو وہ ویران و برباد پڑے تھے اور لوگ وہاں سے بھاگ گئے تھے اور جو لوگ ان میں رہ رہے تھے وہ سب کیمپوں میں پڑے تھے۔ لیکن ان کی اس قدر تباہی پر بھی مسلم لیگ کا دل ابھی ٹھنڈا نہیں ہوا تھا۔ وہ اسی طرح فرقہ وارانہ سازشوں میں لگے ہوئے تھے۔ انہی مظلوموں سے سیاسی استفادے کر رہے تھے اور انہیں یہ ترغیب دے رہے تھے کہ "بنگال میں ہجرت کر جاؤ" اور میں اس فکر میں ڈوبا ہوا تھا کہ انہیں پھر ان کے اپنے آبائی گاؤں اور گھروں میں از سر نو آباد کر دوں، لیکن انہیں مسلم لیگیوں نے ایسے تان پر چڑھا یا ہوا تھا کہ میری باتیں انھیں اچھی نہیں لگتی تھیں۔ اس لئے میں مسلم لیگیوں کے لیڈروں کے

پاس گیا۔ یہ لوگ محمد یونس بیرسٹر کے ایک عالیشان مکان میں ڈیرے ڈالے ہوئے تھے اور جب کبھی میں ان کے ہاں گیا ہوں تو وہ کھانے پینے میں لگے ہوئے ہوتے تھے۔

میں نے انہیں کہا "میں آپ لوگوں کے پاس آیا ہوں اور آپ کی خدمت میں یہ عرض کرتا ہوں کہ بہت ہو چکی ہے، اب ان غریبوں کو معاف کر دو۔ جو تباہی ان کی ہو چکی ہے کیا یہ کم تباہی ہے؟۔ اگر آپ لوگ انہیں بنگال میں ہجرت کر جانے کا مشورہ دیتے ہیں اور حقیقی معنوں میں انہیں وہاں آباد کرنا چاہتے ہیں تو مجھے اس پر کوئی اعتراض نہیں ہے۔ اور اگر انہیں اپنی سیاسی اغراض کے آلۂ کار بنانا چاہتے ہیں تو یہ مناسب نہیں ہے۔ یہ لوگ کافی تباہ ہو چکے ہیں انہیں زیادہ برباد نہ کریں"

لیکن ان مسلم لیگیوں کے دل میں رحم کہاں تھا۔ انہوں نے انہیں (بہاریوں کو) بنگال کی طرف بھجوا دیا۔ برسات کا موسم قریب تھا اور میرا یہ خیال تھا کہ برسات شروع ہونے سے پہلے ان کے مکانات تیار ہو جائیں اور یہ لوگ اپنے گاؤں میں آباد ہو جائیں، لیکن مسلم لیگیوں نے میرے ساتھ اس بات میں اتفاق نہ کیا، کیونکہ وہ لوگ آبادی کے لئے تو ہیں نہیں وہ تو بربادی چاہتے ہیں جو مسلمان بنگال گئے اُن کی حالت اس سے بھی بدتر ہوئی۔ کچھ تو راستے ہی میں مر گئے تھے اند کچھ بنگال میں جا کر مر گئے اور جو باقی بچ گئے وہ واپس پہنچ آ گئے۔ اب اُن کے دماغ قدرے ٹھکانے آ گئے تھے اور یہ بات بھی ان کی سمجھ میں آ گئی تھی کہ مسلم لیگی ان کے لئے کچھ کرتے کراتے تو ہیں نہیں اور نہ ہی کچھ کر سکتے ہیں بلکہ انہیں اپنے سیاسی مقاصد کے لئے استعمال کر رہے ہیں اور انہیں کسی قسم کی امداد بہم نہیں کرتے اور نہ ہی کر سکتے ہیں۔

بہت سے ایسے مسلمان جنہوں نے زمین میں اپنے مال دفن کئے تھے چاہتے تھے کہ کوئی ایسا آدمی مل جائے جو اُن کے ساتھ جاکر ان کا مال زمین سے نکالنے میں ان کی مدد اور رہنمائی کرے، لیکن مسلم لیگی تو ڈر کے مارے بیٹھے سے باہر نہیں نکل سکتے تھے۔ صرف میں ہی واحد آدمی تھا جو انہیں ان کے دیہات میں لے جاتا تھا اور وہ اپنے اپنے دفینے زمینوں سے نکال لیتے تھے۔ الغرض میں نے یہ کام بخوبی ان کے ساتھ سرانجام دے دیا اور کسی نے بھی کوئی تعرض نہ کیا اور نہ ہی کسی قسم کی چھیڑ چھاڑ کی اور نہ ہی کسی کو میری موجودگی میں انہیں چھیڑنے کی جرأت ہوئی۔ بالآخر بڑی تکالیف اور مصائب کے بعد یہ لوگ میرے پاس آئے۔ اور مجھے کہا کہ برسات آنے والی ہے۔ اگر میں حکومت بھاپنا اثر و رسوخ استعمال کر کے انہیں مکانات بنوا دوں تو وہ اپنے اپنے گھروں اور گاؤں میں جانا چاہتے ہیں۔ میں نے حکومت سے کہہ دیا اور حکومت نے فوراً اُن کی آبادکاری کے لئے حکم جاری کر دیا۔ اور گاؤں میں گھر بننے شروع ہو گئے۔

برسات قریب تھی کام ہو رہا تھا اور بڑی خوش اسلوبی سے سرانجام پا رہا تھا۔ لیکن میرا خیال تھا کہ اگر مہاتما جی بہار میں آجائیں تو یہ کام اور بھی تیز رفتاری سے ہونے لگے گا اور برسات شروع ہونے تک تکمیل کو پہنچ جائے گا۔ اس لئے میں نے گاندھی جی کو لکھا۔ وہ ان دنوں نوا کھلی میں تھے کیونکہ وہاں بھی بڑی بربادی ہوئی تھی۔ مہاتما جی میرا خط دیکھتے ہی بہار میں آگئے اور علاقے کا دورہ شروع کر دیا اور مسلمانوں کی بڑی حوصلہ افزائی اور دلجوئی کی۔ ان کو ہر طرح تسلی دی۔ ان کے آنے سے کام بھی بڑے زور و شور سے جاری ہو گیا۔ مردولا بہن بھی گاندھی جی کے ہمراہ تھیں اور وہ اس وقت مہاتما جی کی سکریٹری تھیں۔ انہیں بھی مسلمانوں کے ساتھ بڑی ہمدردی تھی اور انہوں نے

مسلمانوں کی بڑی خدمت کی، جس کی وجہ سے میں اُن کا ابھی تک شکرگزار ہوں۔ اور اس جگہ پر ہی میرا مردلا سے باپ و بیٹی کا سچا رشتہ قائم ہوا، جسے ہم دونوں ابھی تک نبھا رہے ہیں۔

بہار کے بعد پنجاب اور سرحد کی باری آگئی، جہاں بہار کا بدلہ لینے کی غرض سے مسلم لیگیوں نے نہ صرف ہندوؤں اور سکھوں پر زمین و آسمان تنگ کر دیا تھا۔ بلکہ ہمارے صوبہ سرحد میں خدائی خدمتگاروں کی آئینی حکومت کو ختم کرنے کی غرض سے غیر آئینی سرگرمیاں اور غنڈہ گردی شروع کر دی۔ میں اس موقع پر بہار کے مصیبت زدہ اور مظلوم مسلمانوں کی امداد و خدمت کے لئے بہار میں تھا۔

صوبہ سرحد کی اسمبلی کا بجٹ اجلاس شروع تھا۔ پنجاب میں ملتان، امرتسر، انبالہ، راولپنڈی اور گجرات و گوجرانوالہ وغیرہ مقامات پر فسادات ہوئے۔ ان کے شعلے پشاور میں بھی آ پہنچے۔ حملوں اور بدکلامیوں کے ذریعے مسلم لیگیوں نے ڈاکٹر خان صاحب سے مستعفی ہونے کے مطالبے کرنے اور نعرے لگانے شروع کر دیئے۔ انہوں نے پشاور کے بازاروں اور گلیوں میں بے گناہ لوگوں کو قتل کرنا شروع کر دیا۔ ضلع ہزارہ کی ایک ہندو لڑکی کو حاصل کرنے کے لئے "لیگی سول نافرمانی" بھی شروع ہو گئی۔ ڈاکٹر خان صاحب کی وزارت کو ٹھوس اکثریت حاصل ہونے کی وجہ سے ہٹا دینا تو ان کے بس کا روگ نہیں تھا۔ انہوں نے بدمعاشی اور غنڈہ گردی کے طریقے اور راستے اختیار کرلئے۔ مرکزی عبوری حکومت میں جواہر لال اور دیگر کانگریسی وزیروں کا مسلم لیگ کے عدم تعاون کی وجہ سے ناک میں دم آچکا تھا۔ حتیٰ کہ کانگریس خلاف توقع ملک کی تقسیم کا مطالبہ منظور کرنے کے لئے بھی تیار ہو گئی اور جس وقت ۳ جون ۱۹۴۷ء کو لارڈ

ماؤنٹ بیٹن کی طرف سے تقسیم کا اعلان ہوا اور کانگریس اور مسلم لیگ نے دستوری طور پر پاکستان کو تسلیم کر لیا تو ڈاکٹر خان صاحب نے تمام مسلم لیگیوں کو جیل خانوں سے رہا کر دیا اور ویسے بھی انگریزوں نے جیل خانے مسلم لیگیوں کے لئے کلب گھر بنا رکھے تھے۔ صوبہ سرحد کے جیلوں کے اکثر قیدی راتیں اپنے گھروں میں گزارتے تھے اور اکثر کھلے بندوں بازاروں میں گھوما پھرا کرتے تھے۔

کانگریس کی حکومت برائے نام ہی تھی۔ ڈاکٹر صاحب کے ساتھ سرکاری افسران اور انگریز مطلق تعاون نہیں کرتے تھے۔ لیکن ہندوؤں کو اس وزارت سے بڑا فائدہ بر حاصل تھا کہ انگریز گورنران کی مکمل تباہی اس وجہ سے نہیں کر سکتا تھا کہ ڈاکٹر خان صاحب اس میں سد راہ تھے ساتھ ہی یہ بھی درست ہے کہ گورنر بھی ڈاکٹر خان صاحب کے راستے میں رکاوٹ تھا اور وہ اسے ہندوؤں کی پوری پوری حفاظت نہیں کرنے دیتا تھا لیکن گورنر اور ڈاکٹر صاحب کے درمیان اختلاف اور ڈاکٹر صاحب کی پٹھان سپرٹ اقلیتوں کی حفاظت کا موجب تھی۔

بعض انگریز پرست ٹوڈی ہندو انگریزوں اور مسلم لیگیوں کے اشاروں پر ناچتے ہوئے ایسے حالات میں مطالبہ کر رہے تھے کہ خدائی خدمتگاروں کی وزارت کو ہٹا دیا جائے اور صوبہ میں گورنری راج قائم کر دیا جائے (وہ گورنر کیرو جو ہندوؤں کا کٹر دشمن اور مسلم لیگیوں کا یار غار تھا) اور یہ لال بجھکڑ اپنے مطالبے کی حمایت میں یہ دلیل دیتے تھے کہ کانگریس وزارت یعنی خدائی خدمتگاروں کی حکومت ہماری حفاظت کے اہل نہیں ہے۔ لیکن یہ لوگ یہ نہیں سمجھتے تھے کہ وہ اپنے پاؤں پر اپنے ہاتھ سے کلہاڑا چلا رہے ہیں ؎

بریں عقل و دانش بباید گریست

پشاور شہر کے بازار بند تھے۔ ہندو سکھ اپنے گھروں میں قید تھے۔ باہر نکلنا

محال تھا اور گھروں میں بھی ہندوؤں اور سکھوں کی عزت اور مال و دولت محفوظ نہیں تھے۔ اس موقع پر دس ہزار خدائی خدمتگار رضاکار ہندوؤں کی حفاظت کے لئے پشاور پہنچ گئے اور اُن کے آتے ہی ہندو اور سکھ اپنے گھروں سے باہر نکل آئے۔ اور دوکانیں کھول کر اپنا کام دھندا شروع کر دیا۔ ان کی جان و مال محفوظ ہو چکے تھے اور عین اسی طرح جہاں جہاں خدائی خدمتگار تھے وہاں ہندوؤں کا مال، جان اور عزت محفوظ تھی۔ کیونکہ خدائی خدمتگار دن رات ان کی حفاظت کرتے تھے۔ اور اُن کے لئے پہرہ دیتے تھے۔

پھر الیکشن کے وقت مسلم لیگ نے صوبہ سرحد میں پروپیگنڈے کے لئے ایک پنجابی کو بھیجا تھا جس کا نام میجر خورشید تھا۔ یہ اپنی بدعملی کی وجہ سے فوج سے موقوف کیا گیا تھا۔ اُسے اس غرض اور مطلب کے لئے بھیجا گیا تھا کہ وہ پٹھانوں میں خانہ جنگی پیدا کر دے۔ وہ پشاور کے مسلم لیگیوں میں اس قسم کی تقریریں کیا کرتا تھا، جو تشدد آمیز جذبات سے بھری ہوتی تھیں اور وہ کہا کرتا تھا کہ یہ جو چند آدمی کانگریسی لیڈر ہیں اور قوم میں اثر ورسوخ رکھتے ہیں انھیں قتل کر دینا چاہیئے اور ایسے لوگ پیدا کرنے چاہئیں کہ جنھیں ہم دس دس بیس بیس ہزار روپے دے دیں تاکہ وہ ان آدمیوں کو موت کے گھاٹ اُتار دیں، کیونکہ ان کی موت کے بغیر ہمارا راستہ صاف نہیں ہو سکتا۔

اس کی ان تقریروں کا مطلب یہ تھا کہ یہ لوگ آپس میں دست بگریباں ہو جائینگے۔ اور خدائی خدمتگاروں کا اگر ایک رہنما بھی مار دیا جائے گا تو چونکہ قوم کی ہمدردیاں ان کے (خدائی خدمتگاروں) کے ساتھ ہیں، اس لئے بدلہ لینے کے لئے ضروری ہے کہ قوم مسلم لیگ کے لیڈروں کو قتل کرے گی۔ اور اسی طرح یہ لوگ اپنے گھر میں باہمی فساد اور جنگ و جدل میں مصروف ہو جائیں گے اور تباہ و برباد ہو جائینگے۔

میجر خورشید صرف ہمیں ہی برباد کرنا نہیں چاہتا تھا بلکہ ساری پختون قوم کو تباہ کرنا چاہتا تھا۔

جب ہمارے لوگوں کو خورشید کے اِن ارادوں یا اسکیم کا علم ہوا تو انہوں نے خدائی خدمتگاروں کی حفاظت کے لئے ایک نئی جماعت بنائی جس کا نام "ځلمی پښتون" تھا اور اس میں وہ نوجوان شامل تھے جن کا عقیدہ عدم تشدد پر مبنی نہیں تھا۔ کیونکہ انہوں نے اسی غرض سے یہ جماعت بنائی تھی کہ خدائی خدمتگار تو تشدد نہیں کرتے اور ان کا عقیدہ عدم تشدد پر مبنی ہے اور ان کے خلاف پر تشدد سازشیں چل رہی ہیں تو انہوں نے اعلان کر دیا کہ وہ خدائی خدمتگاروں کی حفاظت کریں گے اس جماعت کے مقابلے میں مسلم لیگ نے "غازی پوختون" کے نام سے جماعت بنائی۔ لیکن ساری قوم "ځلمی پښتون" کی پشت پر تھی۔ چند خوانین اور ملک وغیرہ، جو انگریزوں کے ریزہ چین تھے مسلم لیگ کے ساتھ تھے۔ وہ سمجھ گئے تھے کہ اگر وہ میجر خورشید کی بات پر عمل کرتے ہیں تو ایک بھی زندہ نہیں بچے گا، اس لئے انہیں میجر خورشید کے پروگرام پر عمل کرنے کی جرأت نہ ہو سکی۔ میجر خورشید کو پنجابیوں نے پٹھانوں کی بربادی کے لئے بھیجا تھا۔ لیکن وہ اپنے ناپاک مقصد میں کامیاب نہ ہو سکا۔

(۲۰)

کانگریس ورکنگ کمیٹی کا اجلاس تھا میں بھی اس میں شمولیت کے لئے دہلی گیا تھا۔ اس کمیٹی میں ہندوستان کی تقسیم کا سوال زیرِ بحث تھا۔ میں اور گاندھی جی تقسیم ہند کے مخالف تھے۔ دوسرے ممبروں کے بارے میں میں کچھ نہیں کہہ سکتا۔ کیونکہ میں نے اس وقت تک ان سے کچھ نہیں سنا تھا۔ لیکن سردار پٹیل اور راج گوپال اچاریہ تقسیم کے حق میں تھے اور اس بارے میں انہوں نے بڑا زور لگایا تھا۔ دو ری بات

صوبہ سرحد میں ریفرینڈم کا سوال تھا۔ میں اور گاندھی جی دونوں ریفرینڈم کے بھی مخالف تھے۔ میں کہتا تھا کہ ریفرینڈم کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ کیونکہ ہندوستان اور پاکستان کے سوال پر ہمارے صوبہ کا الیکشن ہوا ہے اور وہ الیکشن ہم نے بڑی بھاری اکثریت سے مسلم لیگ سے جیتا ہے اور اسے ابھی تک ایک سال بھی نہیں ہوا ہے۔

سردار پٹیل اور راج گوپال اچاریہ اس نظریے کے مخالف تھے اور ریفرینڈم کے حق میں تھے اور اسی لئے انہوں نے ورکنگ کمیٹی میں بہت زور لگایا تھا اور دلائل پیش کر رہے تھے۔ بالآخر جب ورکنگ کمیٹی نے ان کی بات تسلیم کرلی اور ملک کی تقسیم اور ہمارا ریفرینڈم دونوں باتیں منظور کرلیں۔ اس وقت میں نے ورکنگ کمیٹی اور گاندھی جی سے کہا کہ ہم پٹھان لوگ آپ لوگوں کے ساتھی ہیں اور ہم نے ہندوستان کی آزادی کے لئے بڑی قربانیاں کی ہیں لیکن آپ لوگوں نے ہمیں چھوڑ دیا ہے۔ اور بھیڑیوں کے سپرد کر دیا ہے۔ ہم نے ہندوستان اور پاکستان کے سوال پر الیکشن لڑا تھا اور ہم نے وہ بڑی بھاری اکثریت سے جیتا تھا۔ اور اس سے ساری دنیا پر پختونوں کی رائے روشن ہوگئی تھی۔ اس وجہ سے ہم ریفرینڈم نہیں چاہتے اور دوسری وجہ یہ ہے کہ ہمیں تو ہندوستان نے چھوڑ دیا ہے پھر ہم ہندوستان اور پاکستان کے سوال پر ریفرینڈم کیوں کریں۔

کانگریس کی اس کمزوری سے ہمارے لوگ ہندوستان سے بڑے سخت مایوس ہو گئے۔ اس لئے ہم نے کہا کہ اگر مسلم لیگ ہمارے ساتھ ریفرینڈم کرنا چاہتی ہے تو پھر "پختونستان اور پاکستان" کے سوال پر کرے۔ افسوس مجھے اس بات پر تھا کہ ہم نے تو کانگریس کو نہ چھوڑا لیکن کانگریسیوں نے ہمیں چھوڑ دیا۔ اگر ہم کانگریس کو چھوڑ دیتے تو انگریز ہمیں سب کچھ دیتا تھا اور میرا اس بات پر پختہ یقین ہے کہ اگر کانگریس نے

اس بات پر زور دیا ہوتا۔ مضبوطی سے ڈٹی رہتی، جس طرح کہ وہ گورداسپور کے سوال پر اَڑ گئی تھی۔ اور جس طرح کہ جناح نے وہ بات مان لی تھی تو یہ بھی مان جاتے ہماری بڑی بدنصیبی یہ ہے کہ گاندھی جی اس دنیا سے چلے گئے۔ اگر وہ ہوتے تو ضرور ہماری امداد کرتے۔ جواہر لال سے بھی ہمیں بڑی توقعات تھیں اور وہ بہت کچھ کر بھی سکتے تھے لیکن ہم نہیں سمجھتے کہ انہوں نے کیوں ہمارے لئے کچھ بھی نہ کیا؟۔

جس وقت ورکنگ کمیٹی نے ہندوستان کی تقسیم اور صوبۂ سرحد کے ریفرینڈم کا فیصلہ کر لیا تو یہ میرے لئے فیصلۂ مرگ تھا۔ میں حیران و پریشان بیٹھا ہوا تھا۔ مولانا آزاد میری بغل میں بیٹھے ہوئے تھے۔ مولانا نے مجھ سے کہا کہ "تمہیں چاہیئے کہ اب تم مسلم لیگ میں داخل ہو جاؤ"۔ مجھے افسوس ہوتا ہے اور حیران بھی ہوتا ہوں کہ مولانا صاحب کس خیال سے مجھے یہ مشورہ دے رہے تھے۔ کیونکہ مسلم لیگ سے میرا اور مولانا کا اختلاف نظریاتی اور اصولی تھا۔ اور اس وقت تک مسلم لیگ کی پالیسی میں ایسی کوئی تبدیلی واقع نہیں ہوئی تھی کہ میرے یا مولانا کے لئے اس میں شامل ہو جانے کا جواز پیدا ہوا ہوتا۔ مسلم لیگ تخریب کے لئے کام کر رہی تھی اور میں نے اپنی ساری عمر تعمیر کے لئے وقف کی ہے۔ مولانا کا یہ مشورہ اگر کہیں درست بھی تھا تو مناسب ہوتا کہ اگر وہ چند سال پہلے ایسا مشورہ دینے میں بخل سے کام نہ لیتے۔ بہر حال مجھ پر اس مشورے نے کوئی اچھا اثر نہ کیا کیونکہ میں عقیدوں کے مسائل میں وقت کے تقاضوں کے ساتھ بدلنا نہیں جانتا اور نہ ہی میرا ملک اور میری ملت گرگٹ کی طرح رنگ بدلنا اچھا سمجھتی ہے جس وقت احرار جماعت (مجلس احرار اسلام) پاکستان بننے کے بعد مسلم لیگ میں داخل ہوئی تھی تو لیاقت علی نے انہیں سخت ذلیل کر کے مسلم لیگ سے باہر نکال دیا تھا۔

ایک بات مولانا نے اپنی کتاب میں لکھی ہے " کلکتہ میں مجھ سے ملنے کے لئے کچھ پٹھان آئے تھے۔ جب میں نے چائے کے ساتھ پٹھانوں کو بسکٹ پیش کئے تو اُن پٹھانوں نے کہا کہ " یہ چیز تو ہم نے کبھی نہیں کھائی ہے۔ ڈاکٹر خانصاحب اور باچا خان کھاتے تھے، لیکن وہ ہمیں نہیں دیتے تھے"

مولانا صاحب بہت دفعہ سرحد آئے تھے اور انہوں نے میری طبیعت (خصلت و عادت) اور پٹھانوں کی مہمان نوازی بھی دیکھی تھی اور انہوں نے یہ بھی دیکھا ہوگا کہ ہمارے اندر کس قدر مساوات ہے۔ پٹھانوں میں اتنی غیرت بھی نہیں ہے کہ انہوں نے بسکٹ دیکھا نہ ہو یا کھایا نہ ہو، ہم تو مہمان کی بات چھوڑیئے، اپنے نوکروں کے ساتھ روٹی اور چائے ایک ہی جگہ کھاتے پیتے ہیں۔ اور جو کچھ خود کھاتے ہیں انہیں بھی دیتے ہیں۔ ہمارے ملک میں یہ بات بڑی معیوب ہے کہ چائے پیتے جاؤ، بسکٹ کھاتے جاؤ۔ اور اگر کوئی ساتھ بیٹھا ہو تو اسے نہ دو۔ اس لئے میں نہیں جانتا کہ مولانا صاحب کے پاس کون اور کس قسم کے لوگ گئے تھے۔

مولانا صاحب نے یہ بھی لکھا ہے " ڈاکٹر خان صاحب اور باچا خان کانگریس فنڈ اپنے صوبہ میں خرچ کرنے کی بجائے مرکز کو واپس کر دیا کرتے تھے" اور بقول مولانا یہ کفایت شعاری ہمارے اثر و رسوخ کے کم ہو جانے یعنی گھٹ جانے کا سبب بیان کیا گیا ہے۔

خدائی خدمتگار تحریک دوسری تحریکوں کی طرح صرف سیاسی تحریک نہیں ہے۔ یہ سیاسی بھی ہے، مجلسی بھی ہے۔ اقتصادی اور اصلاحی بھی ہے۔ اخلاقی اور روحانی بھی ہے۔ خدائی خدمتگار اپنی قوم اور ملک کی خدمت خدا کے واسطے کرتا ہے۔ حتیٰ کہ وہ اپنی وردی بھی اپنے پیسوں سے بناتا ہے تم

نے کبھی کانگریس سے پیسے نہیں لئے ہیں۔ اگر کانگریس نے پیسے دیئے ہوں گے تو پارلیمنٹری بورڈ کو دیئے ہوں گے اور ہم لوگ قومی فنڈ کو بے جا استعمال کرنا خدا کے نزدیک جرم سمجھتے ہیں۔ اگر ہماری تحریک کا رسوخ کم ہوتا تو پاکستان کے اس قدر تشدد، جبر و استبداد، اتنے ظلم، اتنے توہین آمیز سلوک، یہاں تک کہ آئے دن جان لیوا گولیوں کا نشانہ بننے کے باوجود ہزاروں لوگ کس طرح جیل خانوں میں جاتے اور جیلوں میں سختیاں اور شرمناک زندگی صبر و شکر سے کیوں گزارتے ؟ کاش ! مولانا صاحب اس قسم کی ایک بھی مثال کسی دوسری جماعت سے متعلق ہمیں بتاتے۔

خیر میں خوش ہوں کہ مولانا صاحب اس طرح سے دنیا کے سامنے ایک حقیقت تو تسلیم کرتے ہیں کہ ہم نے کانگریس سے پیسے کبھی نہیں کھائے ہیں۔ اور ہمارا تعلق اس کے ساتھ ایک مشترکہ نصب العین کے واسطے کام کرنا تھا۔ اور کچھ نہیں —— مولانا صاحب کا یہ نکتہ کہ ہم کانگریس کے پیسے کانگریس کو واپس کر دیا کرتے تھے، میری طرف سے ایک وضاحت طلب کرتا ہے اور وہ یہ ہے کہ خدائی خدمتگار تحریک کبھی ان پیسوں کی دست نگر نہیں رہی۔ یہ پیسے اگر دیئے ہوں گے ...... تو پارلیمنٹری بورڈ کو دیئے گئے ہوں گے رہا یہ سوال کہ ان پیسوں کا نہ خرچ کرنا بقول مولانا ہمارے اثر و رسوخ میں کمی کا باعث ہوا۔ اس سلسلے میں میں عرض کرتا ہوں کہ مولانا صاحب نے تقسیم سے قبل ہماری طاقت کا اندازہ کیا تھا کہ خدائی خدمتگار تحریک جب خلاف قانون نہیں ہوئی تھی تو وہ ہمیشہ الیکشن میں جیت حاصل کرتی تھی اور حکومت اپنے ہاتھوں میں لیتی رہی تھی۔ تقسیم کے بعد اور پاکستان بننے کے بعد پاکستان میں کوئی الیکشن نہیں ہوا، جس سے کہ مولانا ہمارے زور یا کمزوری کا جائزہ لیتا اور

کسی نتیجے پر پہنچتے یا کوئی نتیجہ اخذ کرتے۔

میں بہت شکرگزار ہوں گا اگر پاکستان میں پھر آزاد رائے شماری ہو جائے تاکہ دنیا دیکھ لے کہ قوم اور ملک کس راستے پر اور کس کے پیچھے چل رہا ہے۔

میرا سارا مجادلہ بھی اسی کے لئے جاری ہے۔ البتہ اگر مولانا صاحب یا اور کسی کو الیکشن کے بغیر کسی اور دلیل کی ضرورت ہو تو میں عرض کروں گا کہ یہ ہزاروں لوگوں کا گلنا سڑنا، سینکڑوں کا مارا جانا، ملک چھوڑ کر چلے جانا اور ان کی جائیداد کی ضبطی کس چیز کی دلالت کرتی نہیں ہے؟ یہ مجھے جیل خانے میں رکھا جانا کس واسطے ہے؟ اگر میرا یا میری سیاسی پارٹی کا اثر در رسوخ نہیں ہے تو پاکستان کی حکومت ہم سے ڈرتی کیوں ہے؟ اور مجھے کیوں جیل خانوں میں بند کرتی ہے؟

(۲۱)

بٹوارہ ہو چکا تو میں نے کہا۔ اب جبکہ پاکستان بن چکا ہے اور کانگریس اور مسلم لیگ نے تقسیم مان لی ہے تو میں اور میری پارٹی بغیر کسی قسم کا حصہ مانگے ملک اور قوم کی خدمت کرنا چاہتے ہیں۔ میری قوم پاکستان کی شہری اور وفادار ہے اور ہم اس ملک کی تعمیر و ترقی میں پورا حصہ ادا کریں گے، لیکن پاکستانی حکومت پر اس کا کوئی اثر نہ ہوا اور اُلٹا مجھ پر یہ الزام لگایا گیا کہ میں تعمیر کی آڑ میں تخریب چاہتا ہوں لہٰذا مجھے گرفتار کر لیا گیا۔ مجھ پر قبائلیوں سے ساز باز کرنے کا جھوٹا الزام لگایا گیا۔ اسی جرم میں میرے بیٹے ولی خاں کو بھی پکڑ لیا گیا اور کچھ عرصے کے بعد ڈاکٹر خان صاحب اور عبدالغنی بھی گرفتار کر لئے گئے۔ بغیر کسی دلیل کے مجھے تین برس کی سزا دی گئی۔

میری قید کی میعاد تین سال گزرنے کے بعد مجھے کوہاٹ کے ڈپٹی کمشنر کے سامنے پیش کیا گیا۔ ڈپٹی کمشنر نے مجھ سے نیک چلنی کی ضمانت طلب کر لی۔ میں نے اس ضمانت طلبی کی وجہ دریافت کی تو جواب ملا کہ میں پاکستان کے خلاف ہوں۔ جب میں نے

اس بات کا ثبوت مانگا تو وہ کہنے لگے کہ بحث کی کوئی ضرورت نہیں۔ تب میں نے ضمانت دینے سے انکار کر دیا جس پر انہوں نے اپنا فیصلہ سُنا دیا اور مجھے تین برس قید با مشقت کی سزا دی اور منٹگمری جیل میں بھجوا دیا گیا، جہاں میں نے اپنی سزا کے دن کاٹے۔ مجھے سزا میں وہ رعایت بھی نہ دی گئی جو جیل کی طرف سے ہوتی ہے اور جب میں پوری سزا بھگت چکا تو ۱۸۱۸ء ریگولیشن کے تحت مجھے پھر نظر بند کر دیا گیا اور اس طرح جنوری ۱۹۵۴ء سے قبل مجھے رہائی نصیب نہ ہوئی اور جب رہائی ملی تو وہ بھی برائے نام۔ میری گرفتاریوں کا سلسلہ برابر جاری رہا۔ اور اس طرح پندرہ برس تک مجھے پاکستانی جیلوں میں رہنا پڑا۔

جونہی پاکستان کی حکومت وجود میں آئی تو بغیر کسی قسم کی تقصیر کے ہم پر ایسے ایسے مظالم توڑنے شروع کر دیئے جو کافر فرنگیوں کے عہدِ حکومت میں بھی ہم پر روا نہیں رکھے گئے تھے۔ فرنگیوں نے ہمارے گھروں کو نہیں لوٹا تھا لیکن پاکستان کی اسلامی حکومت نے لوٹ لئے۔ فرنگی کے عہد میں اخبار اور جلسے بند نہیں کئے گئے تھے، لیکن پاکستان کی اسلامی حکومت نے بند کر دیئے۔ فرنگی کی حکومت پختونوں کی عورتوں کی بے عزتی نہیں کرتی تھی، پاکستان کی اسلامی حکومت نے یہ بھی کیا۔ ان سب باتوں کا ذکر چھوڑیئے۔ اس حکومت نے تو مظالم کی کوئی حد نہیں چھوڑی۔ جس وقت چارسدہ میں پٹھان مرد و زن جمعہ کی نماز ادا کرنے اور اپنے گرفتار شدہ بھائیوں کے لئے دعائیں مانگنے جا رہے تھے اور اپنے سروں پر "قرآن" رکھ کر مسجد میں داخل ہو رہے تھے تو اس وقت پاکستان کی اسلامی حکومت کے مشین گن چلانے والے سپاہیوں نے پٹھان مردوں و عورتوں کے سینے اور خدا کے قرآن پر گولیاں چلا کر انہیں چھلنی کر دیا۔

ٹھیک اسی طرح جیل میں جو سلوک انگریزی حکومت ہمارے ساتھ روا رکھتی

تھی، اس کے مقابلے میں اس اسلامی حکومت نے ہمارے ساتھ دس گنا زیادہ برا سلوک روا رکھا۔ پاکستانی حکومت نے مجھے ہمیشہ جیل کی ایسی کوٹھری یا ایسی بارک میں رکھا جس کی روشنی بھی رات کو گل کردی جاتی تھی۔ حیدرآباد کے جیل میں تو مجھے تنہائی میں رکھا گیا اور کسی سے ملنے کی اجازت نہیں تھی۔ اس جیل کی آب و ہوا میرے موافق نہ تھی، بلکہ مضر تھی وہاں میں بیمار ہوگیا۔ مجھے گردے کی خرابی کی شکایت پیدا ہوگئی، جس سے میرے پاؤں خراب ہوگئے، لیکن جیلر نے جو پنجابی مسلمان تھا میری طرف کوئی توجہ نہ دی اور برائے نام غلط سلط دوائیں دیتا رہا۔ آخر مجھے لاہور جیل میں منتقل کردیا گیا۔ وہاں بھی بیماری بڑھتی گئی۔ یہاں سے منٹگمری جیل میں بھجوادیا گیا۔ اور کوٹھری میں بند کردیا گیا۔ وہاں بھی بیماری نے میرا ساتھ نہ چھوڑا اور میری صحت روز بروز گرتی ہی گئی۔

میں نے انگریزوں کی جیل میں پندرہ برس کاٹے اور پاکستان کی اسلامی حکومت میں بھی پندرہ برس قید میں گزارے۔ پاکستان کی سرکار کی طرف سے مجھے سزائے قید جرمانے کے ساتھ ہوتی تھی۔ میری جائیداد کا ایک حصہ صرف پندرہ ہزار روپے جرمانے کے عوض میں پاکستانی حکومت نے اپنے قبضے میں لے لیا۔ حالانکہ اس کی اصل قیمت پچاس ہزار سے بھی زیادہ تھی۔ انگریز حکومت اگر ظلم کرتی تھی تو وہ ہماری دشمن تھی۔ ہمارا اس کے ساتھ جھگڑا تھا۔ لیکن اس پاکستان کی اسلامی حکومت کو میں سمجھ نہیں سکا کہ کس جرم کی پاداش میں اس نے مجھے اور ہزاروں دیگر خدائی خدمتگاروں کو قید و بند میں ڈالا۔

میرے نزدیک پاکستان سے دوستی ممکن ہی نہیں، کیونکہ پاکستان کی بنیاد نفرت پر رکھی گئی ہے۔ پاکستان کی گھٹی میں نفرت، بغض و حسد، کینہ و دشمنی اور حقارت کے جذبات بھرے پڑے ہیں۔ پاکستان کی تشکیل انگریزوں کی مرہون منت

ہے۔ پاکستان انگریزوں نے اس لئے بنایا کہ زندگی بھر کے لئے ہندو اور مسلمانوں میں فسادات ہوتے رہیں۔

●

باچا خان کابل میں

پاکستانی جیل سے ۳۰ جنوری ۱۹۶۴ء کو رہا ہوکر باچا خان برائے علاج معالجہ ستمبر ۱۹۶۴ء میں لندن کے لئے روانہ ہوئے۔ پھر لندن سے اسی مقصد کے لئے ۱۲ دسمبر ۱۹۶۴ء کو کابل (افغانستان) تشریف لائے۔ جیل کی زندگی نے اُن کی صحت پہ بُرا اثر ڈالا۔ وہ مختلف امراض کا شکار ہوکر باہر آئے۔ کابل میں ان کا شاندار خیر مقدم ہوا اور بحالی صحت کے لئے ان کی پوری دیکھ بھال کی گئی۔ صحت یاب ہونے پر باچا خان ایک مجاہد کی طرح تحریکِ پختونستان کے لئے کمربستہ ہوگئے۔ تھوڑے ہی دنوں میں انہوں نے افغانستان اور قبائلی علاقوں کا دورہ کرڈالا اور آج افغانستان اور پختون دونوں شانہ بشانہ حصولِ پختونستان کے لئے پُرامن جد و جہد کررہے ہیں۔ افغانستان کے باشندے باچا خان کی قیادت میں پوری تن دہی سے اپنی تنظیم میں مصروف ہیں۔

جب میں جلال آباد میں باچا خان سے ملا تو مجھے یہ دیکھ کر انتہائی مسرت ہوئی کہ باچا خان آج بھی اسی لگن سے منزلِ مقصود کی جانب بڑھ رہے ہیں۔ جس طرح انگریزی حکومت کے خلاف برسرِ پیکار تھے۔ وہ کل بھی عظیم رہنما تھے اور آج بھی عظیم رہنما ہیں۔ وہ کل بھی عدم تشدد کے پجاری تھے اور آج بھی عدم تشدد کے پرستار ہیں!

باچا خان نے اپنی کابل کی سیاسی زندگی میں چار اہم تقریریں کی ہیں۔ ان سے مسئلہ پختونستان کی وضاحت ہوتی ہے اور پاکستان کی اسلامی حکومت کا پُرفریب پردہ چاک ہوتا ہے۔ یہ چاروں تقریریں "یوم پختونستان" سے تعلق رکھتی ہیں۔ — نارنگ

پہلی تقریر

یوم پختونستان ۳۱ اگست ۱۹۶۵ء

بہنو اور بھائیو! میں آج خدائے پاک کا بہت بہت شکر گزار ہوں کہ اُس نے اس پشتون قوم کے اندر جسے لوگوں نے ختم کر دیا تھا، پیار محبت، بھائی چارے اور عزیزداری کا ایک جذبہ پیدا کر دیا اور بعد ازیں میں اعلیٰ حضرت شہنشاہ افغانستان، وزیر اعظم اور ان کی حکومت کا بہت بہت شکریہ ادا کرتا ہوں کیونکہ انہوں نے پائین اور بالا علاقوں کے رہنے والے پشتونوں کو یکجا کیا۔

احمد شاہ بابا (ابدالی) نے ہمارے وطن کی سرحد دریائے جہلم تک مقرر کی تھی۔ لیکن پاکستان نے ایک فرنگی (انگریز) کو بلایا تھا اور اس نے بھی ایک کتاب لکھی تھی "پٹھان"۔ اس انگریز مسٹر اولف کیرو نے ہمارے دیس کی سرحد مارگلی تصور کی ہے۔ لہٰذا اگر مارگلی سرحد مان لی جائے تو دریائے آمو تک پٹھانوں کے بابا کا ملک ہے۔ اور اس میں جو لوگ بستے ہیں وہ تمام پشتون ہیں۔ تم لوگ دنیا کو دیکھو ـــــ دنیا کی قوموں کو دیکھو ـــــ امریکہ کو لے لو۔ امریکہ میں تمام لوگ، جو وہاں رہتے ہیں، ایک قوم سے نہیں ہیں۔ ان میں کچھ لوگ جرمنی کے باشندے ہیں۔ کچھ فرانسیسی نسل کے ہیں۔ کچھ اسپین کے رہنے والے ہیں۔ کچھ حبشی ہیں، کچھ انگریز ہیں۔ لیکن ان کا ملک امریکہ ہے۔ اس لئے امریکہ میں رہنے والا ہر آدمی اپنے آپ کو امریکن کہتا ہے۔ اسی اعتبار سے میں تم پٹھانوں سے یہ بات کہتا ہوں کہ مارگلی سے آمو تک یہ علاقہ پشتونوں کا ملک ہے۔ اس ملک میں جو بھی آدمی رہتا ہے وہ پشتون ہے۔ اور میں تمہیں یہ بات بھی کہتا ہوں (اور میری یہ بات کان لگا کر سن لو کہ جو لوگ ہم میں کسی کو فارسی وان کسی کو ہزارہ اور پشتون و تاجک کہہ کر تفرقہ انگیز

افسانہ سازی کرتے ہیں، تم سمجھ لو ___ کہ وہ لوگ تمہارے دوست نہیں ہیں، بلکہ تمہارے دشمن ہیں۔ وہ لوگ خود غرض ہیں۔ تمہارا فائدہ اُن کے مدنظر نہیں ہے اُن کے مدنظر ان کا اپنا مفاد ہے۔

اس کے بعد میں آپ لوگوں سے یہ عرض کرتا ہوں کہ میں بہت مدت کے بعد آپ کے اس دیش میں آیا ہوں۔ آپ کا یہ خیال ہوگا اور آپ یہ کہتے ہوں گے کہ شاید میں نے آپ کو بھلا دیا تھا۔ آپ لوگ مجھے ہمیشہ یاد رہتے تھے۔ اور میں نے آپ لوگوں کو بھلایا نہیں تھا۔ کیونکہ آپ میری قوم سے ہیں، میرے بھائی ہیں، میرے عزیز ہیں۔ لیکن بات یوں تھی کہ پہلے ہمارے ملک پر انگریز کی حکومت تھی۔ انگریز نے ہیں ٹکڑے ٹکڑے کر رکھا تھا۔ ہمیں نہ صرف ٹکڑوں ٹکڑوں میں بانٹا ہوا تھا بلکہ ہمارے درمیان دیوار بھی کھڑی کر دی تھی اور ہمیں آپ کے پاس نہیں آنے دیتا تھا اور آپ کو ہمارے پاس نہیں آنے دیتا تھا۔ یہ نوبات ہی کیا ہے۔ وہ تو ہمیں ہمارے اپنے قبائلی بھائیوں کے قریب تک نہیں جانے دیتا تھا۔

وہ انگریز چلا گیا اور پاکستان وجود میں آگیا۔ اور وہاں مسلمانوں کی حکومت ہوگئی۔ اسلام کی حکومت ہوگئی۔ وہ بھی اسی راستے پر چل پڑی جو راستہ انگریز کا تھا۔ آپ لوگ ذرا غور فرمائیں اور پاکستان کی اس حکومت کو دیکھیں۔ آج جو لوگ پاکستان کی حکومت میں برسرِ اقتدار ہیں اور جن کے ہاتھوں میں سیاہ و سفید ہے یہ کون لوگ ہیں؟ ___ یہ تمام وہی لوگ ہیں جو آبا و اجداد سے انگریزوں کے خدمتگار تھے۔ آپ بے شک دیکھ لیں۔ ان میں ایک شخص بھی ایسا نہیں ہے کہ جس نے اس قوم اور اس ملک کی کوئی خدمت کی ہو۔ یہ انگریزوں کے "ٹھاٹی چیٹ" (کاسہ لیس) تھے۔ انگریز جب جانے لگا تو چونکہ ہندوستان میں دس کروڑ مسلمان تھے۔ اُن دس کروڑ میں صرف ایک پشتون تھا جس نے انگریز کا مقابلہ کرنے کے لئے

کمر کس رکھی تھی اور انگریزوں کو ملک سے نکالنے کے درپے تھا۔ انگریز کا دل ہمارے خلاف غیض وغضب سے بھرا ہوا تھا۔ فرنگی جب جانے لگا تو ہمارے ملک میں آگ لگانا چاہتا تھا۔ لہٰذا اس نے ہمارے ملک میں انتشار پیدا کر دیا۔ یہ انتشار اُس نے کن کے ہاتھوں پیدا کیا۔ انہی لوگوں کے ہاتھوں جنہیں ہم نے فرنگی کی غلامی سے نجات دلائی تھی۔ اور میں تو ہمیشہ یہ بات کہا کرتا ہوں کہ پٹھان قوت بازو سے محنت و مشقت کر کے منافع حاصل کرنے کا بڑا دھنی ہے، لیکن جب استفادہ کر لیتا ہے تو اپنا فائدہ یا منافع سنبھال نہیں سکتا۔ وہی مذاق وستم ظریفی ہمارے ساتھ بھی ہوئی۔ ہم نے منافع حاصل کیا۔ انگریز کو ہم نے نکالا۔ ملک کو ہم نے آزاد کرایا، لیکن ہم میں سے کوئی بھی اپنا فائدہ سنبھال نہیں سکا۔

فرنگی جب جانے لگا تو اُس نے پشتونوں میں فساد پھیلا دیا۔ وہ جب گیا تو اپنے دوست پنجابی کو اپنی جگہ پر بٹھلا گیا۔

آپ کے ملک میں آئے ہوئے مجھے نو مہینے ہو گئے ہیں۔ ان نو مہینوں میں آپ کے اس ملک میں پشتونستان کی جو تحریک جاری ہے میں نے اُسے سمجھنے کے لئے بہت سوچ بچار کیا ہے۔ لیکن میں معذرت چاہتا ہوں کہ میں کسی نتیجے پر نہیں پہنچ سکا ہوں۔ میں دیکھتا ہوں کہ ہم سے بہت بعد میں کئی ملک اُٹھے۔ افریقہ کے حبشی اُٹھے۔ جنگلی لوگ اُٹھ کھڑے ہوئے اور الجزائر کے لوگ اُٹھے۔ ہم سے بہت بعد میں کھڑے ہوئے لیکن اپنے مقصد میں ہم سے پہلے کامیاب ہو گئے۔ ہمیں اٹھارہ سال ہو گئے ہیں، لیکن ابھی تک ہم لوگ کامیاب نہیں ہوئے۔ یہ کیوں؟ ــــ ضرورت ہے کہ ہم پشتون، چاہے اِس دیش کے ہیں یا اُس دیش کے، اس بات پر غور و فکر کریں۔ کیونکہ ہم سب بھائی بھائی ہیں۔ اس بات پر غور و خوض کرنا ہمیں لازم آتا ہے کہ کیا وجہ تھی کہ الجزائر

ہم سے بہت بعد میں کھڑا ہوا، لیکن ہم سے پہلے کامیاب ہوگیا۔ اور آپ یہ دیکھیں کہ اس چھوٹے سے الجزائر کا مقابلہ بھی کس قوم کے ساتھ تھا؟ اس کا مقابلہ فرانس سے تھا اور فرانس کوئی معمولی ملک نہیں ہے۔ پھر الجزائر میں لاکھوں کی تعداد میں فرانسیسی رہتے تھے۔ اُس ملک کی تمام اقتصادیات، زرخیز آراضیات انہی (فرانسیسیوں کے ہاتھوں میں تھیں۔ لیکن الجزائر کے لوگ اُٹھ کھڑے ہوئے اور وہ کامیاب ہوگئے۔

ہمارا مقابلہ پاکستان سے ہے، لیکن ہم لوگ ناکام رہ گئے، کیوں ناکام رہ گئے؟ یہی بات بڑے سوچ بچار کی ہے۔ آپ دیکھ لیجئے بھائیو! آپ دنیا میں اور قوموں کی طرف دیکھئے، تنظیموں کو دیکھئے، پارٹیوں کو دیکھئے، جب وہ کھڑی ہوتی ہیں تو اُن کے سامنے ایک مقصد ہوتا ہے اور وہ مقصد ہمیشہ اُن کے نزدیک مقدم رہتا ہے۔ اور اس مقصد پہ اُن کا جو عقیدہ ہوتا ہے وہی اُن کا ایمان ہوتا ہے۔ اور دوسری چیز یہ ہوتی ہے کہ اس مقصد کے لئے وہ ہر قسم کی قربانی کرنے کو تیار رہتے ہیں۔ ہر طرح کی تکلیفوں اور مصیبتوں کو جھیلنے کے لئے تیار رہتے ہیں۔ میں جہاں تک بھی دیکھتا ہوں اور مطالعہ کرتا ہوں۔ یہی چیز الجزائر میں موجود تھی، اس لئے وہ کامیاب ہوگئے اور میں آپ سے یہی کہتا ہوں۔ میں کسی لمبی چوڑی بحث میں نہیں پڑتا، آپ سے صرف اس قدر عرض کرتا ہوں کہ آپ لوگ بھی یہی اوصاف اپنے اندر پیدا کرلیں۔ آپ بھی کامیاب ہوجائیں گے۔

اس کے بعد آپ سے یہ بات کہتا ہوں کہ بھائیو! اگر آپ لوگ ذرا آنکھیں کھول کر دیکھیں۔ اس دنیا کی طرف دیکھیں۔ دنیا کی قوموں کو دیکھیں۔ وہ قومیں دنیا کے آسمان میں اُڑتی ہیں، لیکن ہم ہیں کہ زمین پر بھی نہیں چل سکتے۔ یہ کیوں؟

کیا پشتون قوم نہیں ہے ؟ پشتونوں کا اپنا ملک نہیں ہے ؟ آپ لوگ ایک شائستہ قوم ہیں اور آپ کو خدا نے ایسا شاندار ملک دیا ہے کہ اور کسی کو بھی ایسا نعمتوں سے بھرا ہوا ملک نہیں دیا۔ پھر کیا وجہ ہے کہ ہم دنیا سے پیچھے رہ گئے ؟ ہم ایک اچھی خاصی قوم ہیں۔ ہمارا اپنا دیس بھی ہے، پھر ہم کیوں پچھڑ گئے ہیں ؟ کیا ہم اس لئے پیچھے رہ گئے ہیں کہ دوسری قوموں میں قومیت پیدا ہوگئی ہے اور ہم میں قومیت نہیں پیدا ہوئی۔

آپ ملاحظہ فرمائیے کہ وہ قومیں جو ترقی کے آسمان پر پہنچ گئی ہیں ان کے افراد بھی تو ہماری طرح کے انسان ہیں۔ وہ قومیں بھی ہماری قوم جیسی قومیں ہیں کسی اور طرح کی قومیں نہیں۔ پھر فرق کیا ہوا ؟ ظاہر ہے کہ ان قوموں میں قومیت کا جذبہ بدرجۂ اتم ہے اور ہم میں نہیں ہے۔ لہٰذا میں یہ عرض کرتا ہوں کہ ان میں قومیت کیسے پیدا ہوئی ؟ اور ہمارے اندر کیوں نہیں پیدا ہوئی ؟۔ ان میں قومیت اس لئے پیدا ہوئی کہ ان میں ایسے لوگ پیدا ہوگئے جنہوں نے اپنا جان ومال، اپنا عیش و آرام و آسائش، اپنی موٹر اور بنگلہ سب کچھ اپنی قوم پر قربان کر دیا۔

ہم اول تو یہ نہیں جانتے کہ قوم کیا ہے ؟ قوم کس چیز کا نام ہے ؟۔ دوسری بات یہ کہ ہم لوگ کہتے ہیں کہ قوم جائے بھاڑ میں اور ملک جائے چولہے میں، لیکن ہمیں کچھ ذاتی فائدہ ہو جائے۔ یہی وجہ ہے کہ ہم میں ایسے لوگ پیدا نہیں ہوئے جن میں ایثار و قربانی کا پُرجوش جذبہ ہو، لیکن دوسری ترقی یافتہ قوموں میں ایسے لوگ پیدا ہوئے کہ انہوں نے بہت قربانیاں کیں۔

آپ لوگ کسانوں کو دیکھیں۔ ہم پٹھان سب کاشتکار ہیں۔ اور یہ خدا تعالےٰ کا ایک بڑا مدرسہ ہمارے سامنے موجود ہے۔ یہ ہمیں روزانہ سبق دیتا ہے کہ

ہم کسان ہیں۔ ہل چلاتے ہیں، کیاریاں تیار کرتے ہیں۔ کھیتی باڑی کرتے ہیں، کس واسطے؟ اس لئے کہ اس میں تخم ریزی کریں۔ کیونکہ اگر زمین تیار نہ کرلی جائے اور اس میں اچھی طرح سے قلبہ رانی نہ کی جائے تو ایسی زمین میں بیج بونے سے پھل نہیں ملتا۔ اچھا پھل، اچھی عمدہ فصل حاصل کرنے کے لئے ضروری ہے کہ کاشتہ زمین میں بیج بوئیں۔ جہاں یہ دیکھنا لازم ہے کہ زمین خوب کاشتہ ہے وہاں یہ بھی دیکھنا ازبس ضروری ہے کہ بویا جانے والا بیج بھی اچھا ہو۔ بویا جانے والا ایک ایک دانہ زندہ اور ثابت ہونا چاہئے۔ عمدہ، ثابت اور زندہ دانے نے اگر اپنے آپ کو مٹی کے ساتھ مٹی نہیں کر دیا، تو سرسبز نہیں ہو پاتا۔ یہی بات قوموں اور اُن کے افراد پر صادق آتی ہے۔ جس قوم کے افراد اپنی قوم و ملک کے لئے اپنے آپ کو مٹی میں نہیں ملا دیتے، بڑی سے بڑی قربانیاں نہیں دے سکتے۔ وہ قوم کبھی بامِ عروج پر نہیں پہنچ سکتی، خوشحالی اور ترقی کی بلند منزلوں پر نہیں پہنچ سکتی لیکن جس قوم کے لوگ اپنی قوم و ملک کے لئے مر مٹے، وہی قوم دنیا میں زندہ رہی اور ترقی کی بلند منزلوں پر پہنچ گئی۔

ہم لوگ اس لئے پیچھے رہ گئے کہ ہم میں ایسے لوگ پیدا نہیں ہو سکے۔ مجھے افسوس ہوتا ہے۔ کبھی مجھے زیادہ افسوس اس بات سے ہوتا ہے کہ اس ملک میں اور قومیں بھی موجود ہیں تو اے پشتون بھائیو! کیا آپ کبھی کسی روسی کو اپنے ساتھ ملا سکے ہیں؟ کیا کبھی آپ نے کسی انگریز باشندے کو اپنا ساتھی بنایا ہے؟ کیا آپ نے کسی امریکن کو اپنے ساتھ ملایا ہے؟ کسی جرمن باشندے کو اپنا رفیق بنایا ہے؟ آپ کی یہ حالت ہے کہ جس نے آپ کو سبق پڑھا دیا آپ اسی کے ساتھ چل پڑے۔ چودہ سو سال ہو گئے ہیں۔ ہمیں ہمارے رسول اکرم صلی اللہ علیہ وسلم نے یہ بات کہی تھی کہ دیکھو میری امت! اے مسلمانو! اگر بیبیہ تمہاری

قوم، اپنے ملک، اپنے بھائی اور اپنی بیٹی سے بھی پیارا لگتا ہے تو اس جہان میں بھی ذلیل ہو جاؤ گے اور آخرت میں بھی خوار و خجل ہو جاؤ گے۔ میں آپ لوگوں سے کہہ رہا ہوں سن لیجئے میرے پشتون بھائیو! اس دنیا میں ذلیل ہو یا نہیں ہو؟ جو قوم موجودہ دنیا میں خوار و خجل ہوتی ہے وہ آخرت میں بھی رسوا اور ذلیل ہوتی ہے۔ یہ بات میں نہیں کہتا یہ قرآن نے کہی ہے۔۔ میں ان پٹھانوں کو نہیں سمجھ پایا۔ ارے بھائی! یہ جو آدمی تمہیں حساب (پیسے) دے رہا ہے۔ کیا یہ پیسے وہ اپنے باپ کے گھر سے لے آیا ہے۔ یہ تو تمہارا اپنا ہی مال ہے لیکن گوشت وہ خود کھاتا ہے اور ہڈی تمہاری طرف پھینک دیتا ہے۔ ہڈی پر لڑائی جاری ہے۔ بس یہی چیز ہے اور میں ہمیشہ یہی بات کہا کرتا ہوں کہ پشتونو! آپ ہر چیز کے آگے ڈٹ کر کھڑے ہو سکتے ہیں۔ توپ کے سامنے کھڑے ہو سکتے ہیں مشین گن کے سامنے سینہ تان سکتے ہیں۔ جیل خانے سے نہیں ڈرتے۔ بموں کی پروا نہیں کرتے، ہر چیز کا مقابلہ کر سکتے ہیں، مگر پیسے کے آگے نہیں ٹھہر سکتے۔

دیکھ لیجئے کہ جو قوم پیسے کا مقابلہ نہیں کر سکی اور پیسے کے لالچ میں آگئی تو وہ گر گئی۔ نہ تو وہ اور نہ ہی اس کا ملک کسی قسم کی ترقی کر سکا۔ اس لئے میں آپ سے یہ بات کہتا ہوں۔ آپ لوگ قدرے سمجھنے کی کوشش تو کریں کہ جو آدمی آپ کو پیسے دیتا ہے، بھولے بھائیو! یہ تو آپ کے اپنے ہی پیسے ہیں۔ اگر آپ نے اپنے اس دیش کو اپنا بنا لیا تو پھر پیسے آپ کے ہیں۔ آپ بھی خوشحال ہو جائیں گے اور آپ کی آل اولاد یعنی بچے بھی فارغ البال ہو جائیں گے۔ میں چاہتا ہوں کہ اس بات پر سب پشتون بھائی چاہے وہ اس جگہ کے رہنے والے پشتون ہیں یا اس جگہ کے پشتون ہیں اس مسئلے پر پوری توجہ سے غور و خوض کر لیں۔

آخر میں آپ سے ایک بات کہتا ہوں۔ یہ کہ ہمارے ملک میں خاص طور پر لوگ یہ پروپیگنڈا کرتے ہیں کہ پاکستان تو مسلمان ملک ہے۔ اور ایوب خان کے بارے میں تو کہتے ہیں کہ وہ تو پشتون ہے۔ اور یہ بھی کہتے ہیں کہ آج تو پٹھانوں کی اپنی بادشاہی ہے۔ اور باتوں کے علاوہ یہ بات بھی کہتے ہیں کہ پاکستان ایک اسلامی مملکت ہے اور ابھی ابھی بنی ہے۔ ہم لوگ کیوں اس کے پیچھے پیچھے جھاڑ کر پڑے ہوئے ہیں۔ انہیں کیوں تکلیف دیتے ہیں۔ کیوں برباد کرتے ہیں۔۔۔ لیکن میں اس مسئلے پر زیادہ بحث نہیں کرتا۔ کیونکہ میں جانتا ہوں کہ یہ کس قسم کے لوگ ہیں؟۔ یہ وہی لوگ ہیں جنہیں یا تو ایک پرمٹ دے رکھا ہے۔ یا کچھ پیسے دیئے گئے ہیں۔ یہی وہ لوگ ہیں جو اس قسم کا پروپیگنڈہ کرتے ہیں۔

لیکن اے میری پیاری قوم! میں تو تمہیں صرف یہ کہتا ہوں کہ پاکستان مسلمان ہے۔ ہم تو اس بات سے انکار نہیں کرتے ہیں۔ ہم کہتے ہیں کہ مسلمان ہے۔ ہمارا بھائی ہے۔ لیکن سوال یہ ہے کہ ہمارے ملک کو آزاد کس نے کرایا؟ انگریز کو ہم نے نکالا۔ پاکستان ہم نے بنایا۔ کبھی کبھی یہ مسلم لیگ والے میرے ساتھ باتیں کرتے ہیں تو کہتے ہیں کہ انہوں نے پاکستان بنایا ہے۔ میں ان سے پوچھتا ہوں کہ کیا اُنہوں نے انگریزوں کے خلاف جنگ لڑی ہے؟ وہ لوگ تو انگریز کے ساتھی تھے۔ اس کے "تعالی چٹ" (پس خوردہ تھالی کا سہ لیس) تھے۔ انگریز کو تو ہم نے نکالا ہے۔ اگر انگریز اس ملک سے نہ نکلا ہوتا تو کیا پاکستان بن سکتا تھا؟ لہٰذا پاکستان تو ہمارے خون سے بنا ہے۔ ہم نے پاکستان بنایا ہے۔۔۔ لیکن ہمارے ساتھ وہی مذاق ہوا کہ "آگ لینے آئی تھی مگر گھر کی مالکن بن بیٹھی"۔ اب ہم تو اپنے پٹھان پنجابی بھائیوں سے اور کچھ نہیں مانگتے ہیں۔

ہم صرف یہ کہتے ہیں کہ ہمیں ہمارا حق دے دو ـــ اب پاکستان ہمیں ہمارا حق نہیں دے رہا، تو میں آپ لوگوں سے پوچھتا ہوں کہ کیا اسلام میں ایسا دستور ہے ؟ اگر ایک بھائی کہے کہ مجھے میرا حق دے دو، تو کیا اسلام یہ کہتا ہے کہ مت دو ؟

ہم تو پاکستان سے اور کچھ نہیں مانگتے۔ صرف پشتونوں کا حق مانگتے ہیں۔ کیا یہ اسلام ہے یا اسلام نہیں ہے ؟ میں یہ مانتا ہوں کہ ایوب خاں پشتون ہے اور مجھ پر تو بڑا مہربان ہے۔ مجھے بچا کہہ کر پکارتا ہے، لیکن افسوس اس بات کا ہے کہ وہ ایسے لوگوں کے ہاتھوں میں پھنسا ہوا ہے جو پشتونوں کا حق دبانا چاہتے ہیں اور پٹھانوں کی تباہی و بربادی کے درپے ہیں۔

ہاں میں لوگوں سے ہمیشہ یہ بات کہتا ہوں کہ پیارے بھائی ! میری طرف سے یہ بات ایوب خان سے کہیے کہ وہ غیروں کو (بیگانوں) کو اپنا بنا نہیں سکیں گے لیکن اپنوں کو بیگانہ بنا لیں گے اور سر دست اپنوں کو بیگانہ بنا لیا ہے اور دوسری بات جو کہی جاتی ہے کہ پٹھانوں کی اپنی بادشاہی ہے۔ آپ سوچیے اور دیکھیے کہ اگر رن کچھ میں لوگ مرتے ہیں تو کون مرتے ہیں ؟ پشتون۔ اور اگر کشمیر میں مارے جاتے ہیں تو کون ہلاک ہوتے ہیں ؟ پشتون۔

یہاں دیکھ لیجئے۔ باجوڑ میں پٹھانوں کے مقابلے میں پٹھانوں کو لایا گیا ہے، وزیرستان کو دیکھیے، بلوچستان کو دیکھیے۔ اور ان سب کو چھوڑیئے، جس جگہ پر پاکستان اور ہندوستان کی سرحد ہے اُسے واگہ کہتے ہیں وہاں پر بھی پشتون ہی کو ڈال رکھا ہے۔ جو بھی جگہ تباہی کی ہے، جہاں اور جس جگہ بربادی ہوتی ہے وہاں پٹھان موجود ہیں۔

اور جب حق دینے کا وقت آتا ہے تو پھر پٹھان کو کوئی اُس کا حق نہیں

دیتا۔ آپ چلئے اور دیکھئے۔ ہماری فوجوں کو دیکھئے۔ ہمارے جو دیانتدار بڑے بڑے جرنیل تھے، اُن سب کو نکال باہر کر دیا ہے۔ ہمارے محکمہ ہائے سول کو دیکھئے۔ ہمارے اس ملک میں ہمارے جو سول افسران تھے، ہمارے کمشنر تھے، پٹھان تھے وہ بھی ملازم تھے۔ میں آپ کو یہ بتانا چاہتا ہوں کہ انہیں سب کو پہلے سے ہی اِس ملک سے کیوں دُور کر دیا گیا ہے؟ آج جو بھی پولیٹیکل ایجنٹ ہے وہ پنجابی ہی ہے۔ اگر کمشنر ہے تو وہ بھی پنجابی ہے۔ اگر ڈپٹی کمشنر ہے تو وہ بھی پنجابی ہے۔ سب پشتون افسران کو پشتونوں کے ملک سے نکال دیا گیا ہے اور دوسری بات یہ کہتا ہوں کہ پشتونوں پر پاکستان کی موجودہ حکومت کو کوئی اعتبار نہیں ہے۔ یہ تو پٹھان ہی بے غیرت ہے کہ جس حکومت کا اس پر اعتماد نہیں وہ پھر بھی اس کی نوکری کرتا ہے۔

میں بجا طور پر آپ سے یہ کہتا ہوں کہ آپ ایک بار جاکر ہمارے مکتبوں کو دیکھیے۔ ہماری یونیورسٹی کو دیکھئے۔ ہمارے کالجوں کو دیکھئے۔ دیکھئے کہ وہاں کی کیا حالت ہے؟ ہمارے بچوں کی کیا حالت ہے؟ ہمارے اقتصادی حالات کیسے ہیں؟

ان تمام حالات کے پیش نظر مجھے حیرت ہوتی ہے اور میں یہ سمجھنے سے قاصر ہو جاتا ہوں کہ لوگ کس طرح کہتے ہیں کہ پٹھانوں کی اپنی بادشاہی ہے۔ آپ غور و خوض کیجیے کہ ایسی بادشاہی جس میں پٹھان پر اعتماد نہیں ہے پشتون کو کوئی اس کا حق نہیں دیتا۔ یہ پٹھانوں کی کیسی اپنی بادشاہی ہے؟ کہا جاتا ہے کہ ایوب خان پٹھان ہے۔ اور یہ بھی کہا جاتا ہے کہ پاکستان مسلمان ہے، اسلام ہے۔ آپ ذرا سوچئے تو سہی۔ اِن باتوں کی طرف ذرا دھیان دیجئے، غور و فکر تو کیجئے۔ اے الست پٹھانو! میں آپ سے پھر یہ بات کہتا ہوں کہ اگر آپ نے اپنی یہ حالت نہ

بدلی تو برباد ہو جائیں گے۔ میری بات مانیں یا نہ مانیں۔ یہ آپ کی اپنی مرضی ہے۔ میں تو آپ کا ایک خدمتگار ہوں۔ نذر نیاز یا شکرانہ لینے والا نہیں ہوں۔ آپ میری اپنی قوم ہیں۔ اگر میں آپ کی خدمت کرتا ہوں تو یہ خدا کے واسطے کرتا ہوں۔

اگر آپ لوگوں نے میری بات مان لی تو مجھے کیا دیں گے۔ خود آپ ہی آباد اور خوشحال ہو جائیں گے اور اگر آپ نے میری بات نہ مانی تو نقصان کس کا کریں گے؟ اپنے آپ کو نقصان پہنچائیں گے۔ اور میں نے تو آپ سے پہلے بھی کہا ہے اور اب پھر کہتا ہوں کہ اسے پٹھانو! میں آپ کی لیڈری نہیں کرتا، نہ اب لیڈر بنتا ہوں اور نہ ہی پھر کبھی آپ کا لیڈر بنوں گا۔ نہ ہی آپ کا بابا بننا چاہتا ہوں نہ آپ کا رہنما بننا چاہتا ہوں۔ میں تو آپ کا خادم ہوں۔ آپ کی خدمت کروں گا اور صرف آپ ہی کا خدمتگار نہیں ہوں تمام خلقِ خدا کا خادم ہوں۔ لہٰذا میں آپ سے یہ بات کہتا ہوں کہ آپ لوگ میری ان تمام باتوں پر اچھی طرح سے سوچ بچار کریں۔ اس اسلام کو بھی سمجھ لیں اور اس ایوب خان کو بھی پہچان لیں۔ پھر دیکھیں کہ پشتونوں کی یہ کیسی بادشاہی ہے؟ یہ دیکھنا آپ کا کام ہے۔ میں نے تو آپ سے عرض کر دیا ہے کہ وہ ملک (پاکستان) ہمارے خون سے بنا ہے۔ ہم نے ہی اسے بنایا ہے۔ ہم نے ہی انگریز کو نکال باہر کیا ہے۔ اب آپ لوگ سمجھ سکتے ہیں کہ کیا ہمیں لوگ ملک سے بے وفائی کریں گے۔ ہم ہی قوم کو دغا دیں گے۔ ہم نے یہ تمام تکالیف اور مصائب کس لئے برداشت کی تھیں؟ یہ سب پشتونوں اور پشتونوں کے ملک کے لئے۔ یہ ہم نہیں ہیں دوسرے ہی لوگ ہیں جو پاکستان کو خود برباد کرنا چاہتے ہیں۔ آخر آپ بھی دانا ہیں۔ خود سوچ بچار کر سکتے ہیں۔ کہ ایک گھرانے میں جب ایک ہی ماں باپ کے چار پانچ بھائی ہوتے ہیں۔ جب ان میں سے بڑا بھائی دوسرے بھائیوں کا حق دبانے والا بن جائے تو وہ گھر تباہ ہو جاتا ہے یہی بات تو یہی ہے کہ پاکستان

کو تباہ و برباد تو اس کے کرتا دھرتا ہی کرنا چاہتے ہیں لیکن اس کا الزام رکھتے ہیں ہم پہ۔

ایک اور بات آپ سے کہتا ہوں کہ پکتیا کے لوگ بڑے اچھے پشتون ہیں۔ اور میں جب پکتیا کے علاقے میں گیا تھا تو وہاں کے لوگ ہر ایک جلسے میں مجھ سے یہ بات کہا کرتے تھے کہ ہم تیار ہیں۔ میں نے انھیں بھی کہا تھا اور آپ سے بھی کہتا ہوں کہ میں آپ کو جنگ میں نہیں دھکیلتا۔ نہ ہی لڑائی کرنے کے لئے آپ سے کہتا ہوں۔ میں آپ کے پاس اس لئے آیا ہوں کہ پٹھانو! آپ کا گھر اُجڑ چکا ہے۔ آپ اپنا یہ گھر بنا لیں۔ اور آپ اس بات پر غور کریں کہ آپ بڑی قوم ہیں۔ آپ اپنے باپ دادا کی وہ تاریخ دیکھ لیں کہ آپنے ہمیشہ کیا کیا ہے۔ آپ نے ہمیشہ اپنے جھنڈے بلند رکھے ہیں اور دوسرے ملکوں میں جا کر گاڑے ہیں۔ شیر شاہ کون تھا؟ ہمارا پٹھان بھائی تھا۔ اس ملک کے رہنے والے اُٹھ کھڑے ہوتے۔ پٹھانوں کا جھنڈا بنگال اور کلکتہ پر لہرا دیا۔ میر ویس خان کون تھا؟ آپ ہی کا بھائی بن رہا پشتون تھا۔ وہ اُٹھ کھڑا ہوا تو پشتونوں کا جھنڈا اس نے اصفہان میں گاڑ دیا۔

احمد شاہ بابا کون تھے۔ پشتون تھے۔ آپ کے بھائی بند تھے۔ اسی ملک کے رہنے والے تھے۔ اُٹھ کھڑے ہوئے تو یہ جو آج لوگ اسلام اسلام کی دُہائی دے رہے ہیں اُنہیں معلوم ہو کہ اسی بابا مسلمان نے ملک کو مرہٹوں سے چھڑا دیا۔ دہلی کو فتح کر لیا۔ تو یہ کیا وجہ بن گئی ہے کہ آپ کے باپ دادا نے آپ کے لئے اتنی جو فتوحات اور فائدے حاصل کئے تھے وہ آپ سے عبث چلے گئے؟ اُنہیں آپ سنبھال نہیں سکے۔ اور وہ فتوحات اور فائدے تو جانے دیجئے۔ پشتونو! آپ کے بابا کے ملک اور آپ کے بابا کی سرزمین میں آپ دیکھئے ایک آدمی آتا ہے۔ پشتونو! آپ اپنا ملک سنبھال لیں میں چلا جاتا ہوں، تو اے پشتونو! آپ کا

ملک وہ پنجاب کیسے ہضم کرسکتا ہے ؟ لیکن چونکہ آپ کے اندر پارٹی بازی اور نفاق ہے۔ کشاکش اور دشمنی ہے۔ باہمی عداوت ہے۔ بڑے رسم ورواج ہیں۔ آپ لوگ اپنے دیش کی سدھ نہیں لیتے۔ آپس میں دست بگریباں ہیں۔ اگر آپ نے اپنا یہ گھر بنا لیا تو میں آپ کو یقین دلاتا ہوں کہ پٹھانوں کے دیش کو کوئی بھی نہیں کھا سکتا۔ آخر میں میں آپ لوگوں کے سامنے ایک پکتیانی کو پیش کرتا ہوں۔ آپ ان کی زبان سے سنئے کہ یہ کیا کہتے ہیں۔ اب میں اپنی تقریر ختم کرتا ہوں۔

جلسہ ہو رہا تھا۔ اس جلسے میں ہمارا ایک پٹھان بھائی (پکتیانی نیشنون) اٹھ کھڑا ہوا اور حاضرین پٹھانوں کو یوں خطاب کرنے لگا " اے پشتونو! ملک اس قوم کی ماں ہوتا ہے جو اس میں رہتی ہے۔ آپ کا ملک آپ کی ماں ہے۔ ماں۔ اب آپ کے ملک میں ایک آدمی (پاکستان) آیا ہے اور اس نے آپ کے ملک یعنی ماں کے دامن پر قدم رکھ دیا ہے۔ اب یہ آپ کی اپنی مرضی ہے کہ اس قدم کو اٹھا کے الٹ دیتے ہو۔ یا اپنی ماں اس آدمی (پاکستان) کے حوالے کرتے ہو!

دوسری تقریر

یوم پختونستان ۳۱ اگست ۱۹۶۶ء

بہنو اور بھائیو! تقریر کرنے سے قبل میں چاہتا ہوں کہ اعلیٰ حضرت شہنشاہ افغانستان وزیر اعظم اور حکومتِ افغانستان کا شکریہ ادا کروں کہ انہوں نے بدقسمت منتشر اور خانماں برباد پختونوں کو اکٹھا کیا ہے اور مجھے یہ موقع دیا ہے کہ میں چند باتیں اپنی بہنوں اور بھائیوں سے کہوں۔ اے بھائیو اور بہنو! اس دنیا کی مثال ایک رہٹ اور رہٹ کے لوٹوں کی سی ہے۔ آپ نے رہٹ دیکھا ہوگا کہ جب رہٹ چلتا یا گھومتا ہے تو لوٹوں کے چکر میں جو لوٹے نیچے کوئیں میں جاتے ہیں وہ پانی سے بھرتے جاتے ہیں اور جو اوپر آتے ہیں وہ پانی سے خالی ہوتے جاتے ہیں۔ اِدھر ایک لوٹا بھرا جاتا ہے، اُدھر اوپر آکر خالی ہو جاتا ہے۔ یہی حالت دنیا میں قوموں کی بھی ہوتی ہے۔ جس طرح رہٹ کے لوٹوں میں سے ایک بھر رہا ہوگا تو دوسرا خالی ہو رہا ہوگا۔ اگر آپ لوگ اپنے باپ دادا کی تاریخ کو دیکھیں تو اس دنیا میں جو ترقی اور عروج تمہارے بزرگوں نے حاصل کیا ہے ایسی ترقی دنیا کی اور قوموں کو حاصل نہیں ہوئی۔ جس زمانے میں ہمارا ملک روشن تھا اس زمانے میں یورپ کی قومیں عین اسی حال میں تھیں جو حال آجکل ہمارا ہے۔ وہ ناگفتہ بہ حالت اور جنگ و جدل میں مبتلا تھیں۔ اور اگر آپ لوگ اپنے باپ دادا کے اس زمانے کا تصور کریں جس زمانے میں دنیا کے دوسرے ملکوں میں ابھی اندھیرا تھا اور یہاں روشنی تھی تو آپ محسوس کریں گے کہ آج ہمارا کیا حال ہے۔ آج دنیا کی تمام قوموں میں اگر کوئی بے علم قوم ہے تو وہ صرف ہماری ہی قوم ہے۔ آپ سوچنے پر مجبور ہوں گے کہ ہماری یہ تباہی اور بربادی کس طرح ہوئی۔

اول سکندر آیا اور اس نے ہمارے ملک میں تباہی مچادی۔ اس وقت یہاں مکتب، لائبریریاں، ادبی ادارے اور یونیورسٹیاں تھیں، وہ سب سکندر نے تباہ و برباد کردیں۔ اس کے بعد چنگیز آیا۔ اس نے وہ کمی پوری کردی جو سکندر باقی چھوڑ گیا تھا۔ پھر عرب آئے اور عربوں کے بعد مغل آئے۔ اور مغلوں کے بعد فرنگی یعنی انگریز آئے۔ یہ انگریز قوم بڑی ہوشیار ہے، چالاک ہے، سیاست داں ہے، مدبّر اور مکار ہے اور یہ جو آج پختونوں کا گھر ویران اور اُجڑا ہوا ہے۔ یہ اسی فرنگی کی کارستانی کا کرشمہ ہے۔ اس کے سبز قدم پڑتے ہی ہمارے ملک کے ٹکڑے ٹکڑے ہوگئے۔ پھر ساتھ ساتھ فرنگی نے ہماری قوم کے بھی ٹکڑے ٹکڑے کردیئے اور اب وہ سبز قدم انگریز اپنا بوریا بستر یہاں سے گول کرگیا ہے اور ہمارے لئے پھر اُٹھ کر ترقی اور خوش حالی کے راستے پر گامزن ہونے کا موقع پیدا ہوگیا ہے۔ اسی لئے اب میں یہ کہتا ہوں کہ ہمارے مقدر کے لوٹے بھرے جانے والے ہیں۔

آج کی دنیا تو قوم پرستی کی دنیا ہے، اسی لئے قوموں کے مقدر کے لوٹے بھائی چارے اور عزیزداری سے بھرے جاتے ہیں۔ میں دیکھ رہا ہوں کہ آج اس مظلوم اور تنافل شعار قوم پختون میں قومیت کا احساس پیدا ہوچکا ہے، اس لئے میں کہتا ہوں کہ آج ہوگا یا کل ہوگا، یہ ہوگا ضرور کہ ہمارے لوٹے پھر بھرنے لگیں گے! — ہمارے مقدر کا لوٹا پھر خوش حالی اور ترقی سے بھر جائے گا۔ اگر آپ دنیا کی قوموں کے بارے میں موازنہ کریں تو یہ اقوام ہم سے طاقتور نہیں ہیں۔ جب میں جلال آباد میں تھا تو آپ کی یونیورسٹی کا ایک نوجوان طالب علم میرے پاس آیا۔ اس نے کہا "ایک جرمن نے مجھے کہا کہ اس نے یورپ کے لڑکے بھی دیکھے ہیں، امریکہ اور افغانستان کے لڑکوں کو بھی دیکھا ہے۔ خدا نے جو ذہن تم لوگوں کو دیا ہے وہ دوسروں کو میسّر نہیں تو پھر دنیا کی دوسری قوموں سے تم کیوں پیچھے (پسماندہ) ہو"

اُس لڑکے نے مجھے بتایا کہ اس کے پاس اس جرمن لڑکے کے اس سوال کا کوئی جواب نہ تھا اس لئے وہ میرے پاس آیا ہے کہ میں اسے اس سوال کا جواب دوں۔ میں نے اُسے جواب دیا کہ یہ نیا نہ قومیت کا ہے۔ جس قوم میں قوم پوری خلوص و محبت اور ہمدردی ہوگی وہ عروج حاصل کرے گی، خوشحال ہوجائے گی ہمارے اندر قوم پرستی، پریم پیار، اُنس اور ہمدردی نہیں ہے، ہم اِسی لئے پچھڑ گئے ہیں۔"

اُس لڑکے نے مجھ سے پوچھا: "اگر وہ جرمن مجھ سے یہ سوال کرے کہ تم لوگوں میں بھائی چارہ کیوں نہیں پیدا ہوا تو پھر میں اُسے کیا جواب دوں"؟

میں نے اُس لڑکے سے کہا کہ "جواب یہ ہے کہ دوسری قوموں میں ایسے لوگ پیدا ہوگئے جنہوں نے اپنے ملک و ملت کے لئے جان و مال کی قربانی دی اور ہم میں ایسے لوگ نہیں پیدا ہوئے اور کہیں کوئی پیدا ہوا بھی ہے تو ہم نے اُسے "کافر" بتایا ہے۔ وہابی گردانا ہے اور اُسے ہندو قرار دیا ہے۔ عجیب بات یہ ہے کہ آپ مجھے دیکھیں کہ میں ابھی تک ہندو ہوں۔ یہ مجھے ہندو کس نے بنایا؟ وہ کونسا قاضی ہے جس نے مجھے ہندو کہا ہے؟ میں فرنگی کے قاضی کی طرف سے ہندو کہا گیا ہوں اور ابھی تک کوئی بھی مجھے مسلمان نہیں بنا سکا۔ ہماری قوم کے جوانوں، بوڑھوں، مردوں اور عورتوں میں بھوک اور غربت نے بے حرمتی کا احساس پیدا کر دیا ہے لیکن اب احساس ہونے لگا ہے کہ ہم اپنی منزل پر پہنچ سکتے ہیں۔ لیکن شرط یہ ہے کہ ہم قدم اُٹھالیں۔ اگر ہم نے قدم اُٹھایا تو ہم آباد ہوجائیں گے۔ اور ہمارے بچے بھی آباد ہوجائیں گے۔

مذہب کے ہاتھوں ہم کس قدر ذلیل و خوار ہوئے ہیں۔ لیکن دیکھئے میں آپ کو ایک بات بتاتا ہوں اُسے دھیان سے سُنئے۔ دنیا میں مذہب کس لئے وجود میں آتا

ہے، انسان کو انسانیت سکھانے اور انسان میں انسانیت برقرار رکھنے کے لئے جس وقت دنیا اور دنیا کی قومیں انسانیت سے گری ہیں تو انہیں انسانیت کا سبق سکھانے کے لئے پیغمبر آیا ہے اور اپنے ساتھ مذہب لایا ہے تاکہ قوم کے اندر خلوص و محبت، قومیت اور بھائی چارہ پیدا کر دے۔ جن قوموں میں یہ خلوص و محبت، بھائی چارہ، ایثار و قربانی پیدا ہو جاتے ہیں وہ آسمان پر جا پہنچی ہیں اور جن قوموں میں یہ چیزیں پیدا نہیں ہوتیں وہ تباہ و برباد رہتی ہیں۔ مذہب کا مقصد انسان کو سچائی اور نیکی سے شناسا کرنا ہے۔ افراد میں خلقِ خدا کی خدمت کا جذبہ پیدا کرنا ہے اور انسان کے روحانی اور اخلاقی شعور کو فروغ دینا ہے۔

آیئے دیکھیں کہ جو مذہب ہماری دینی اور دنیاوی ترقی کے ضامن ہیں ہم انہی مذہبوں کے ہاتھوں کیوں تباہ ہیں؟ آج آپ جو مذہب دیکھ رہے ہیں یہ خدا اور رسولؐ کا مذہب نہیں ہے یہ سرمایہ داروں کا مذہب ہے۔ حضرت محمدؐ صاحب آئے۔ وہ ہمارے لئے ایک اچھا خاصہ نظام لے کر آئے اور انہوں نے فرمایا کہ مسلمان وہ ہے جس کے ہاتھ اور جس کی زبان سے دوسروں کو نقصان نہ پہنچے تاکہ خدا کی مخلوق کو نیکی، فائدہ اور راحت ملے۔ دوسری بات ہمیں یہ بتائی ہے کہ حب الوطن من الایمان" یعنی وطن سے محبت ایمان ہے۔

بھائیو! میں آپ کو ایک عجیب بات بتاتا ہوں۔ یہ جو میں ہندو قرار دیا گیا ہوں تو اسی محبت کی وجہ سے اور اس لئے کہ میرے دل میں قوم، ملک اور خلقِ خدا کے لئے خلوص و محبت ہے۔ ایک اور عجیب بات آپ کو بتاتا ہوں۔ ایک دن ہم جلال آباد میں بیٹھے تھے۔ وہاں ایک عورت آئی اور بیٹھ گئی۔ ملک و ملت کی باتیں شروع ہو گئیں تو اس عورت نے کہا "مجھے خدا، ملک اور قوم پر قربان کر دو" اور اس نے یہ بھی کہا "اگر میں قوم کی جنگ میں مرتی ہوں تو مجھے اس پر

فخر ہے کہ سینہ پر گولی کھاؤں اور شہید ہو جاؤں "

جب وہ عورت چلی گئی تو مجھے ان جنّت کے ٹھیکیداروں میں سے چند ایک نے کہا کہ یہ عورت کافر ہے۔ مجھے جنّت کے ٹھیکیداروں کی اِس بات پر بڑی حیرت اور افسوس بھی ہوا۔ ان کا اس عورت کو کافر قرار دینا کہاں تک رسول اللہ کی تعلیم کے مطابق ہے؟ رسولِ مقبول کا کہنا ہے کہ ملک سے پیار و محبت ایمان ہے۔ میں پوچھتا ہوں کہ یہ ایمان جنّت و مذہب کے ان ٹھیکیداروں کے اندر ہے یا اس عورت میں ہے۔ یہ بات آپ لوگوں سے اس لئے کہتا ہوں کہ اب بھی اس قسم کے لوگ ہمارے اس ملک میں موجود ہیں! ملک و قوم کے دشمن جواب بھی یہاں موجود ہیں وہ پٹھانوں کو نہیں چھوڑتے۔ وہ مذہب کے نام پر آج بھی ہمیں دھوکا دینا چاہتے ہیں۔ آپ جانتے ہیں کہ عیسیٰ علیہ السلام نے اپنی اُمّت سے کہا تھا۔ آیئے عیسائی مذہب کے بانی کی ایک معرکہ کی بات سُنئے۔ حضرت عیسیٰؑ نے فرمایا ہے کہ "اگر کوئی تمہارے ایک گال پر تھپڑ مارے تو تم اُس کے آگے دوسرا گال کر دو" اب ذرا اُن کی امت کے کارنامے دیکھئے۔ یہ جو ہندوستان میں لوگ لاکھوں کی تعداد میں تباہ ہوئے۔ یہ تباہی، نفرت اور جنگ و جدل کس نے پیدا کئے؟ آپ لوگ فلسطین کو دیکھئے اور قبرص کو دیکھئے۔ ان جگہوں پر عیسائی مذہب کے لوگ کیا کر رہے ہیں؟ اُدھر ویت نام کو دیکھئے۔ یہ ویت نام میں کیا ہو رہا ہے؟ اور کس چیز کے لئے ہو رہا ہے، امریکہ کی فوجیں اور ہوائی جہاز وہاں کیا کر رہے ہیں؟ یہ امریکہ بھی عیسیٰ کے مذہب کو ماننے والا ہے، دیکھ لیجئے وہ اپنے مذہب پر کیا عمل کر رہا ہے؟ اسی لئے میں کہتا ہوں کہ آج دنیا میں خدا اور رسولؐ کا وہ دین نہیں ہے جو محبت، پیار، سچائی اور خلوص اور خلقِ خدا کی خدمت کے لئے ہے۔

آج آپ پاکستان کو دیکھیں وہاں اسلام اسلام کی رٹ لگائی جارہی ہے۔ آپ لوگ اس کے عمل کو دیکھئے۔ کیا میں پاکستان کے عوام سے پوچھ سکتا ہوں کہ اے پاکستانی بھائیو! باجوڑ کے پختونوں نے کیا گناہ کیا تھا کہ آپ نے اُن پر بم برسائے، عورتوں، بچوں اور بوڑھوں کو تباہ کر دیا۔ کیا یہ اسلام ہے؟ اور آج ہمارے بلوچی بھائیوں پر بمباری ہو رہی ہے، انہوں نے کون سا گناہ کیا ہے؟ اے بھائیو! کیا ہم مسلمان نہیں ہیں؟ اسلام کیا یہ کہتا ہے کہ اپنا حق نہ مانگو؟ اگر ایک باپ کے پانچ بیٹے ہوں اور ان میں سے چار اُٹھ کر اپنے بڑے بھائی سے کہتے ہیں کہ ہمیں ہمارا حق دے دو تو اس مسئلہ میں اسلام کیا کہتا ہے کہ حق نہ دیا جائے یا دے دیا جائے؟

یہاں پاکستان کے ایجنٹ ہیں جو قسم قسم کی باتیں کرتے ہیں اور کہتے ہیں "اے باچا خان! پاکستان بھی تو مسلمان ہے؟"

میں جواب میں کہتا ہوں "اے لڑکے! کس نے کہا ہے کہ پاکستان مسلمان نہیں ہے اور ایوب خان تو ہمارا بھائی ہے، پختون ہے۔ لیکن اسلام کیا کہتا ہے؟ کیا اسلام یہ کہتا ہے کہ اپنا حق مت مانگو؟ ہم بھی تو اپنا حق ہی مانگتے ہیں، ہم بھی تو کہتے ہیں کہ اسلام میں بھائی چارہ ہے ہمیں بھائی بناؤ غلام مت بناؤ کیونکہ ہم غلامی برداشت نہیں کر سکتے!"

آخر میں پختونستان کے بارے میں چند باتیں کہتا ہوں۔ اٹھارہ برس ہو گئے ہیں لیکن ہم ابھی تک اپنی منزل پر نہیں پہنچے ہیں۔ اس کی وجہ یہ ہے کہ ہم نے پختونستان کو اپنی چیز نہیں سمجھا ہے۔ اب خدا کا فضل ہے کہ پختونوں کے ٹوٹے بھر رہے ہیں۔ پختونوں کے اندر احساس پیدا ہو چکا ہے، قوم پروری اور بھائی چارہ پیدا ہو چکا ہے۔ دوسری بات یہ ہے کہ ہم نے عزم کر لیا ہے کہ یہ

پختونستان ہمارا ملک ہے، ہم اس کی تعمیر کریں گے۔ ہمارے پاکستان میں پہلے مغربی پاکستان کے ایک گورنر ہیں جن کا نام امیر محمد خاں ہے۔ اُن سے کسی نے کہا تھا کہ پختونوں کو ان کا حق دیدیجئے۔ وہ اس آدمی کے سامنے ہنس پڑے۔ اور بولے کہ پختونوں میں کوئی ایسا آدمی ہے جس کے سر کی قیمت نہ ہو اور جب کسی قوم کے لیڈر پیسوں میں بکتے ہوں تو اس کا ملک میں کیا حق ہے؟" میں اپنے ان گورنر صاحب سے اس قدر عرض کرنا چاہتا ہوں کہ وہ ذرا دنیا کو دیکھیں کہ دنیا کس طرح بول رہی ہے۔

یہی گورنر صاحب ہمارے جن قبائلی بھائیوں کی بابت کہا کرتے تھے کہ پیسوں پر ایمان رکھتے ہیں وہ قبائلی آج ویسے نہیں رہے۔ گورنر صاحب اُن مظلوم، عاجز اور قابلِ رحم باجوڑیوں کو دیکھیں، انہوں نے قوم کے مقابلے میں پیسہ نہیں لیا ہے۔ میں امید کرتا ہوں کہ جیسے خربوزہ خربوزے کو دیکھ کر رنگ پکڑتا ہے، اسی طرح باجوڑ کے غیرتی بھائیوں نے جو قدم اُٹھایا ہے اس کا دوسرے پختونوں پر ایک زبردست اثر ہوگا۔ آپ کو معلوم ہے کہ میں عدم تشدد کے عقیدے کا آدمی ہوں ہمارا یہ عقیدہ ہے کہ اگر کوئی دنیا میں امن چاہتا ہے تو یہ امن بغیر اس کے نہیں ہو سکتا کہ پختونوں کا یہ مسئلہ حل کر دیا جائے۔ میں روس اور امریکہ دونوں سے کہتا ہوں کہ اس مسئلے میں بدامنی کا احتمال ہے اور اگر وہ سچے معنوں میں دنیا کا امن چاہتے ہیں تو اس مسئلے کو حل کر دیں۔ ہم کیا چاہتے ہیں؟ ہم تو پاکستان سے برادرانہ محبت کرتے ہیں اور اُسے کہتے ہیں کہ ہمیں بھائی بنا لو اور ہمیں غلام مت بناؤ، کیونکہ ہم نے اگر فرنگی کی غلامی نہیں کی تو اس کی غلامی کیسے کر سکتے ہیں؟

جب ہندوستان اور پاکستان کی جنگ جاری ہو گئی تو اخباروں میں یہ

بابت چرچے شروع ہو گئے۔ اس وقت پاکستان کے سفارت خانے کے آدمی میرے پاس آئے اور انہوں نے کہا کہ "ہم نے سنا ہے کہ آپ ہندوستان جا رہے ہیں؟" میں نے انہیں کہا کہ "آپ دیکھتے نہیں کیا کہ میں تو یہاں بیٹھا ہوں۔ آپ لوگ میرے بھائی ہیں۔ میں تو آپ کی طرف اُمید کی نگاہوں سے دیکھتا ہوں، لیکن جب آپ میرے ساتھ برادرانہ سلوک نہیں کریں گے اور پختونوں کو اپنا حق نہیں دیں گے تو میں کب تک آپ کا منہ دیکھتا رہوں گا؟ ۔ میں ہندوستان نہیں جاتا۔ آپ لوگ مجھے زبردستی سے ہندوستان بھیجتے ہیں۔ اگر آپ مجھے میرا حق دے دیں تو میں ہندوستان کیوں جاؤں گا؟" میں آپ سامعین کو یہ بات بتاتا ہوں۔ کیونکہ آج تو اسلام دھوکے کے لئے ہے۔ اس لئے میں آپ سے کہتا ہوں کہ انصاف آپ ہی کیجئے اے پختون بھائیو! انصاف آپ ہی کیجئے۔ ہم تو دریا میں ڈوب چکے ہیں۔ میں اپنے ان مسلمان بھائیوں سے کہتا ہوں کہ خدا کے واسطے ہماری طرف ہاتھ بڑھائیے، لیکن یہ ہاتھ نہیں بڑھاتے ایک ہندو کھڑا ہے۔ وہ کہتا ہے لو میں ہاتھ بڑھاتا ہوں اسے پکڑ لو یعنی میرا ہاتھ پکڑ لو اور ڈوبنے سے بچ جاؤ .... اس حالت میں آپ لوگ کیا کہتے ہیں؟ اپنا ہاتھ پکڑا دوں یا "پختون" کو دریا میں بہا دوں" (لوگوں نے نعرے لگائے کہ ہاتھ بڑھا دو)

میں وہ آدمی ہوں کہ میری قوم غرقِ دریا ہو رہی ہے۔ ہندو کو چھوڑ دیجئے اگر مجھے لال کافر بھی ہاتھ دے گا تو بھی میں اس کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے دوں گا۔ میں اس مسلمان اور پاکستان سے کہتا ہوں کہ میں یہ مسئلہ بھائی چارے سے حل کرنا چاہتا ہوں، اسے بھائی چارے سے حل کر دو۔ میں پختونوں سے کہتا ہوں کہ اگر آپ نے اپنا گھر بنا لیا اور آپ نے قوم پرستی، پیار محبت،

بھائی چارہ اور اخوت پیدا کرلی تو ہم جنگ کے بغیر ہی اپنے پاکیزہ مقصد میں کامیاب ہو جائیں گے۔

اجتماع (جرگہ) میں سے ایک آدمی اُٹھ کھڑا ہوا اور با ادب بولا۔ "ٹھیک ہے باچا خان ..... اور اگر پھر بھی پاکستان نے ہمیں ہمارا حق نہ دیا تو کیا کریں گے؟"

میں نے کہا: "پھر جو مرضی ہو کرنا"

●

تیسری تقریر

یومِ پختونستان ۳۱ اگست ۱۹۶۷ء

میں سب سے پہلے اعلیٰ حضرت اور اُن کی حکومت کا شکریہ ادا کرنا چاہتا ہوں کہ انہوں نے ہم منتشر اور بدقسمت پشتونوں کو ایک جگہ اکٹھا کیا ہے تاکہ ہم اپنے بھائی چارے، اخوت اور قومیت کے بارے میں آپس میں بیٹھ کر ضروری باتیں کریں۔

بھائیو اور عزیزو! تم لوگ پٹھانوں کی تاریخ دیکھو کہ جب کبھی پختونوں پر کوئی مصیبت نازل ہوئی تو اس قوم میں ایک عظیم انسان پیدا ہوا اور اسی افغانستان میں پیدا ہوا۔ اُس نے پختونوں کے بکھرے ہوئے قبیلے اکٹھے کئے۔ ان کے ساتھ صلاح و مشورہ کیا۔ ان کی تنظیم کی اور جب دُعائے خیر کرکے آگے بڑھا تو پھر کوئی طاقت اُس کا قدم پیچھے نہیں ہٹا سکی۔ تم لوگ خود دیکھو گے کہ پہلے ہم ایران کے غلام تھے ہم میں اس وقت میرویس خان نام کا ایک آدمی پیدا ہوا۔ اس نے قبائل کو ایک جگہ جمع کیا۔ اور انہیں تمام مصیبتوں سے نجات دلادی۔ اور اسی افغانستان میں احمد شاہ بابا پیدا ہوا۔ اس نے بھی پختونوں کی تنظیم کی اور پھر افغانستان سے دہلی جا پہنچا۔ وہاں اپنا جھنڈا لہرا دیا۔ جب وہ دہلی سے واپس آرہا تھا تو راستے میں جہلم پر آکر رُک گیا۔ اُس نے اپنے ساتھی پختونوں سے کہا "دیکھو یہ جہلم سے لے کر دریائے آمو تک اور ہرات تک تمہارا ہی ملک ہے۔"

اے بھائیو! ذرا غور کرو کہ یہاں انگریز آیا تو اس نے ایک لکیر کھینچ دی اور جب وہ جا رہا تھا تو اس نے اپنے وارثوں کو یہ ملک دے دیا۔ تم اپنے باپ دادا کے ملک کو نہیں سنبھال سکے۔ جہلم تمہارے ہاتھ سے گیا۔ تو رخم تمہارے پنجے سے نکل گیا ایسا کیوں ہوا۔ میں تمہیں یہی سمجھانے آیا ہوں۔ ذرا سوچو کیا ہم میرویس خان، یا

احمد شاہ بابا کی اولاد نہیں ہیں؟ کیا وجہ ہے کہ وہ تو جہاں جاتے تھے، اپنے ملک کا جھنڈا گاڑ آتے تھے۔ احباب دوسرے لوگ تمہارے ملک میں آکر اپنا جھنڈا گاڑ دیتے ہیں۔ یہ تماشہ کیوں ہوتا ہے؟ میں اس لئے تمہارے پاس آیا ہوں کہ تم زمانہ بابک پر غور کرو۔ اے بھائیو! اس کی وجہ صاف ہے کہ ہم پختونوں میں بھائی چارہ، محبت اور صلاح ومشورے کی بات نہیں رہی، ہم میں نفسا نفسی آگئی ہے۔ یہی وجہ ہے کہ دوسرے لوگوں نے ہمارے ملک پر اپنے جھنڈے لہرا دیئے ہیں۔

مجھے تین برس ہو گئے یہاں آتے ہوئے۔ میں افغانستان کے ہر گوشے اور قبیلے میں گیا ہوں۔ مجھے خوشی ہے کہ آج افغانستان کے بہادر لوگوں میں قومیت کا احساس، بھائی چارے اور اخوت کا جذبہ پیدا ہو چکا ہے اور میں امید کرتا ہوں کہ یہ احساس ایک دن ضرور رنگ لائے گا۔ مجھے امید ہے کہ ہم اپنے مقصد میں ضرور کامیاب ہو جائیں گے۔

بھائیو! میں آپ کو ہر بار پختون پختون جو کہتا ہوں، کہیں ایسا نہ ہو کہ آپ کے دل میں یہ خیال آجائے کہ میں صرف پختون کو ہی پختون سمجھتا ہوں۔ میں تو اس عقیدے اور خیال کا آدمی ہوں کہ جہلم سے آمو اور ہرات تک جس قدر لوگ بستے ہیں، وہ سب افغان ہیں۔ سب پشتون ہیں اور یہ ملک ان تمام کا مشترکہ ملک ہے۔ اس لئے میں آپ لوگوں سے کہتا ہوں کہ آپ ذرا باہر کی دنیا کو دیکھئے۔ میں جب یورپ گیا تھا تو انگریز کو دیکھ کر اس سے پوچھتا تھا "تم کون ہو؟" جواب ملتا "میں انگریز ہوں"۔ جب کسی جرمن کو دیکھتا تھا تو میرے پوچھنے پر وہ بھی یہی جواب دیتا تھا کہ "میں جرمن ہوں"۔ ایسا ہی جواب روسی اور امریکن سے ملتا تھا۔

آج دنیا تو آباد ہے لیکن ہم نہیں آباد ہو سکے۔ اس کی وجہ کیا ہے؟ جب میں افغانستان میں آیا اور ایک آدمی سے میں نے پوچھا کہ تم کون ہو؟ جواب ملا۔ میں

ہزارہ ہوں۔ دوسرے سے پوچھا۔ تم کون ہو؟ جواب ملا میں ترکمن ہوں کسی نے کہا میں پختون ہوں۔ فارسی وان ہوں۔ یہی چیز ہماری بربادی کا موجب ہے۔ انہی باتوں نے ہم میں نا اتفاقی پیدا کردی ہے۔ انہی باتوں سے ہم کمزور ہوگئے ہیں اور جو بھی آپ سے اس قسم کی علیحدگی کی باتیں کہتا ہے وہ آپ کا دوست نہیں ہے۔ آپ ذرا امریکہ چلے جایئے۔ وہاں انگریز ہیں، فرانسیسی آباد ہیں، ہسپانوی موجود ہیں، افریقہ کے سیاہ فام حبشی رہتے ہیں۔ ان کی تعداد تین کروڑ کے لگ بھگ ہے، لیکن جس کسی سے بھی پوچھیں گے کہ "تم کون ہو؟" وہ کہے گا "میں امریکن ہوں"۔ کوئی انگریز یہ نہیں کہے گا کہ "میں انگریز ہوں" بلکہ وہ اپنے کو امریکن ہی کہے گا۔ اسی طرح کوئی جرمن بھی اپنے آپ کو جرمن نہیں کہے گا بلکہ بڑے فخر سے کہے گا "میں امریکن ہوں" لہٰذا یہ بات یاد رکھیئے کہ ہم جس ملک کے رہنے والے ہیں اس ملک کو افغانستان کہتے ہیں۔ لہٰذا یہاں کا ہر آدمی اپنے آپ کو افغان کہے۔

میں آپ سے ایک بات اور کہتا ہوں اور وہ یہ ہے کہ دنیا کی قومیں تو آگے بڑھ رہی ہیں مگر ہم نیچے گڑھے میں گر رہے ہیں۔ دنیا کی قومیں آسمان پر جا پہنچی ہیں اور ہم زمین پر آگئے ہیں۔ آخر اس کا سبب کیا ہے؟ یہ کیوں ہے؟ کیا ہم ایک قوم نہیں ہیں؟ ہر ایک سے توانا اور اچھی قوم ہیں۔ خدا نے ہمیں ایک نہایت خوبصورت ملک دیا ہے، جو رنگا رنگ نعمتوں اور دولتوں سے بھرپور ہے۔ پھر ہم دنیا کی قوموں سے پیچھے کیوں ہیں؟ اس کی وجہ میں آپ لوگوں کو بتاتا ہوں۔ ہمیں رسول اللہ صلعم نے فرمایا تھا کہ "اے مسلمانو! اگر تم کو دنیا سے بہت زیادہ پیار ہونے لگا تو اس کا نتیجہ یہ ہوگا کہ تمہاری یہ دنیا بھی برباد ہو جائے گی اور آخرت میں بھی ذلیل و خوار ہو جاؤ گے"۔ یہ باتیں میں آپ کو اپنی طرف سے نہیں کہہ رہا ہوں چودہ سو برس ہوگئے۔ یہ بات آپ سے رسول اللہ صلعم نے فرمائی ہے۔ جب آپ لوگوں نے اسے

بھلا دیا ہے تو اب دیکھئے کہ اس دنیا میں ہم سے زیادہ کوئی قوم ذلیل و خوار نہیں ہے۔ اس خوبصورت ملک میں تو اب کسی کی روٹی بھی نہیں ہے کہ ہم پیٹ بھر کر کھا سکیں۔ آپ ایک بار اسلام کی تاریخ کو دیکھئے۔ اس وقت کی تاریخ کو جس وقت حضرت عمر رضی اللہ عنہ اس دنیا سے رحلت کر گئے تھے۔ آپ اس بات کو بھی سوچئے سمجھئے کہ وہ مسلمان جنہیں رسول اللہ صلعم نے تعلیم دی تھی اس تعلیم کو بھول گئے۔ وہ کون سی چیز ہے جس نے آن سے رسول اللہ کی تعلیم بھی بھلا دی ہے وہ چیز ہے پیسے کا لالچ اور پیار اور اقتدار کی بھوک۔

یہ دو چیزیں جس قوم اور ملک میں بھی پیدا ہو جاتی ہیں وہ قوم اور ملک دنیا میں آباد نہیں ہو سکتے! ہم جو آج تباہ و برباد ہیں تو انہی چیزوں کے ہاتھوں ہمارا یہ حال ہوا ہے۔ آپ ذرا مسلمانوں کی تاریخ کو دیکھئے۔ ان کی دولت سے محبت اور اقتدار کے شوق کا نتیجہ کیا نکلا؟ صاف ظاہر ہے کہ مسلمانوں میں گروہ بندی پیدا ہو گئی مسلمان پارٹی در پارٹی بٹ گئے مسلمانوں میں اور ان کی جماعت میں انتشار پیدا ہو گیا اور اس کا نتیجہ جنگ و جدل کی بھیانک صورت میں نکلا وہ مسلمان جنہیں رسول اللہ صلعم نے محبت و پیار کی تعلیم دی تھی، خانہ جنگی میں مبتلا ہو گئے۔ ہزاروں کی تعداد میں مسلمان آپس میں دست بگریباں ہو کر قتل ہو گئے۔ دولت سے محبت اور اقتدار کے شوق نے انہیں خدا اور رسول پاکؐ کی تعلیم سے بیگانہ کر دیا۔ میں آج بھی دیکھتا ہوں کہ مسلمانوں نے ابھی تک اپنے مذہب کو دوبارہ تلاش نہیں کیا ہے۔ ایک وقت تھا جب ساری دنیا میں اندھیرا چھایا ہوا تھا اور مدینہ میں جمہوریت کا ایک ننھا سا دیا جل رہا تھا۔ میں یہ مانتا ہوں کہ وہ جمہوریت صرف مدینہ کے شہر تک محدود تھی! لیکن دنیا بھر میں اندھیرا تھا اور مدینہ میں روشنی تھی۔ لیکن رسول پاکؐ کی تعلیم سے بیگانگی اور مذہب کو دوبارہ تلاش نہ کرنے کا نتیجہ یہ نکلا کہ وہ دیا بھی بجھ گیا

اور اسے ابھی تک مسلمانوں نے نہیں چلایا۔ وہ جمہوریت انہوں نے پھر حاصل نہیں کی۔ آپ ذرا اپنے پاکستان کو دیکھئے اور ذرا ہم پختونوں کو بھی دیکھئے۔ ان بلوچیوں کو دیکھئے۔ سندھیوں، بنگالیوں اور پنجابیوں کو دیکھئے کہ ہم لوگوں کو اس فرنگی (انگریز) نے جو جمہوریت دی تھی، وہ ہمارے بھائی ایوب خان نے ہم سے چھین لی اور ہمیں اس کے بدلے کیا دیا؟ بیشک جمہوریت دیدی جیسے لوگ بے بنیاد جمہوریت کے نام سے پکارتے ہیں لہٰذا آپ لوگ سوچیں اور اس بات پر غور کریں کہ یہ لوگ ابھی تک اس بات کو بھی نہیں سمجھ سکے، اسلام کو نہیں پہچان پائے، جمہوریت کو نہیں جان سکے، اس لئے میں آپ سے یہ کہتا ہوں کہ یہ ہماری ناسمجھی اور اقتدار کی بھوک کا نتیجہ ہے۔ آپ غور و فکر کریں۔ میں دنیا کی زیادہ مثالیں نہیں دینا چاہتا۔ صرف ہندوستان کی مثال پیش کرتا ہوں۔ ہندوستان کو دیکھئے۔

برما میں بھی ایک جرنیل پیدا ہوا تھا۔ اس کا نام جنرل نیون ہے۔ وہ کافر ہے اور پاکستان میں بھی ایک جرنیل اٹھا جس کا نام ایوب خان ہے۔ یہ کہتا ہے میں نے بھی انقلاب برپا کیا ہے۔ اب آپ ان دونوں کے انقلاب پر غور کیجئے۔ انقلاب تو تبدیلی کو کہتے ہیں۔ آگے لے جانے کو کہتے ہیں پیچھے جانے کو تو کوئی انقلاب نہیں کہہ سکتا۔ ذرا ایوب خان کے انقلاب اور اس کافر کے انقلاب کو دیکھئے۔ انہوں نے لوگوں کو جمہوریت دے دی اور ہمارے انقلاب کو دیکھئے مسلمانوں اور ایوب خان کے انقلاب کو دیکھئے۔ میں نے تو آپ سے کئی بار کہا ہے کہ وہ (ایوب خان) ہمارا بھائی ہے۔

آپ غور کریں کہ جو جمہوریت ہمیں فرنگی نے دی تھی، ہمارے بھائی ایوب خان نے وہ بھی ہم سے چھین لی ہے۔ میں تو آپ سے یہاں تک کہتا ہوں کہ ہر

جمہوریت ہی نہیں، ہماری اقتصادیات کو دیکھئے، ہماری زبان کو دیکھئے، ہماری تہذیب کو دیکھئے، ہماری معاشرت اور تمدن کو دیکھئے، ہم سے سب کچھ چھین لیا گیا ہے۔ اور اس طرح ان سب چیزوں کو دیکھتے ہوئے ذرا ہمارے مدرسوں اور کالجوں کو بھی دیکھئے اور ہمارے بچوں کی تعلیم و تربیت کو بھی دیکھئے۔ اور پھر ان کے اخلاق کو دیکھئے۔ میں تو ان لوگوں پر حیران ہوں جو چلا چلا کر کہتے نہیں تھکتے کہ ہم نے بڑی ترقی کی ہے۔ پاکستان ترقی کی منزلیں طے کر رہا ہے دراصل ہمارے ساتھ وہ مذاق ہوا ہے جس کے بارے میں میں آپ کو ایک قصہ سناتا ہوں۔

"کہتے ہیں کہ ایک عورت نے اپنے شوہر سے کہا پیارے، مجھے ناک کی نتھ بنوا دو۔ اور اس نے شوہر کو مضبوطی سے پکڑ لیا۔ شوہر نے اس سے کہا کہ میں تو تمہاری ناک کاٹنے کی فکر میں ہوں"۔ آپ پاکستان کو دیکھئے اور پھر اپنے پختون بھائیوں کو دیکھئے۔ یہ تو ہماری ناک کاٹنے کی فکر میں ہے اور آپ ہیں کہ اسے ناک کی نتھ بنوا دینے کے لئے کہہ رہے ہیں۔ دوسری بات جو میں آپ سے کہنا چاہتا ہوں وہ ایوب خان کی کتاب کے بارے میں ہے۔ ایوب خاں نے ایک کتاب لکھی ہے۔ اس کتاب میں افغانستان کی بابت بڑی باتیں کہی ہیں، لیکن ان کا جواب افغانستان کے صدر اعظم صاحب (وزیر اعظم افغانستان) نے دے دیا ہے۔ میں آپ سے اس کتاب کے بارے میں وہ بات کہنا چاہتا ہوں، جس کا تعلق ہم پختونوں سے ہے۔ ایوب خاں نے اس کتاب میں لکھا ہے... کہ پختونستان میں ریفرینڈم ہوا ہے اور پختونوں نے اپنا ووٹ پاکستان کے حق میں دیا ہے۔ یہ بات سراسر غلط اور جھوٹ ہے۔ دنیا کو معلوم ہے کہ ہم پختونوں نے ریفرینڈم میں حصہ نہیں لیا تھا اور میں اس بات کو نہیں سمجھ سکتا کہ

یہ پرانی باتیں ہیں۔ ان پر اب کچھ لکھنے کی ضرورت ہی کیا ہے۔ ہم تو کہتے ہیں کہ گزشتہ را صلوٰۃ ..... اور اگر تم اپنی ضد پر اڑے ہو تو میں نہیں کہوں گا کہ آؤ اور ریفرینڈم ہی کر لو اور پختونوں کی رائے لے لو۔ ہم اس بات کے لئے تیار ہیں کہ پشتونوں کی رائے معلوم کر لیں۔

ہمارے کچھ خود غرض، مطلب پرست اور دولت کے بھوکے بھائی ایسے بھی ہیں جو پروپیگنڈہ کرتے ہیں کہ "پاکستان بھی تو مسلمان ہے آپ اس سے کیا مانگتے ہیں؟" میں کہتا ہوں۔ یہ کس نے کہا ہے کہ پاکستان مسلمان نہیں ہے؟ ہم تو کہتے ہیں کہ پاکستان مسلمان ہے اور ہمارا بھائی ہے لیکن اے بھائیو! ذرا یہ تو سمجھنے کی کوشش کیجئے کہ ہم ان سے کیا مانگتے ہیں؟ ہم تو صرف یہ بات کہتے ہیں کہ پاکستان مسلمان ہے، ہم بھی مسلمان ہیں۔ اسلام میں غلامی نہیں ہے، بھائی چارہ ہے۔ محبت اور پیار ہے۔ ہم بہانگِ دہل کہتے ہیں کہ اے پاکستانیو! ہم پشتون مسلمان ہیں اور تم بھی مسلمان ہو۔ اسلام میں بھائی چارہ ہے تو ہمیں اپنا بھائی بنا لو، لیکن وہ چاہتے ہیں کہ ہم ان کے غلام بنے رہیں!

بھائیو! جب پاکستان میں مارشل لا تھا تو آپ کو یاد ہوگا کہ اس وقت روس کے صدر اعظم خروشچیف آئے تھے۔ انہوں نے پشتونوں کے حق میں تقریر کی تھی اور اس تقریر کی وجہ سے لوگوں میں ایک زلزلہ برپا ہوگیا تھا۔ صدر صاحب محمد ایوب خاں نے مجھے بلایا تھا۔ میں جب ان کے پاس گیا تو پوچھا "خیریت تو ہے، مجھے کس لئے بلایا ہے؟"

ایوب خاں نے جواب دیا "معلوم نہیں؟"

میں نے پوچھا "کیا بات ہے؟"

انہوں نے کہا "خرشچیف نے تقریر کی ہے"
میں نے کہا "مجھے معلوم ہے۔ لیکن آپ نے مجھے کس لئے بلایا ہے؟"
ایوب خاں نے کہا "تم اس کی تردید کردو"
میں ہنس پڑا اور کہا "پختونوں کو اُن کا حق دیدیجئے تو میں اس کی تردید کردوں گا۔ اور جب آپ پشتونوں کو اُن کا حق نہیں دیتے تو میں کیونکر اس کی تردید کروں؟"

میرے پاس پاکستان کے وزیرِ خارجہ منظور قادر بھی آئے تھے اُن سے ساڑھے چار گھنٹے تک بات چیت ہوتی رہی۔ پہلے تو جمہوریت پر بات چلی۔ انہوں نے کہا کہ "یہاں (پاکستان میں) چونکہ جمہوریت ناکام ہوگئی ہے اس لئے ہم نے ان لوگوں سے واپس لے لی ہے"

میں نے اس سے کہا "جمہوریت تھی کہاں جو واپس لے لی گئی؟... پاکستان میں جمہوریت تھی ہی کب جو ناکام ہوگئی ..... ہندوستان میں تو تین چار الیکشن ہوچکے ہیں اور یہاں پاکستان میں کس نے الیکشن کیا ہے، اور کس نے اِن لوگوں سے پوچھا ہے؟"

میں نے ایوب خاں سے یہ بھی کہا "ہم پاکستان میں پانچ بھائی ہیں۔ ایک پنجابی ہے، ایک بنگالی ہے، ایک سندھی ہے، ایک بلوچی ہے، اور ایک پشتون ہے۔ ہم یہ چاہتے ہیں کہ ہمارے یہ جو الگ الگ گھر ہیں، اِن گھروں میں انہی کا حق ہو جن کے یہ گھر ہیں۔ پنجابی کا جو گھر ہے اس کا اختیار پنجابی کو ہو۔ سندھی کے گھر پہ اختیار کی باگ ڈور سندھی کے ہاتھ میں ہو۔ بلوچی کے گھر پر بلوچی کا اختیار ہو۔ بنگالی اپنے گھر کا مختار اور مالک ہو۔ پختون کے گھر پہ اختیار کی باگ ڈور پختون کے ہاتھوں میں ہونی چاہیئے۔

انہوں نے مجھے جواب دیا: "انہیں الگ الگ گھر مت کہو۔"
میں نے پوچھا "پھر کیا کہوں؟"
انہوں نے جواب دیا "یہی کہو کہ ہم سب کا ایک گھر ہے۔"
میں نے کہا "واقعی ہمارا ایک گھر ہے، لیکن آپ سے پوچھنا چاہتا ہوں کہ اس گھر میں مجھے بھی کوئی کمرہ دیں گے یا نہیں؟"
انہوں نے کہا: "ہاں کمرہ دوں گا۔"
میں نے کہا "مجھے منظور ہے، لیکن میرے کمرے پر میرا اختیار ہوگا یا آپ کا؟ میں مانتا ہوں کہ میرا اور آپ کا ساتھ مشترک ہے۔ ہم آپ کے بھائی ہیں۔ ہم سب کا ایک ہی گھر ہے۔ لیکن گھر میں میرا جو کمرہ ہوگا، اس پر اختیار تو میرا ہوگا نہ کہ آپ کا۔"
بھائیو! میں آپ سے اب صاف صاف یہ کہنا چاہتا ہوں کہ ہم پاکستان سے کیا مانگتے ہیں؟ ہم صرف یہ چاہتے ہیں کہ ہم اور وہ دونوں بھائی بھائی ہیں، دونوں مسلمان ہیں۔ اور پاکستان تو انہیں دلوایا بھی پشتونوں نے ہی ہے۔ اگر پشتونوں نے اس ملک کے لئے اور اس ملک کی آزادی کے لئے جنگ نہ کی ہوتی اور فرنگی کو اس ملک سے نہ نکالا ہوتا تو پاکستان کہاں ہوتا؟ پاکستان تو پختونوں کے خون سے بنا ہے۔
لیکن افسوس کی بات ہے کہ جب انگریز جانے لگا تو وہ ہم سے سخت ناراض تھا۔ وہ کہتا تھا کہ "دس کروڑ مسلمان تھے۔ میرے خلاف کسی نے کمر نہیں باندھی تھی، لیکن پختونوں نے کمر کس کر میرا مقابلہ کیا۔" انگریز نے جاتے ہوئے ہمارے ملک میں آگ لگا دی، لیکن کس کے ہاتھوں سے؟ ہمارے اپنے ہی بھائیوں کے ہاتھوں سے، جن کے لئے ہم نے پاکستان فتح کیا تھا اور انہیں فرنگی

کی غلامی سے نجات دلائی تھی ۔ افسوس کہ جس نے ملک کو آزاد کرایا اور بے پناہ قربانیاں دیں ۔ جیلوں کو اپنا گھر بنایا، تباہ و برباد ہوا، پختونوں کو غلامی سے نجات دلائی، وہ اب جمعد کہلاتا ہے ۔ اور مسلمان کون ہے؟ وہی جو انگریز کے ریزہ چین (تھالی چٹ) تھے ۔ جنہوں نے قوم اور ملک کو انگریزوں کا غلام بنایا تھا ۔ میں اس لئے بار بار کہتا ہوں کہ ہم بھائی چارہ چاہتے ہیں، ہم پاکستان کے پانچ بھائی ہیں ۔ پنجابی، پشتون، بنگالی، سندھی اور بلوچی، ان چار بھائیوں کے تو الگ الگ نام ہیں لیکن ہمارا کوئی نام نہیں ہے ۔ ہم بھی ایک نام چاہتے ہیں ۔

لیاقت علی خان نے پارلیمنٹ میں مجھ سے پشتونستان کے بارے میں پوچھا تھا تو میں نے ان سے یہی بات کہی تھی کہ اے بھائی! ہم یہاں پانچ بھائی ہیں ۔ ہر ایک بھائی کا اپنا نام ہے ۔ اگر پنجاب کا نام لے تو لوگ سمجھ جاتے ہیں کہ یہ پنجابی ہے ۔ اگر بنگال کا نام لے تو معلوم ہو جاتا ہے کہ یہ بنگالی ہے ۔ اگر سندھ کا نام آئے تو پتہ لگ جاتا ہے کہ یہ سندھی ہے ہم صوبہ سرحد کے ہیں اور قبائلی ہیں، لیکن ہمارا کوئی نام نہیں ۔ ہمارا بھی ایک نام رکھ دو ۔ آپ لوگ دیکھ لیجئے کہ یہ ہمیں ایک نام دینا بھی برداشت نہیں کرسکتے اور پھر بھی رٹ لگائی جاتی ہے کہ پاکستان مسلمان ہے، اسلام ہے ہم نے پاکستان کے ساتھ کبھی جنگ نہیں کی ۔ ہم تو جنگ کے سخت خلاف ہیں ۔ ہم جنگ باز نہیں ہیں ۔ ہمیں جنگ پسند نہیں ۔ بھائیو! یہ بات اچھی طرح ذہن نشین کرلیں کہ ایک آدمی آپ کو اپنا بھائی بھی نہیں بناتا ۔ وہ آپ کو صحیح نام سے پکارنا بھی گوارا نہیں کرتا ۔ اور آپ اس کے لئے پروپیگنڈہ کرتے ہیں ۔ میں آپ سے اور پاکستان کے لیڈروں سے یہ بات کہتا ہوں کہ

ہمارے جو بھائی بلوچستان میں ہیں آپ اُن کے حالِ زار کو دیکھئے۔ اُن لوگوں نے متواتر بیس سال سے چیخ و پکار کی ہے کہ ہم مسلمان رہیں۔ ہم تمہارے بھائی ہیں۔ ہمیں ہمارا حق دے دو۔ جب ان کا جائز حق بھی نہیں دیا گیا تو اس کا نتیجہ کیا ہوا وہ لوگ مجبور ہو گئے اور بندوق سنبھال لی۔ آپ کو معلوم ہو گا کہ ان بے چاروں پر کتنے ستم توڑے گئے اور ظلم ڈھائے جا رہے ہیں۔ اب جبکہ پاکستان کو معلوم ہو گیا ہے کہ یہ مسئلہ زور ظلم سے حل نہیں ہو سکتا تو اب ان سے کہا جاتا ہے کہ آؤ آپس میں باہمی فیصلہ کر لیں میں جب پاکستان کے حالات پر نظر دوڑاتا ہوں تو معلوم ہوتا ہے کہ اس کے دل میں نہ بلوچستان کے لئے جگہ ہے، نہ سندھی کے لئے، اور نہ ہی پختون یا بنگالی کے لئے اس کے دل میں کوئی تبدیلی ہوئی ہے اسی لئے میں اپنے اس بلوچی بھائی کو بھی خبردار کر دینا چاہتا ہوں کہ جس طرح وہ مظلوم ہے، اسی طرح سندھی بھی مظلوم ہے۔ اور جس طرح سندھی مظلوم ہے اسی طرح پشتون بھی مظلوم ہے۔ اور ہم تینوں مظلوموں کا مقصد اور غرض ایک ہے یاد رکھئے ان پر کہیں اعتبار نہ کر بیٹھئے۔ ان کی اب یہ کوشش ہے کہ اس طرح ہمیں اپنے گھر میں الگ الگ کر دے۔ ہمیں کمزور بنا دے۔ یہ بات میں اپنے بلوچی بھائیوں کے پاس بھی پہنچانا چاہتا ہوں۔ پاکستان کی نیت کا پتہ تو اس بات سے لگتا ہے کہ اب پنجاب کے لیڈر جمع ہو گئے ہیں اور اپنے جرگے میں صلاح و مشورہ کر لیا ہے اور کہہ دیا ہے کہ پشتونوں کو دیکھو، ان کے پاس تو بڑی دولت ہے۔ اُن کے پاس بجلی ہے۔ پھر کہا کہ ان سندھیوں کو دیکھو، ان کے پاس بڑی بڑی زمینیں ہیں۔ بلوچیوں کے بارے میں کہا۔ ان کے پاس سوئی گیس کے ذخیرے ہیں ان کا ملک معدنیات کی دولت سے بھرپور ہے۔ بھائیو! یہ سب لوٹ کھسوٹ کی چالیں ہیں۔ یہ پشتونوں کی بجلی، سندھیوں کی

زرعی آراضی اور بلوچیوں کی معدنیات سب کو اپنی ملکیت بنانا چاہتے ہیں اس کے ساتھ انہوں نے ایک یونٹ کی تجویز رکھی۔ اب آپ خود سوچ لیجئے کہ ایک یونٹ اسلام کے عقیدے کے مطابق ہے ؟ کیا اسلام نے یہ کہا ہے کہ ایک بھائی کے پاس جو بجلی ہے وہ اس سے چھین لو۔ اور اگر دوسرے بھائی کے پاس معدنیات ہیں تو وہ اس سے ہتھیا لو۔ ۔ ۔ ۔ اور اگر کسی بھائی کے پاس زرخیز اراضیات ہیں تو وہ بھی اپنے قبضے میں کر لو۔

لہٰذا میں ان نادان پختونوں کو دیکھتا ہوں کہ اُن سے اگر کسی نے کہہ دیا کہ یہ اسلامی ملک ہے اللہ یہ اسلام ہے تو یہ سمجھنے کی کوشش نہیں کرتے کہ یہ اسلام ہے بھی یا نہیں۔ میں نے تو یہ بات کئی بار پاکستان سے کہی ہے کہ ہمارا معاملہ بھائی چارے اور مفاہمت سے پُر امن طور پر حل کر دو۔ ہم پُر امن طور سے فیصلہ چاہتے ہیں۔ اور اگر صلح صفائی اور بھائی چارے سے یہ بات حل نہیں ہوتی تو میں ان پختونوں سے کہتا ہوں کہ میں تو عدم تشدد پر عقیدہ رکھتا ہوں۔ میں تو تشدد کو پختونوں اور ساری دنیا کے لئے تباہی و بربادی کا باعث سمجھتا ہوں۔ عدم تشدد محبت ہے اور تشدد نفرت۔ ۔ ۔ ۔ ۔ میری تو ہر وقت یہی کوشش رہے گی کہ ہر بات امن سے ہو، لیکن میں پاکستان سے کہتا ہوں کہ اگر اس نے اس بات کا فیصلہ پُر امن طور سے اور بھائی چارے سے کر لیا تو بہتر ہو گا۔ میں اس کا فیصلہ شانتی سے چاہتا ہوں۔ کیونکہ میں جب پختونوں کو دیکھتا ہوں تو دن بدن ان کے خیالات میں تبدیلی محسوس کرتا ہوں۔ میں کہتا ہوں کہیں وہ دن نہ آجائے کہ پختون بندوق نہ تھام لے۔

پاکستان یہ بھی سمجھ لے کہ پہلے تو یہ بات صرف مردوں تک ہی محدود تھی اب ہماری عورتوں نے بھی ہمارے شانہ بشانہ کمر کس لی ہے۔ مجھے یہاں ایک لڑکی

نے کہا ہے "کہ د ملوینہ پورانہ شوہ، فخر افغانہ! جینکئی بہ درکٹی نہ" مطلب یہ کہ اگر مرد کامیاب نہ ہوئے تو اے فخر افغان صاحب! ہم لڑکیاں اپنے ملک کو فتح کریں گی"۔ ہاتھ کنگن کو آرسی کیا۔ تم نوجوانوں نے کامیابی حاصل نہیں کی تو یہ لڑکیاں میدان میں اُتر آئیں گی۔

اس لئے میں پاکستان سے کہتا ہوں کہ پشتونوں کو مجبور نہ کرو۔ کہیں یہ بھی بلوچیوں کی مانند بندوق نہ تھام لیں۔ اور اسے یہ کہتا ہوں کہ اگر اس نے (پاکستان نے) پختونوں کو مجبور کر دیا تو اس مسئلے کی نوعیت بدل جائے گی۔ اور اس کی تمام تر ذمہ داری پاکستان پر ہوگی۔

بھائیو! یہاں بھی میرے متعلق یہی پروپیگنڈہ ہوتا ہے اور وہاں پشتونستان میں بھی پاکستان یہ پروپیگنڈہ کرتا ہے "لوگو! دیکھو باچاخان ہندوستان جا رہا ہے"۔ یہاں میں آپ کو یہ بات بتا دوں کہ جب ہندوستان اور پاکستان میں جنگ شروع ہوئی تھی، اس وقت اخبارات میں... یہ پروپیگنڈہ بڑے زور شور سے چل رہا تھا۔ ہندوستان اور پاکستان دونوں ملکوں کے اخبارات یہ پروپیگنڈہ کر رہے تھے۔ میں یہ کہوں گا کہ اس میں ذرہ بھر حقیقت نہیں تھی۔ میرے پاس پاکستانی سفارت خانے کے کچھ لوگ آئے اور مجھے کہا "باچا خان! ہم نے سُنا ہے کہ آپ ہندوستان جا رہے ہیں"۔

میں نے انہیں کہا "میں تو یہاں بیٹھا ہوں۔ دیکھ لو کہ ہندوستان یا اور کہیں نہیں گیا۔ مجھے کسی نے باندھ کر تو نہیں رکھا ہے۔ میں نہ ہندوستان گیا ہوں اور نہ ہی جانا چاہتا ہوں۔ میں تو تمہارے انتظار میں بیٹھا ہوں کہ تم مجھے میرا حق دے دو۔ تمہاری طرف دیکھ رہا ہوں۔ اگر تم مجھے ہندوستان بھیجنا چاہتے ہو تو تم ہی بھیجنے والے ہو۔ میں تو ہندوستان نہیں جا رہا ——

اگر میں ہندوستان چلا بھی گیا تو تمہارے ہی بھیجنے سے جاؤں گا کیونکہ تم مجھے میرا حق نہیں دیتے۔ میں تو پختونوں کے لئے کاسۂ گدائی اپنے ہاتھ میں لے لوں گا۔ اور دنیا بھر کی جتنی قومیں ہیں اُن سب کے دروازوں پر الکھ جگاؤں گا کہ پشتونوں کے کاسۂ گدائی میں خیرات ڈال دیں۔

"تم جو کہتے ہو کہ ہندوستان مت جاؤ تو تم میرا حق مجھے دے دو۔ میں کسی دوسرے سے تو اپنا حق نہیں مانگتا۔ تم جب مجھے میرا حق نہیں دو گے تو تمہارے سامنے کب تک پڑا رہوں گا اور کب تک تمہاری طرف ہی دیکھتا رہوں گا۔ تم اس بات کو سمجھنے کی کوشش کرو کہ یہ جو لوگ اس قسم کا غلط پروپیگنڈہ کرتے ہیں، انہیں پہچان لو ـــــ وہ تمہارے دوست نہیں، وہ قوم کے خیرخواہ نہیں۔ حاضرین آپ کو یاد ہوگا کہ پچھلے سال اسی موقع پر میں نے آپ کے سامنے ایک تقریر کی تھی۔ اور آپ کی رائے معلوم کی تھی۔ آپ میری قوم ہیں، میرے بھائی ہیں، میرے عزیز ہیں۔ میں نے آپ سے کہا تھا کہ اے پختونو! آپ نہیں دیکھتے، لیکن میں دیکھ رہا ہوں کہ ہم پشتون ایک سیلاب میں ڈوبے جا رہے ہیں۔

سیلاب کے کنارے مسلمان کھڑا ہوا ہے۔ میں اُسے کہتا ہوں کہ اے میرے مسلمان بھائی! مجھے اپنا ہاتھ دے دو۔ وہ کہتا ہے نہیں۔ میں تمہیں ہاتھ نہیں دوں گا۔ آگے ایک ہندو کھڑا ہے۔ میں اسے کہتا ہوں کہ اے ہندو! تم مجھے اپنا ہاتھ دے دو۔ وہ کہتا ہے۔ تو میرا ہاتھ پکڑ لو۔ میں نے آپ سے پوچھا تھا کہ کیا ہندو کا ہاتھ پکڑ لوں یا نہ پکڑوں؟۔ بھائیو! میں آج بھی پھر آپ سے پوچھتا ہوں۔ کیونکہ آپ کہتے ہیں کہ مسلمان تو میرا بھائی ہے۔ ایوب خاں بھی میرا بھائی ہے اور پختون بھی ہے۔ وہ میرا ہاتھ پکڑتا ہے یا نہیں پکڑتا۔

اور جب وہ مجھے اپنا ہاتھ نہیں دیتا۔ تو میں نے آپ سے کہہ دیا ہے کہ میں نکل پڑوں گا۔ ساری دنیا میں جاؤں گا۔ جو بھی میرا ہاتھ تھامے گا میں اس کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے دوں گا۔ چاہے وہ لال کا فرہی کیوں نہ ہو۔ یہ بات پھر لوگوں سے کہتا ہوں اور دوبارہ آپ سے پوچھتا ہوں کہ اے بھائیو! ہم تو سیلاب میں بہے جا رہے ہیں۔ اگر مسلمان ہاتھ نہیں بڑھاتا اور ایک غیر مسلم ہاتھ بڑھاتا ہے تو بتایئے کہ میں اس کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے دوں یا نہ دوں؟ یہ بات بھی میری سن لیجئے کہ میں اگر خانماں بربادی، کس مپرسی اور پریشان حالی میں پھروں گا تو اے نادان بھائیو! آپ ہی کے واسطے پھرونگا۔ لہٰذا میری بات پر غور کیجئے اور میرے ساتھ وعدہ کیجئے کہ پھر کوئی آپ کو اسلام کے نام پر دھوکہ نہیں دے سکے گا۔

میں پھر کہتا ہوں کہ پہلے تو میں مسلمان بھائی سے کہوں گا کہ ہاتھ بڑھا دو۔ اگر اس نے ہاتھ بڑھا دیا تو پھر آپ کو دوسرے لوگوں کے پیچھے پھرنے کی ضرورت نہیں رہے گی۔ اور اگر وہ ہاتھ نہیں بڑھائے گا تو ہم یوں ہی تھوڑے بیٹھے رہیں گے۔ ہم تو آگے بڑھیں گے ...... میں نے آپ سے کہہ دیا ہے کہ اگر لال کا فر بھی ہمیں ہاتھ دے گا تو ہم اس کا ہاتھ تھام لیں گے ...... اور ایسا پشتون کی خاطر ہی کریں گے تاکہ وہ پختون کو دریا برد ہونے سے بچالے۔ ہم بھی اس کے ہاتھ میں اپنا ہاتھ دے دیں گے۔ یہ میں اس لئے آپ سے کہتا ہوں کہ پھر کوئی آپ کو اسلام کے نام پر فریب نہ دے سکے۔ جیساکہ تمام عمر آپ کو دھوکہ دیا گیا ہے۔ یہی بات میں آج روس اور امریکہ سے بھی کہتا ہوں کہ اگر تم حقیقتاً اس ملک میں امن چاہتے ہو تو یہ جو آگ لگنے والی ہے بیشتر اس کے کہ وہ بھڑک اٹھے، تم اس بات کا فیصلہ کر دو۔

اور میں چین سے بھی کہتا ہوں کہ۔ تمہارا اثر و رسوخ پاکستان پر بہت زیادہ ہے۔ تمہیں چاہیئے کہ ہمارا پُرامن تصفیہ کرادو، تاکہ تمہارے پڑوس میں بدامنی کی آگ نہ جل اُٹھے۔

بھائیو اور بہنو! میں آپ کے اس پریم پیار کا تہہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں کہ آپ نے میری باتیں توجہ، عقیدت اور شوق سے سُنیں اور اب میں آپ لوگوں سے رخصت ہوتا ہوں۔

●

چوتھی تقریر

یومِ پختونستان ۳۱ اگست ۱۹۶۸ء

بھائیو اور بہنو! میں نے کبھی لکھی ہوئی تقریر نہیں پڑھی۔ یہ پہلا موقع ہے کہ میں لکھی ہوئی تقریر پڑھ رہا ہوں۔ کیونکہ حالات نازک ہیں۔ ایسا نہ ہو کہ میری تقریر میں قطع و برید کیا جاوے۔ تقریر کے دوران میں اگر کہیں مجھے توقف کرنا پڑے تو اس کے لئے میں معذرت خواہ ہوں۔

سب سے پہلے میں اعلیٰ حضرت اور حکومت افغانستان کا شکر گزار ہوں جس نے مجھے یہ موقع دیا ہے کہ آج میں آپ حضرات کے سامنے تقریر کے لئے حاضر ہوا۔ ہم وہ بدقسمت قوم ہیں کہ آپس میں تبادلۂ خیال کے لئے ہمارے پاس سوائے اس کے اور کوئی دوسرا ذریعہ نہیں ہے۔ ہمارے پاس نہ تو ریڈیو، نہ اخبار ہیں۔ صرف یہی ایک موقع ہے کہ اس دن ہم اپنے خیالات آپ پر اور پوری دنیا پر ظاہر کریں!

بہرحال میں حکومتِ افغانستان، مجلسِ شوریٰ، افغان عوام اور بالخصوص خوشحال خاں و رحمان بابا کے معتقدین کا شکر گزار ہوں۔ افغانستان کے دورے کے دوران میں متعلمین معتقدین نے میرا پُر خلوص سواگت کیا اور پختونستان کے حقِ خود ارادیت کی تائید میں اپنی قربانیوں کو پیش کرنے کا وعدہ کیا۔ افغانستان کے عوامی جرگے اور وزرائے جرگہ نے وقتاً فوقتاً ہمارے ساتھیوں سے پورا تعاون کیا ہے۔ میں اپنا فرض تصور کرتا ہوں کہ جو اخلاص، پیار اور تعاون مجھے ملا ہے میں اس کا صمیم قلب سے شکریہ ادا کروں۔

اس جلسہ میں مجھے دکھائی دے رہا ہے کہ مختلف ممالک کے لوگ موجود ہیں۔ میں چاہتا ہوں کہ پختونستان کے مسئلے اور پاکستان کے حکمراں طبقے کے جذبۂ اسلامی

پر کچھ اظہارِ خیال کروں۔ حکومتِ پاکستان ہمارے خلاف ساری دنیا میں یہ پروپیگنڈہ کرا رہی ہے کہ ہم مسلمانوں کے بدخواہ ہیں اور ہندوؤں کے ساتھی ہیں۔ پختونستان بنا کر ہم پاکستان کو مٹانا چاہتے ہیں اس لئے میں چاہتا ہوں کہ ان باتوں پر کچھ روشنی ڈالوں۔

کیوں ملے ہم ہندوؤں سے؟

ہم ہندوؤں سے کیوں ملے اور کب ان کے ساتھی بنے۔ اس کی وضاحت یہ ہے کہ انگریزوں نے ہمیں ہندوؤں کے ساتھ ملنے کے لئے مجبور کر دیا تھا کیونکہ جس وقت انگریزوں نے افغانستان کے شاہ امان اللہ خاں کے خلاف کفر کا پروپیگنڈہ کیا تھا اور افغانستان میں بہت بڑی بغاوت کھڑی کر دی تھی تو پختونستان کے لوگ اس سے بہت متاثر ہوئے اور ہم میں ان واقعات نے ایک قومی احساس پیدا کرنے کی غرض سے ۱۹۲۹ء میں ایک تحریک شروع کی جس کا نام "خدائی خدمتگار" ہے ظاہر ہے کہ آج کی دنیا میں کوئی بھی قوم تحریک اور قیام جماعت کے بغیر زندہ نہیں رہ سکتی۔ ہماری یہ تحریک ایک مجلسی و ثقافتی تحریک تھی۔ لہٰذا اس نے ملک میں مقبولیت اور ہر دلعزیزی حاصل کی۔ اس کی ہر دلعزیزی اور مقبولیت سے انگریز گھبرا گئے۔ اور اس تحریک کو شروع ہوئے چار ماہ بھی نہ گزرے تھے کہ انگریزوں نے ہم سب کو گرفتار کر لیا اور جیل میں ڈال دیا اور پختون قوم پر مظالم کے وہ پہاڑ توڑے کہ کوئی وحشی قوم بھی کسی پر ایسے ستم نہ ڈھا سکتی تھی ہم اس زمانے میں پنجاب کے ایک جیل خانے میں بند تھے کہ ہمارے پاس دو ساتھی خفیہ طور پر ہم سے ملنے کے لئے جیل خانے میں آئے۔ انھوں نے ہمیں بتایا کہ انگریزوں نے ہمیں تباہ کر دیا ہے۔ ہم نے مسلم لیگ کا نام سنا تھا۔ یہ مسلمانوں کی جماعت تھی۔ لہٰذا ہم نے ان کو یہ رائے دی کہ مسلم لیگ کے پاس جاؤ اور اس سے کہو کہ وہ پختون مسلمانوں کی مدد کرے۔ یہ دونوں ساتھی پورے ہندوستان میں پھرے لیکن ایک بھی مسلم لیگی

پختون مسلمانوں کی مدد کرنے کیلئے تیار نہیں ہوا۔ اس کی وجہ ظاہر تھی کہ مسلم لیگ کو انگریزوں نے ہندوؤں کے ساتھ لڑانے کی غرض سے تیار کیا تھا اور ہماری لڑائی انگریزوں کے خلاف تھی۔ ہمارے دونوں ساتھی دو مہینے بعد پھر ہمارے پاس آئے اور انھوں نے کہا مسلم لیگ انگریزوں کی طرفدار ہے۔ وہ ہماری مدد کرنے کے لئے تیار نہیں کیونکہ ہماری جنگ انگریزوں کے خلاف ہے۔ ہم نے کہا کہ ہندوستان میں ایک دوسری جماعت ہے جس کا نام کانگریس ہے آپ اس کے پاس جائیے اور مدد مانگئے۔ وہ گئے اور پھر واپس آئے۔ انھوں نے بتایا کہ کانگریس کی یہ شرط ہے کہ اگر آپ ہمارے ساتھ شریک ہوں تو وہ ہماری مدد کرنے کے لئے تیار ہے کیونکہ آپ بھی ملک کی آزادی چاہتے ہیں اور ہم بھی آزادی چاہتے ہیں، آپ کا جھگڑا بھی انگریزوں سے ہے اور ہماری لڑائی بھی انگریزوں سے ہے۔ اس کے بعد ہمارے جرگے کی ایک میٹنگ ہوئی اور یہ طے پایا کہ ہم کانگریس کے ساتھ شامل ہوں۔ کانگریس نے پوری دنیا میں ہماری تحریک کا چرچا کیا تھا۔ ہم دونوں مشترک طور پر اپنے ملک سے انگریزوں کو نکال دیں۔ یہ وہ حالات تھے جن میں ایک طرف انگریزوں کا تشدد تھا اور دوسری جانب مسلم لیگ کا عدم تعاون۔ لہٰذا ہم ہندوؤں کا ساتھ دینے کے لئے مجبور ہو گئے۔ اب میں یہ پھر کہتا ہوں کہ حکومت پاکستان کے جبر و ظلم اور پاکستانی مسلمانوں کے عدم تعاون کی بنا پر ہم ایک بار پھر دوسروں سے تعاون لینے کے لئے مجبور نہ ہو جائیں۔ آپ خود سوچئے کہ مسلم لیگ کے عدم تعاون کی وجہ سے ہم کیا کرتے۔ کیا ہم قوم کو چھوڑ دیتے، کیا ہم اپنی قوم کو دریا میں ڈبو دیتے۔ پختونستان کیا ہے۔ مسلم لیگ ہم پر ہندوؤں کا الزام لگاتی ہے۔ اس کے لیڈر خوب اچھی طرح جانتے ہیں کہ پختون زندہ و بیدار ہیں۔ وہ جانتے ہیں کہ جب ہم اپنے زندہ بیدار شعور کی بنا پر انگریزوں کا ستم برداشت نہیں کر سکتے تو ان کا جبر و ستم کس طرح برداشت کریں گے۔ انھیں یہ بھی ڈر ہے کہ کیلئے ہم ہی نہیں ہیں

بلکہ سندھی، بلوچی، بنگالی اور حتیٰ کہ پنجاب کا غریب عوام بھی ہمارے ساتھ ہو جائے گا۔ اس خدشہ کی بنا پر مسلم لیگیوں نے ہم پر ہندو نوازی کا الزام لگایا اور بدنام کیا تاکہ سندھی، بلوچی، بنگالی اور پنجابی غریب عوام ہماری طرف سے بدگمان ہو جائیں۔ آپ دیکھیے کہ بدنامی کا یہی الزام انھوں نے آج بنگال کے شیخ مجیب الرحمٰن اور ان کے ساتھیوں پر عائد کیا ہے مگر اللہ کا لاکھ لاکھ شکر ہے کہ اکیس سال بعد پاکستانی عوام اس راز سے اچھی طرح واقف ہو گئے اور حکومت پاکستان کے اسلامی دعوے اور غلط پروپیگنڈے کی حقیقت ان پر کھل گئی۔ چنانچہ اس سال یکم جولائی کو پاکستان کے تمام صوبوں کے نمائندگان پشاور میں اکٹھے ہوئے اور انھوں نے پختون بھائیوں پر اپنا اعتماد ظاہر کیا۔ اس واقعہ پر میں اپنے اللہ اور پاکستانی عوام کا شکر گزار ہوں کہ ان کی سوجھ بوجھ یہاں تک پہنچ چکی ہے۔ دوسری بات پختونستان کی ہے۔ پاکستان میں ہم پانچ بھائی رہتے ہیں جن کے نام ہیں لیکن پاکستان میں ہمارا نام نہیں ہے۔ اسلام کے دعویداروں سے ہم کہتے ہیں کہ وہ ہمیں بھی ہمارا کوئی نام دیں۔ مرحوم لیاقت علی خان نے ایک بار پارلیمنٹ میں ہم سے پوچھا تھا کہ پختونستان کیا چیز ہے؟ میں نے جواب دیا یہ ہمارے ملک کا نام ہے۔ انھوں نے کہا یہ کیا نام ہے۔ میں نے جواب دیا جیسے بنگال، سندھ اور بلوچستان کا نام ہے لیکن ہمارے ملک کا نام نہیں ہے۔ ہمارے ملک کا نام بھی ایک نام یعنی پختونستان ہونا چاہیے۔ جب پختونستان کا نام میں نے لیا تو فوراً یہ پروپیگنڈہ شروع کر دیا گیا کہ میں پاکستان کو مٹانا چاہتا ہوں۔ عجیب بات ہے کہ پنجاب، سندھ، بلوچستان، بنگال کے نام سے تو پاکستان کا کچھ نہیں بگڑتا لیکن صرف پختونستان کے نام سے پاکستان بٹ جائے گا۔

اقتدار کی خاطر کانگریس نے ہمیں چھوڑ دیا

۱۹۴۷ء میں جب ہم نے سمجھا کہ انگریز جلد ہی

اور ہندوستان کو دو حصّوں میں تقسیم کر رہے ہیں۔ ایک حصّہ ہندوستان کے نام سے ہندوؤں کے حوالے کر رہے ہیں اور دوسرا حصّہ پاکستان کے نام سے اپنی لے پالک مسلم لیگ کو دے رہے ہیں تو ہمارے خدائی خدمتگاروں کی ایک میٹنگ بنوں میں ہوئی اور اس بات پر غور کیا گیا کہ ایسے حالات میں کیا کرنا چاہیئے؟ انگریز جب کانگریس کو ہندوستان دے کر جا رہے تھے تو انھوں نے ہم پر بہت زور ڈالا اور ہمارے بہت سے جرگے کئے لیکن ہم نے اقتدار کی خاطر کانگریس کو نہیں چھوڑا اس کے برعکس کانگریس نے اقتدار کی خاطر ہمیں چھوڑ دیا۔ جہاں تک پاکستان کا تعلق ہے ہمیں معلوم تھا کہ انگریز اسے اپنے لئے اور اپنے لے پالکوں کے لئے بنا رہے ہیں اور اقتدار ان کے ہاتھ میں دے رہے ہیں جنھوں نے انگریزوں کی خدمت کی تھی۔ اب آپ ہی دیکھئے کہ پاکستان کے موجودہ حکمرانوں میں کوئی ایک شخص بھی ہے جس نے انگریزوں کے مقابل قوم کا ساتھ دیا ہو، قوم کے لئے قربانی دی ہو۔ اور عوام کی خدمت کی ہو۔ صدر ایوب خاں ہوں یا گورنر موسیٰ خاں ۔ یہ لوگ تحریکِ آزادی کے دوران ہمارے خلاف انگریزوں کا ساتھ دیتے تھے۔ جب ہم پختونوں نے ان حالات کو سمجھ لیا تو ہم نے یہ فیصلہ کیا کہ ہم نہ پاکستان کے ساتھ رہنا چاہتے ہیں نہ ہندوستان کے ساتھ بلکہ اپنی خود مختار پختون ریاست کے قیام کے خواہشمند ہیں۔ یہاں میں یہ امر واضح کرنا ضروری سمجھتا ہوں کہ زمانہ قدیم کے بڑے بڑے ادیب ماضی کے واقعات اور ۱۸۵۷ء سے پہلے پیش آنے والے واقعات جن کا تعلق پختونستان سے ہے ضرورۃً تحریر میں لائے ہیں۔ میں یہ بھی تسلیم کرتا ہوں کہ پختونوں میں بڑے بڑے انسان گزرے ہیں جنھوں نے اپنی قوم کے لئے ناقابلِ فراموش قربانیاں دی ہیں اور وہ تاریخ مرتب کی ہے جس پر ہم فخر کرتے ہیں لیکن پختونوں میں سیاسی بیداری اور ان میں اجتماعیت کا احساس پیدا کرنا ہماری خدائی خدمتگار تحریک کی دین ہے اور پختونستان

کی جوداغ بیل پڑی پردہ بھی ہماری اس تحریک کا گہوارہ ہے۔

صوبہ پرستی کس نے پیدا کی؟

اب آپ ایوب خاں صدر پاکستان کے دعویٔ اسلام کا سرسری طور پر جائزہ لیجئے جب پورے پاکستان کی قومی عوامی پارٹی کی کانفرنس کا اجلاس پشاور شہر میں منعقد ہوا اور پاکستان کی تمام پارٹیوں کے رہنماؤں اور نمائندوں نے پردۂ اسلام میں چھپے ہوئے مظالم کو ظاہر کیا تو صدر ایوب خاں کو یہ ڈر محسوس ہوا کہ وہ اسلام کے نام سے پاکستانی عوام کو مزید فریب نہیں دے سکتے۔ چنانچہ انھیں اپنے قدیم آقا یاد آئے اور وہ لندن بھاگے۔ وہاں انھوں نے ڈنسی اور دیگر دوستوں سے صلاح و مشورہ کیا کہ اب انھیں کیا کرنا چاہیے۔ ایوب خاں کے دوستوں نے ان سے کہا کہ جاؤ تمہارے پاس سوائے اس کے اور کوئی راستہ نہیں ہے کہ اسلام کا نام لو اور لوگوں کو اپنے جال میں پھانسو۔ چنانچہ وہ لندن سے واپس آئے اور انھوں نے جذبۂ اسلامی کی سرشاری کا مظاہرہ کرتے ہوئے یہ نعرہ دیا کہ اسلام میں مساوات ہے، اسلام میں صوبہ پرستی ممنوع ہے اور قائداعظم نے بھی ارشاد کیا ہے کہ صوبہ پرستی ملک و قوم کے لئے تباہ کن شئے ہے۔ میں صدر ایوب سے یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ آیا اسلامی مساوات کا مطلب یہ ہے کہ دس کروڑ پاکستانی عوام کی دولت صرف ۲۲ حکمران خاندانوں میں تقسیم کردی جائے۔ جب صوبہ پرستی ناروا ہے تو صدر صاحب سے میں یہ پوچھنا چاہتا ہوں کہ صوبہ پرستی پیدا کی تو کس نے۔ صوبہ پرستی اگر پیدا ہوئی ہے تو آپ لوگوں کی طرف سے کی جانے والی حق تلفی اور بے اتفاقی کی بنا پر...

میں نہیں سمجھتا کہ صدر صاحب کن وجہوں سے قائداعظم کا نام لیتے ہیں۔ ابھی کل کی بات ہے کہ قائداعظم کی بہن مس فاطمہ جناح جو مادرِ ملت بھی کہی جاتی تھیں صدارتی الیکشن میں ایوب خاں کے مقابل آئی تھیں تو اس وقت صدر صاحب نے

اپنے ذاتی مفاد کو پیش نظر رکھا اور نہ صرف انھوں نے بلکہ ان کے بیٹوں نے بھی مس فاطمہ جناح کے ذاتی وقار، عزت اور حرمت کو نظر انداز کرکے ان کے خلاف پروپیگنڈا کیا جو دشمن بھی نہیں کرے گا۔ آج صدر ایوب خاں قائد اعظم کے نام سے فائدہ اٹھانا ہے تو وہ یہ کہتے پھرتے ہیں کہ قائد اعظم نے یہ کہا ہے قائد اعظم نے وہ کہا ہے۔

اسلام کیا ہے؟

صدر صاحب آیئے میں بتاؤں کہ اسلام کیا ہے۔ رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم کی وفات کے بعد جب حضرت ابوبکر صدیق رضی اللہ عنہ مسلمانوں کے خلیفہ منتخب ہوئے تو منبر پر کھڑے ہو کر انھوں نے کہا۔ میں آپ ہی جیسا انسان ہوں، آپ کا بھائی ہوں، آپ کا عزیز ہوں، آپ لوگوں سے بڑا نہیں ہوں۔ آپ نے مجھے خلیفہ منتخب کیا اس کے لئے میں آپ کا شکر گزار ہوں، لیکن میں آپ سے تاکیداً کہتا ہوں کہ جب تک میں صراط مستقیم پر گامزن رہوں آپ میرے ساتھ آیئے اور اگر میں صراط مستقیم سے ہٹ جاؤں تو آپ مجھے روک دیجئے اور مجھے پکڑ کر سیدھے راستے پر لے آیئے۔ جب وہ خلیفہ مقرر ہوئے تو انھوں نے اپنا روزینہ بھی وہی مقرر کیا جو دوسروں کے لئے مقرر کیا تھا۔ ایک دن ان کی بی بی نے فرمائش کی کہ میں شیرینی کھانا چاہتی ہوں۔ حضرت صدیق رضی اللہ عنہ نے فرمایا کہ جتنا روز کا خرچ مقرر ہے اس میں شیرینی کی گنجائش نہیں ہے۔ اس پر آپ کی اہلیہ نے روزانہ کے خرچ میں سے کچھ پیسے بچا کر ایک دن حضرت صدیق کو اپنی جمع کردہ رقم دی اور کہا کہ میرے لئے شیرینی منگوا دیجئے۔ آپ نے پوچھا کہ یہ رقم کہاں سے آئی۔ آپ کی اہلیہ نے بتایا کہ انھوں نے روزانہ کے خرچ سے بچائی ہے۔ اس پر حضرت صدیق نے اللہ کی بارگاہ میں عرض کیا کہ میں اپنے روزانہ کے خرچ کو کم کر سکتا تھا، لیکن میں نے بیت المال سے اپنی ضرورت سے زیادہ لیا تھا، اس لئے اسے

اللہ تو مجھ کو معاف فرما۔

دوسرا واقعہ یہ ہے حضرت عمر رضی اللہ تعالیٰ عنہ کا سنانا ہوں۔ مسلمان جمع ہوئے اور جمع ہو کر حضرت عمر کے پاس گئے کہ آپ ہمارے خلیفہ بن جائیے۔ آپ نے کہا کہ مجھے خلافت کی کوئی ضرورت نہیں ہے۔ مسلمانوں نے کہا کہ آپ کو ضرورت ہو یا نہ ہو آپ کو خلیفہ بنانا ہماری ضرورت ہے۔

ایک مرتبہ حضرت عمر کے صاحبزادے بصرہ سے مدینہ جا رہے تھے۔ بصرہ کے حاکم نے بیت المال کا کچھ روپیہ آپ کے صاحبزادے کو دیا کہ آپ مدینہ جا رہے ہیں تو اس رقم کو لیتے جائیے۔ صاحبزادے نے یہ سوچا کہ جب رقم ساتھ ہی لے جانا ہے تو اس کو کسی تجارت میں کیوں نہ لگا دیا جائے۔ چنانچہ بصرہ سے کچھ کچا مال اس رقم سے خرید لیا اور یہ مال مدینہ میں لا کر بیچ ڈالا جو نفع ہوا وہ اپنے پاس رکھ لیا اور بیت المال کی رقم جمع کرا دی۔ جب حضرت عمر کو پتہ چلا تو آپ نے اپنے صاحبزادے کو بلایا اور فرمایا کہ تم نے جو نفع کمایا ہے وہ اپنی رقم سے نہیں کمایا بلکہ بیت المال کی رقم سے کمایا ہے لہٰذا نفع کی رقم بھی بیت المال میں جمع کرا دو۔ مدینہ میں ایک مرتبہ قحط پڑا تو حضرت عمر خود کھانا نہیں کھاتے تھے اور اپنی خوراک بھی لوگوں کے لئے ایثار کر دیتے تھے۔ جب مصر سے اناج آیا اور قحط کی مصیبت ٹل گئی تب آپ نے بھی اپنے حصہ کی پوری خوراک کھائی۔ حضرت علی کرم اللہ وجہہ ایک مرتبہ اپنی خلافت کے زمانے میں بیمار ہوئے۔ طبیب نے کہا آپ کو شہد نوش کرنا چاہئے۔ آپ نے فرمایا کہ شہد میرے پاس نہیں ہے۔ وہ بیت المال میں ہے لیکن وہ مسلمانوں کا مال ہے لہٰذا میں نہیں لے سکتا۔ جب مسلمانوں نے اجازت دی تب آپ نے شہد بیت المال سے منگوایا اور استعمال کیا۔

پاکستانی بربریت اور عوام

صدر ایوب صاحب یہ تھا اسلام .. مگر آج آپ کا اسلام یہ ہے کہ آپ بلوچستان کے نہتے عوام پر گولیاں اور بم برساتے ہیں کیا اسلام کی ترقی اس میں ہے کہ اسلام کے نام پر اسلام آباد تعمیر کرا دیا جائے اور بلا ضرورت مکانات سازی پر اربوں روپیہ خرچ کیا جائے۔ کیا اسلام کی ترقی اسی میں ہے کہ بنگال میں ہر سال آنے والے سیلاب سے ہزاروں مسلمانوں کو تباہ و برباد کریں اور اکیس سال گزر جانے کے باوجود انسداد سیلاب کا کوئی انتظام نہ کیا جائے۔ آج اسلام یہ ہے کہ پٹھانوں کی بجلی اور معدنیات سندھیوں کی زمینیں، بلوچیوں کی گیس چھیننے کی سازش کرکے ایک یونٹ بنایا جائے ایک یونٹ کیا عوام کے فائدے کے لئے بنایا گیا ہے۔ یا چند دولت مند لوگوں کو مزید دولت مند بنانے کے لئے۔ میں پاکستانی حکمرانوں سے بار بار کہتا رہا ہوں کہ مجھے سمجھاؤ کہ اگر ایک یونٹ سے پنجاب کے غریب طبقوں کو بھی کوئی ادنیٰ سا فائدہ ہو تو میں اس کی تائید کرنے کو تیار ہوں۔ آج اسلام یہ ہے کہ خان عبدالصمد خاں کو ۱۴ سال بعد جیل سے رہا کیا گیا اور رہائی کے پانچ دن بعد ہی ان کو اور ان کے ساتھ بہت سے دوسرے قوم پرستوں کو گرفتار کر لیا گیا۔ آج اسلام یہ ہے کہ شہزادہ عبدالکریم ملک و قوم کی خدمت کے گناہ پر خان عبدالصمد خاں کے ساتھ گرفتار ہوئے تھے، جو آج تک جیل میں ہیں۔ پاکستانی حکمران ہماری نیت اور ہمارے ارادے سے بخوبی واقف ہیں اور اس بات کو بھی سمجھتے ہیں کہ اگر ہم متحد ہوں تو پاکستان اور زیادہ مضبوط ہوتا ہے۔ چنانچہ اس برس پشاور میں پاکستان قومی عوامی پارٹی کی کانفرنس نے بھی اس بات کی تائید کی مگر پاکستانی حکمرانوں نے ذاتی مفادات کی بنا پر اپنے کانوں کو بہرا بنا رکھا ہے۔ میں اٹھارہ سال پاکستان میں رہا اور چار برس سے افغانستان میں ہوں لیکن اس طویل مدت میں بھی مجھے پاکستانی حکمرانوں کی طرف سے کوئی تسلی بخش

جواب نہیں مل سکا۔ جب یو۔ این۔ او کے سکریٹری جنرل اوتھانٹ کابل آئے تو میں نے اُن سے کہا تھا کہ پاکستانی حکمرانوں کو اس بات پر تیار کردو کہ الگ ہونے سے پہلے وہ ہمارے مطالبات منظور کریں۔ آپ لوگوں کو یاد ہوگا کہ گزشتہ برس میں نے اسی جگہ اپنی تقریر میں امریکہ، روس اور چین کو بھی پکارا تھا۔ کہ وہ ہمارے اور پاکستان کے درمیان ثالثی کریں۔ اب میں آخری مرتبہ پاکستان سے کہتا ہوں کہ اگر وہ ہمیں بھائی چارے کا حق دیدے تو بہت اچھا ہوگا، ورنہ بنگال تو اپنی آزادی کی جدوجہد کر رہا ہے ہم پختون، سندھی اور بلوچ مظلوم بھی اس بات پر غور کریں گے کہ ہم کیا کریں موجودہ حالات میں پاکستان میں رہیں یا الگ ہو جائیں۔ میں پاکستانی حکومت سے کہتا ہوں کہ وہ ہمیں مجبور نہ کرے کہ ہم تینوں بھائی ایک ہو کر ایک فیڈریشن بنانے کی غرض سے ایک حفاظتی حکومت بنانے کا راستہ اختیار کریں۔ آخر میں میں آپ لوگوں کی محبت اور ہمدردی کا تہ دل سے شکریہ ادا کرتا ہوں۔

پختونستان زندہ باد!

ہم جناب کنور بھان نارنگ صاحب (جنھوں نے پشتو
زبان میں بادشاہ خاں کی سوانح عمری قلمبند کی) اور
جناب رام سرن نگینہ صاحب (جنھوں نے اردو مسودے
کو ایڈیٹ کرنے میں امداد کی)

کے بھرپور تعاون کے لئے بے حد مشکور
ہیں۔ اس کے ساتھ ہی ہم مردولا سارا بھائی جی کے
بھی شکر گزار ہیں جن کے پُرخلوص تعاون کے بغیر
یہ سوانح عمری کتابی صورت میں شائع نہیں ہو سکتی تھی۔

پرکاش پنڈت
ڈائرکٹر ہند پاکٹ بکس، پرائیویٹ لیمیٹڈ،
شاہدرہ - دہلی ۳۲

AAP BEETI
AUTOBIOGRAPHY
KHAN ABDUL GHAFFAR KHAN

قیمت دو روپے

(جمال پریس، دہلی)

یہ ہندوستان کی جنگِ آزادی میں مہاتما گاندھی کے شانہ بہ شانہ عدم تشدّد کے پرچم لہرانے اور قدم قدم پر ایثار و قربانی کے سنگِ میل قائم کرنے والے ایک ناقابلِ تسخیر مردِ مجاہد، بے خوف سالار اور لامثال محبِ وطن کی ایسی معرکتہ الآرا سوانح عمری ہے جو ہمیشہ آنیوالی نسلوں کے رگ و پے میں بجلیاں بھرتی رہے گی۔

ہند
پاکٹ
بکس